ذوالقرنین

زمینی سائنس کے سب سے بڑے معموں کا معمار

ثبوت زندہ ہیں

ذوالقرنین، سد ذوالقرنین اور یاجوج وماجوج کے متعلق ماضی کی تمام تر

تشریحات اور قیل وقال کو بدلکر اعجاز قرآن کو بیان کرنے والی

حیران کن تحقیقات

مفتی عبدالعزیز ابن احمد

فاضل دارالعلوم، دیوبند

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب : ثبوت زندہ ہیں

تصنیف : مفتی عبدالعزیز ابن احمد پٹیل

سن طباعت : ۱۴۴۴ھ مطابق ۲۰۲۳ء

طبع اول : ۱۱۰۰

قیمت :

ناشر :

☆☆☆

کتاب حاصل کرنے کے لیے رابطہ فرمائیں۔

مکتبہ دلیل اسلام

۹ ٹیپو سلطان کالونی، کنتھاریا، بھروچ، گجرات

موبائل:+91-9714440450

فہرست عناوین

مغرب الشّمس ۱۲۔۵۹

☆ منطقۂ باردہ شمالی یعنی (North Polar Rigion) کا سفر۔

☆ کیچڑ والے چشمے میں سورج کے ڈوبنے کی داستان کیا ہے؟ ''عین حمئۃ'' کا صحیح معنی کیا ہے اور وہ کہاں پر واقع ہے؟

☆ بحر شمالی کے نام سے معروف پانچواں سمندر کیا واقعتاً ایک سمندر ہے یا پھر حقیقت میں وہ ایک ''عین'' ہے؟

☆ ''عین حمئۃ'' یعنی دریائے شمالی کے حیرت انگیز کوائف۔ اس دریا کے کنارے رہنے والے جن لوگوں سے ذوالقرنین کی ملاقات ہوئی تھی وہ کون لوگ تھے اور وہ لوگ آج کہاں ہے؟

مطلع الشّمس ۵۹۔۹۹

☆ منطقۂ باردہ جنوبی یعنی (South Polar Rigion) کا سفر۔

☆ مطلع الشّمس میں واقع براعظم انٹارکٹا کا ماضی، حال اور مستقبل۔ انٹارکٹکا کی آب وہوا، اوزون کی پرت اور مرئی روشنی کے متعلق قرآن کا حیران کن بیان۔

☆ انٹارکٹکا پر رہنے والی اس قوم کے بے مثال خصوصیات جس سے ذوالقرنین کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ قوم آج کہاں ہے؟

☆ سیاہ فام قوم کے رنگ اور خدوخال کو دنیا کی بقیہ اقوام سے ممتاز کرنے والے اصل عوامل کیا ہیں۔ اس قوم کا اصل مسکن کونسا ہے اور وہ افریقہ میں کیسے پہونچی؟

بین السدین یعنی جنوبی امریکہ کا سفر ۹۹۔۱۱۴

☆ دیوار یاجوج و ماجوج یا سد ذوالقرنین کیا ہے؟ کیا وہ دو پہاڑوں کے درمیان لوہے اور تانبہ سے بنی کوئی ٹھوس دیوار ہے یا اس کی حقیقت کچھ اور ہے؟ ذوالقرنین نے کوئی دیوار بنائی تھی یا ردم؟ ردم کیا ہے اور کہاں پر واقع ہے؟

یاجوج وماجوج کون ہیں؟ ۱۱۴۔۱۳۶

☆ یاجوج و ماجوج کون ہیں؟ کیا وہ شریعت کی پابند اور انسانی نسل سے تعلق رکھنے والی کوئی قوم ہے یا پھر ایک غیر مکلف مخلوق؟ وہ کوئی ارضی مخلوق ہے یا خلائی؟ وہ کوئی فسادی مخلوق تھی یا عذاب الٰہی؟ وہ اس وقت کہاں ہیں؟ کب اور کہاں سے نکلیں گے؟

تعمیر ردم کہاں اور کیسے؟ ۱۳۶۔۲۱۵

☆ زبر الحدید، صدفین، عملیت نفخ اور قطر سے بننے والی حیرت انگیز ردم اور خلائی سائنس کا سب سے بڑا معمہ ''زمین کا مقناطیسی میدان''۔

قطبی برف اور ''سدین'' ۲۱۵۔۲۴۷

☆ زمینی سائنس کے سب سے بڑے معموں میں سے ایک منطقۂ باردہ شمالی وجنوبی پر پھیلی ہزاروں کلومیٹر لمبی چوڑی برف کی چادر اور ''سدین'' کی حقیقت۔ برفانی چادروں کا حیرت انگیز ماضی اور مستقبل۔ سائنس دانوں کے لئے صدیوں سے معمہ بنی برف کی یہ چادریں قدرتی عوامل کا نتیجہ یا ذوالقرنین کا کارنامہ؟ کیوں اور کیسے۔

ذوالقرنین اور وعدۂ جزا وسزا ۲۴۷۔۲۷۸

☆ سفر کے دوران ملنے والی قوموں سے ذوالقرنین کا وعدۂ جزا وسزا اور ایمیزون جیسے دنیا کے پراسرار ترین برساتی جنگلوں کی حیران کن داستان۔

☆ برساتی جنگل اور ان کے آس پاس رہنے والی قوموں کی تاریخ۔ افریقہ کی سیاہ فام اور براعظم شمالی وجنوبی امریکہ کی قوموں کا سرچشمہ کیا ہے؟

☆ بین السدین یعنی جنوبی امریکہ میں رہنے والی وہ کونسی قوم ہے جس نے سد بنانے کا مطالبہ کیا تھا؟ بین السدین رہنے والی قوم پابند شرع تھی یا ناسمجھ اور غیر مکلف؟

خروج یاجوج وماجوج ۲۷۹۔۳۱۵

''حدب'' کیا ہے؟ یاجوج وماجوج کا خروج کب، کیسے اور کہاں سے ہوگا۔ ایمان وعمل کی آخری حد اور روئے زمین سمیت نسل انسانی کا دردناک انجام۔

ذوالقرنین کون ہیں؟ ۳۱۵۔۳۲۶

☆ ذوالقرنین کون تھے؟ بادشاہ تھے، نبی تھے یا پھر روئے زمین کے تکوینی معاملات میں غیر معمولی اختیار وقدرت کی حامل ایک عظیم الشان اور بے مثال شخصیت۔

اسباق واقعہ: سائنس کیا ہے؟ ۳۲۷۔۳۶۱

☆ سائنس کا ماضی، حال اور مستقبل۔ کیا سائنسی ترقی دور جدید کے ارتقاء یافتہ انسانی دماغ کی پیداوار ہے یا پھر خالق کائنات کے تکوینی نظام اور طریق ربوبیت کا حصہ؟

☆ نظریۂ ارتقاء: سائنس کے نام پر رائج سب سے بڑا فریب۔

عرض مصنف

کتاب ہٰذا کے مطالعہ کے بعد اگر آپ کو لگتا ہے کہ الحاد اور فتنۂ ارتداد کی سرکوبی اور ایمان کے تحفظ وازدیاد کے لئے سورۂ کہف کی چند آیتوں کی یہ تشریح دور حاضر کی ضرورت ہے، تو آپ سے درخواست ہے کہ امت مسلمہ کو ارتداد کے بھنور سے بچانے اور قرآن کے متعلق شکوک وشبہات اور غلط فہمیوں کو دور کرتے ہوئے دنیا کے سامنے اسلام کی صداقت ثابت کرنے میں درس وتدریس، تقریر وتحریر، فیسبوک، واٹس ایپ اور یوٹیوب جیسے جدید ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ہمارا ہر ممکن تعاون فرمائیں۔

عبدالعزیز ابن احمد

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَيَسْأَلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۖ قُلْ سَأَتْلُو عَلَيْكُمْ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿٨٣﴾ إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ
فِي الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿٨٤﴾ فَأَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٨٥﴾ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ
مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۗ قُلْنَا يَا ذَا
الْقَرْنَيْنِ إِمَّا أَنْ تُعَذِّبَ وَإِمَّا أَنْ تَتَّخِذَ فِيهِمْ حُسْنًا ﴿٨٦﴾ قَالَ أَمَّا مَنْ ظَلَمَ
فَسَوْفَ نُعَذِّبُهُ ثُمَّ يُرَدُّ إِلَىٰ رَبِّهِ فَيُعَذِّبُهُ عَذَابًا نُكْرًا ﴿٨٧﴾ وَأَمَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ
صَالِحًا فَلَهُ جَزَاءً الْحُسْنَىٰ ۖ وَسَنَقُولُ لَهُ مِنْ أَمْرِنَا يُسْرًا ﴿٨٨﴾ ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا
﴿٨٩﴾ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلَىٰ قَوْمٍ لَمْ نَجْعَلْ لَهُمْ مِنْ
دُونِهَا سِتْرًا ﴿٩٠﴾ كَذَٰلِكَ وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿٩١﴾ ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا
﴿٩٢﴾ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُونِهِمَا قَوْمًا لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ
قَوْلًا ﴿٩٣﴾ قَالُوا يَا ذَا الْقَرْنَيْنِ إِنَّ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ فَهَلْ
نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلَىٰ أَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿٩٤﴾ قَالَ مَا مَكَّنِّي فِيهِ
رَبِّي خَيْرٌ فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿٩٥﴾ آتُونِي زُبَرَ الْحَدِيدِ ۖ
حَتَّىٰ إِذَا سَاوَىٰ بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَعَلَهُ نَارًا قَالَ آتُونِي
أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ﴿٩٦﴾ فَمَا اسْطَاعُوا أَنْ يَظْهَرُوهُ وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا
﴿٩٧﴾ قَالَ هَٰذَا رَحْمَةٌ مِنْ رَبِّي ۖ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَّاءَ ۖ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّي حَقًّا
﴿٩٨﴾ وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ ۖ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا
﴿٩٩﴾ وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِلْكَافِرِينَ عَرْضًا ﴿١٠٠﴾ الکھف

داستان ذوالقرنین اور زبان عربی

ذوالقرنین، دیوار ذوالقرنین اور یاجوج و ماجوج وہ عناوین ہیں جو تاریخ میں امت مسلمہ سمیت یہود و نصاری کے لئے بھی ہمیشہ بحث و تمحیص کا موضوع رہے ہیں۔ ذوالقرنین اور یاجوج و ماجوج کے صحیح مصداق کو سمجھنے کے لئے دنیا کا تجسس ہمیشہ برقرار رہا، تفاسیر کے علاوہ عرب و عجم میں اس موضوع پر بے شمار کتابیں اور رسائل لکھے گئے، دنیا کی مختلف زبانوں میں اس پر ویڈیوز اور فلمیں بھی بنائی گئیں، ؛لیکن صرف یہی نہیں کہ دنیا آج تک واقعۂ ذوالقرنین کے حقیقی مفہوم سے نا آشنا رہی بلکہ سورۂ کہف کی ان آیتوں کے غلط تراجم و تفاسیر کی بنیاد پر دور جدید کے کفار اور مستشرقین کو اسلام کے خلاف کھل کر یہ اعتراض اٹھانے کا موقع بھی ملا کہ دور جدید کی تحقیقات نے اس قسم کی تمام مذہبی کہانیوں کو مسترد کر دیا ہے، آج سیٹلائٹ کا زمانہ ہے جس نے زمین کے چپے چپے کی تصویر اتار لی ہے، اگر یاجوج و ماجوج کا کہیں کوئی وجود ہوتا یا ان کو محصور کر دینے والی کوئی ایسی دیو قامت دیوار ہوتی تو وہ ہمیں کہیں نہ کہیں نظر ضرور آتی۔۔۔۔الغرض اس طرح کے بے شمار اعتراضات سے کتب و رسائل کے علاوہ یوٹیوب، فیس بوک اور انسٹا گرام جیسے ذرائع ابلاغ بھرے پڑے ہیں۔

آخر وہ کونسی وجوہات تھیں کہ جس قصہ کو قرآن نے ''ذکر یعنی مبنی بر دلیل سبق آموز بیان'' سے تعبیر کیا تھا وہی قصہ ایک ایسی چیستاں اور عقدہ بن کر رہ

گیا کہ جس کو حل کرنے کے لئے دور حاضر کے نامور مسلم علماء و مؤرخین بھی گوناں گوں تعبیرات اور معذرت خواہانہ اسلوب اپنانے کے لئے مجبور ہو گئے۔

کتاب اللہ میں قرآن کو بار بار ''عربی'' میں نازل کرنے کی بات دنیا کی دیگر زبانوں کی بنسبت ''زبان عربی'' کی امتیازی شان کو بیان کرنے کے لئے کافی ہے۔

فصاحت و بلاغت میں امتیازی حیثیت کے علاوہ مختلف النوع معانی کی ادائیگی کے لئے الفاظ کا تنوع اور ترکیب جمل کے انوکھے پن کے ساتھ مرور زمانہ کے باوجود الفاظ کی اپنی اصل ہیئت پر ایسی بقا کہ اگر دنیا کسی لفظ کے غلط مفہوم پر اتفاق کر لے تب بھی اس کے صحیح مفہوم کو متعین کر لیا جائے، یہ زبان عربی کی چند ایسی خصوصیات ہیں جو دنیا کی کسی دوسری زبان میں نہیں پائی جاتیں۔

عربی زبان کی انہیں پائیدار اور بے مثال خوبیوں کی بنا پر خاتم الرسل اور رحمۃ للعٰلمین کے خطاب کے ساتھ قیامت تک کی نسل انسانی کے لئے پیغامبر بنا کر بھیجے گئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کی صورت میں جو آخری ہدایت نامہ عطا کیا گیا وہ ''عربی مبین'' میں تھا۔

آیئے! زبان عربی کی اس خصوصیت کے علاوہ ''القرآن یفسر بعضہ بعضاً'' کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے ذوالقرنین کے قصہ سے متعلق ان آیتوں کے صحیح معانی و مفاہیم کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ قرآن نے ان آیات میں کیسے کیسے اسرار و رموز اور سائنسی عقدوں سے پردہ اٹھا کر اپنے لازوال

معجزہ ہونے پر دلالت کرنے والے ایسے ایسے زندہ ثبوت پیش کئے ہیں کہ انہیں دیکھ کر کوئی بھی سنجیدہ انسان قرآن کو کسی خلاق علیم وخبیر ہستی کا کلام مان کر خدائے واحد پر ایمان لائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ذکر ذوالقرنین

قصۂ ذوالقرنین سورۂ کہف کی آیت نمبر ۸۳ سے ۱۰۰ تک میں بیان کیا گیا ہے۔ جس کی پہلی آیت ہے: وَيَسْأَلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۖ قُلْ سَأَتْلُو عَلَيْكُمْ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿۸۳﴾ وہ آپ سے ذوالقرنین کے متعلق پوچھتے ہیں، آپ فرمادیجیے کہ میں تمہیں ان کا کچھ مبنی برشواہد حال کہہ سناتا ہوں۔

قصۂ ذوالقرنین کو قرآن نے ''ذکر'' سے تعبیر کیا ہے۔ ذکر اسم ہے اور اس کا وزن ''فِعْل'' کمال معنی کو ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ ''ذکر'' کسی دعوے پر مشتمل ایسے بیان کے لئے بولا جاتا ہے جسے کسی دلیل یا خارجی شہادت سے واضح کیا جائے۔ بالفاظ دیگر ایسا تذکرہ جس کی صداقت کے پیچھے مضبوط بنیاد بھی ہو۔۔۔۔۔قرآن کو ''ذکر'' سے تعبیر کرنے کی وجہ یہی ہے کہ اس میں ربوبیت، وحدانیت، رسالت، یوم ساعت اور اخروی حساب جیسے جو جو دعاوی مذکور ہیں، ان پر خارج میں شہادت و دلائل موجود ہیں۔ چنانچہ قرآن نے بار بار آفاق وانفس کی نشانیوں میں غور وفکر کی دعوت دیتے ہوئے کہا ہے کہ جو کوئی ان آیات میں غور کرے گا وہ اس نتیجہ پر پہونچ جائیگا کہ یہ کائنات بے مقصد اور عبث نہیں بلکہ اسے کسی علیم وخبیر منصوبہ گر نے کسی خاص مقصد کے تحت ایک مخصوص مدت کے

ساتھ پیدا کیا ہے اور اس مدت کے اختتام کے بعد اس کا حساب بھی دینا ہوگا۔

قرآن میں موجود تذکیر دو طرح کی ہے۔ ایک التذکیر بأیام اللہ یعنی اقوام ماضی کے حالات سے عبرت و نصیحت۔ دوم التذکیر بآیات اللہ یعنی آفاق و انفس کی نشانیوں سے سبق۔۔۔۔۔ واقعۂ ذوالقرنین کی خوبی یہ ہے کہ اس میں دونوں طرح کی تذکیر موجود ہے۔

الغرض ''مِنْهُ ذِكْرًا'' میں ''من'' تبعیض کے لئے ہے۔ جبکہ ''ذکر'' کا وزن کمال معنی کو ظاہر کرتا ہے یعنی ذوالقرنین کا جو حال بیان کیا جائیگا وہ مختصر تو ہوگا؛ لیکن ساتھ ساتھ ان کے متعلق جو کچھ کہا جائیگا اس کے شواہد خارج میں بھی موجود ہونگے۔ چنانچہ اگلی آیت میں ذوالقرنین کے متعلق دعویٰ کرتے ہوئے فرمایا: إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿۸۴﴾ بلا شبہ ہم نے ذوالقرنین کو ساری زمین پر اقتدار بخشا تھا اور انہیں ہر قسم کی انتہائی تیز رفتار بلند پرواز سواریاں عطا کی تھیں۔

''سَبَبًا'' سے مراد 'انتہائی تیز رفتار بلند پرواز سواریاں' کیونکر ہے اور زمین میں اقتدار و قدرت دینے سے کیا مراد ہے، نیز ان دونوں دعووں کے درمیان کیا تعلق ہے؟ ان جیسے سوالات کو حل کرنے کے لئے پہلے قرآن کا اگلا بیان ملاحظہ فرمائیں کہ ذوالقرنین نے کس کس قسم کی بلند پرواز سواریوں اور وسائل حمل ونقل کا استعمال کرتے ہوئے زمین پر کیسے کیسے کارنامے انجام دئے۔

پہلا سفر: مغرب الشّمس

(North Polar Region) یعنی منطقۂ قطب شمالی کے

اس علاقے کا سفر جہاں سورج مہینوں تک طلوع یا غروب نہیں ہوتا۔

فَأَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۵﴾ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَوَجَدَ عِندَهَا قَوْمًا ۗ قُلْنَا يَا ذَا الْقَرْنَيْنِ إِمَّا أَن تُعَذِّبَ وَإِمَّا أَن تَتَّخِذَ فِيهِمْ حُسْنًا ﴿۸۶﴾

قرآن کے خلاف کفار اور مستشرقین کی جانب سے اٹھائے جانے والے سرفہرست اعتراضات میں ایک اشکال کی بنیاد سورۂ کہف کی آیت نمبر ۸۶ ہے، کہا جاتا ہے کہ اگر قرآن اللہ کا کلام ہوتا تو اس میں یہ بیان نہ ہوتا کہ ''سورج کیچڑ والے پانی کے چشمہ میں ڈوبتا ہے۔''

آیتوں کے اسرار و رموز اور صحیح مفاہیم کو بیان کرنے سے پہلے قدیم و جدید مفسرین کا وہ ترجمہ پیش خدمت ہے جسے بنیاد بنا کر غیر مسلمین اور ملحدین مذکورہ بالا اعتراض پیش کرتے ہیں۔

ترجمہ: چنانچہ اس نے ایک راہ پکڑی، حتی کہ جب وہ غروب آفتاب کی حد تک پہونچ گیا تو اس نے سورج کو ایک کیچڑ والے چشمے میں ڈوبتے دیکھا۔

ذخیرۂ اسلامی کی تقریبا تمام قدیم و جدید تفاسیر جیسے طبری، قرطبی، خازن، جلالین، بیضاوی، الرازی، ابن کثیر، روح المعانی، مفاتیح الغیبیہ، محاسن التاویل،

فی ظلال القرآن اور اردو مترجمین میں مولانا محمود الحسن دیوبندی، مولانا ابوالاعلی مودودی، جناب غلام احمد پرویز سے لیکر مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اور مولانا وحیدالدین خان تک سبھی حضرات نے مذکورہ بالا آیت کا تقریباً ایک جیسا ہی مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ذوالقرنین جب اقصائے مغرب میں پہونچے تو انہیں ایسا محسوس ہوا گویا کہ سورج کیچڑ والے چشمے یا کالے پانی میں ڈوب رہا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ " ذَات حَمْأَة وَهِيَ الطِّين الْأَسْوَد وَغُرُوبهَا فِي الْعَيْن فِي رَأْي الْعَيْن ۔ جلالین

بل المراد أنه انتهى إلى آخر العمارة من جهة المغرب ومن جهة المشرق، فوجدها فی رأی العين تغرب فی عين حمئة ۔ القرطبی

وقوله: { وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ } أي: رأى الشمس فی منظره تغرب فی البحر المحيط، وهذا شأن كل من انتهى إلى ساحله، يراها كأنها تغرب فيه ۔ ابن كثير

آیت کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کے لئے اس میں موجود ''مَغْرِبَ الشَّمْسِ'' ''وَجَدَهَا تَغْرُبُ'' اور'' عَيْنٍ حَمِئَةٍ '' ان تین جملوں کو اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔

مَغْرِبَ الشَّمْس کیا ہے؟

مغرب اسم ظرف ہے، جس کا معنی ہے غروب ہونے کا وقت یا غروب

ہونے کی جگہ۔ یہ زمان اور مکان دونوں کے لئے مستعمل ہے۔ عرفاً مغرب سے مراد زمین کا وہ علاقہ ہوتا ہے جس کے افق سے سورج غروب ہو جائے۔ اسی طرح مطلع اسم ظرف ہے جسکا معنی ہے طلوع ہونے کا وقت یا جگہ۔ عرفاً اس سے مراد زمین کا وہ علاقہ ہوتا ہے جس کے افق پر چاند یا سورج طلوع ہو۔

لفظ ''مغرب'' جب ''مشرق'' کے ساتھ استعمال ہو تو وہ سمت کا معنی دیتا ہے؛ لیکن یاد رہے کہ انتہائے مشرق و انتہائے مغرب پر دلالت کرنے والا کوئی لفظ قرآن میں موجود نہیں؛ چونکہ انتہاء پر دلالت کرنے والے الفاظ ''مسطح زمین'' (Flat Earth) کے نظریہ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور یہ نظریہ خلاف واقعہ ہے، نہ سائنس اس کی تصدیق کرتی ہے اور نہ قرآن۔۔۔۔ قرآن کے مطابق جس طرح زمین کے متعدد مشارق و مغارب ہیں اسی طرح اسکے مطالع و مغارب میں بھی تنوع ہے اور یہ بات زمین کے گول ہونے کا لازمہ ہے۔۔۔۔۔۔۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ ذوالقرنین کونسے مغرب میں تشریف لے گئے اور وہ مغرب دوسرے مغارب سے کیسے مختلف تھا ؟

''غربت الشّمس فی مکان کذا'' کا معنی کیا ہے؟

غرب، یغرب، غربۃ و غربا و غرابۃ کا معنی ہے: دور ہونا، نظروں سے اوجھل ہونا، پردیسی ہونا۔۔۔۔۔ جب اس کا فاعل ''النجم یا الشّمس'' جیسے اجرام سماوی ہوں تو اس کا معنی نظروں سے اوجھل ہونا، چھپنا اور غائب ہونا کیا جاتا ہے۔ جیسے غرب النجم: ستارہ غائب ہو گیا۔ جب غرب کا صلہ ''عن'' آئے، جیسے غرب

زید عنا تو اس کا معنی ہوتا ہے: زید ہم سے دور ہو گیا۔ لیکن جب غرب کا صلہ ''فی مکان'' آئے تو اس کا معنی ہوتا ہے ''غیر معمولی طور پر اس علاقہ سے بہت دور چلے جانا'' جیسے تغرب زید فی الارض: زید اپنے وطن سے اتنا دور چلا گیا کہ اس کا کوئی اتہ پتہ نہ ہو۔ اسی طرح ''غرب فی سفرہ'' وہ دور دراز سفر پہ نکل گیا۔ چنانچہ اگر کوئی شخص سفر پر جائے اور اپنے معمول کے مطابق کچھ روز بعد واپس چلا آئے تو ایسے شخص کے لئے تغرب فی الارض کا استعمال درست نہیں ہوگا، بلکہ یہ جملہ تبھی بولا جائیگا جب کوئی شخص غیر معمولی طور پر اپنے وطن سے دور دراز نکل جائے اور اپنے علاقے میں لمبی مدت کے لئے نظر نہ آئے۔

دراصل ''غرب فی مکان کذا'' کنایہ ہے اپنے وطن یا علاقہ سے روپوش ہوجانے اور دور دراز چلے جانے سے۔ اب جس طرح غرب فی سفرہ اور تغرب زید فی الارض کا ترجمہ کوئی یہ نہیں کرتا کہ زید زمین میں گھس گیا یا ڈوب گیا، اسی طرح وجدھا تغرب فی عین حمئۃ کا یہ ترجمہ درست نہیں کہ سورج کیچڑ والے چشمے میں ڈوبتا ہے، بلکہ ''غربت الشمس فی مکان کذا'' کا صحیح مطلب یہ ہوگا کہ سورج اس علاقے میں غیر معمولی طور پر نظر نہیں آتا۔ یا باعتبار ناظر سورج اس علاقہ سے کافی دوری پر چلا جاتا ہو۔

چوبیس گھنٹوں میں سورج کا طلوع وغروب ہونا ایک معمول کا واقعہ ہے، اس طرح کے معمول کو ظاہر کرنے کے لئے تطلع و تغرب الشمس کی تعبیرات استعمال کی جاتی ہیں، اس قسم کے معمول کے مطابق چلنے والے دورانیہ کے لئے''

تغرب الشمس فی مکان کذا '' کا استعمال درست نہیں ہوگا ،'' غربت فی مکان کذا '' کا استعمال تبھی درست ہوگا جب وقفۂ غروب غیر معمولی ہو اور غیر معمولی غروب تبھی کہلائیگا جب سورج چوبیس گھنٹے یا اس سے زائد وقت کے لئے نظر نہ آئے۔

وَجَدَهَا تَغْرُبُ

فعل وجد کی دو قسمیں ہیں، ایک عام اور دوسرا فعل قلب۔

افعال قلوب جنہیں افعال شک ویقین بھی کہا جاتا ہے، ان کی تعداد سات ہیں: ''حسب، ظن اور خال''، ان تینوں کا استعمال خبر میں شک کے اظہار کے لئے ہوتا ہے۔ ''علم، رأی اور وجد'' یہ تینوں خبر میں یقین کو بیان کرتے ہیں جبکہ ''زعم'' شک ویقین دونوں کے لئے مستعمل ہے۔

جب ''وجد'' عام فعل بمعنی اصاب ہو تو ایک ہی مفعول سے بات ختم ہو جاتی ہے۔ جیسے

وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَقْبُوضَةٌ ﴿٢٨٣ البقرة﴾

فَوَجَدَا عَبْدًا مِنْ عِبَادِنَا آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِنْ عِنْدِنَا ﴿٦٥ الكهف﴾

قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ أَنْ نَأْخُذَ إِلَّا مَنْ وَجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهُ ﴿٧٩ يوسف﴾

لیکن جب ''وجد'' افعال قلوب میں سے ہو تو وہ مابعد آنے والے جملہ کو حال اور ذوالحال سے بدل دیتا ہے۔۔۔۔ یا یوں کہیے کہ فعل قلب ''وجد'' ایسے جملوں پر داخل ہوتا ہے جن سے فعل کے جاری ہونے کا پتہ چلتا ہو۔

حال بننے والا کلمہ کبھی اسم فاعل ہوتا ہے تو کبھی مضارع۔ اسم فاعل کے برخلاف جب حال مضارع ہو تو وہ بلا کسی انقطاع کے فعل کے جاری ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے

قَالُوا وَجَدْنَا آبَاءَنَا لَهَا عَابِدِينَ ﴿۵۳ الأنبياء﴾

وَإِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ ﴿۴۴ ص﴾

فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُرِيدُ أَنْ يَنْقَضَّ فَأَقَامَهُ ﴿۷۷ الكهف﴾

إِنِّي وَجَدْتُ امْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَأُوتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ﴿۲۳ النمل﴾

تغرب الشمس

زیر بحث آیت میں بھی وجد کے بعد اسم فاعل کے بجائے ''تغرب'' فعل مضارع حال واقع ہوا ہے۔ لہٰذا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ذوالقرنین جب اس علاقہ میں پہونچے تو اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ لیکن غرب کا صلہ ''فی مکان'' ہونے کی وجہ سے اس کا معنی ہوگا: سورج اس علاقہ سے مسلسل دور ہوتے جا رہا تھا۔

وجد الشمس تغرب فی مکان کذا کا ترجمہ ہوگا: اس نے فلاں جگہ پہ سورج کو مسلسل غروب ہوتے پایا یعنی اس جگہ کے اطراف مسلسل رہنے والے اندھیرے کے گھیرے میں آتے جا رہے تھے۔ یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس جگہ رات کا دائرہ مسلسل بڑھتا جا رہا تھا۔

الغرض ذوالقرنین جس مغرب میں تشریف لے گئے ان دنوں وہ علاقہ

مسلسل چوبیسوں گھنٹوں پر مشتمل رات کی لپٹ میں آتا جارہا تھا۔

نوٹ: علم النحو کی متداول اور درسی کتابوں میں یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ ''وجد'' اور دیگر افعال قلوب کے بعد آنے والے دونوں جز مفعول بہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہوتے ہیں، اور دونوں مفعول ایک کے قائم مقام ہوتے ہیں۔۔۔۔ لیکن مذکورہ بحث کے دوران ہم دیکھ چکے ہیں کہ ''وجد'' کے بعد آنے والے جملہ اسمیہ کے جزء ثانی میں حالیت کا مفہوم پایا جاتا ہے؛ لہٰذا جب اس بارے میں دیگر اصحاب علم کی آراء کے تتبع کی کوشش کی گئی کہ تو پتہ چلا کہ متداول کتابوں میں موجود دو مفعول کی بنا پر منصوب ہونے والی بات دراصل بصری نحویوں کا قول ہے جبکہ فراء اور کوفیوں کی جانب منسوب قول کے مطابق جزء ثانی مفعول ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں **همع الهوامع للسيوطي** اور **الانصاف فی مسائل الخلاف**

یاد رہے: کہ سورج کے غروب ہونے یا دور چلے جانے کا یہ مطلب نہیں کہ واقعتاً سورج زمین کے اردگرد گھوم رہا ہے اور زمین مرکز میں ہے بلکہ اس قسم کی تعبیر صرف انسانی رؤیت اور حواس کے پیش نظر ہی استعمال کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دور حاضر میں 'ناسا' جیسے دنیا کے تمام سائنسی اور فلکیاتی ادارے بھی ''(Sunrise) سورج کا طلوع ہونا اور (sunset) سورج کا غروب ہونا'' جیسے الفاظ ہی استعمال کرتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے قرآن نے ''وَجَدَهَا تَغْرُبُ'' کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے اس مشاہدہ کی نسبت ذوالقرنین کی جانب کی ہے،

ورنہ فی الواقع قرآن کی رو سے زمین سورج کے گرد ہی گردش کر رہی ہے جیسا کہ اگلے صفحات سے واضح ہو جائیگا۔

آیئے اب جانتے ہیں وہ علاقہ کونسا تھا؟

قرآن نے اس علاقہ کو جہاں سورج مسلسل کئی دنوں تک نظر نہیں آتا تھا بلکہ لمبی مدت تک وہاں متواتر رات ہوتی جا رہی تھی، اسے ''عَيْنٍ حَمِئَة'' والا علاقہ کہا ہے۔

لیکن ''عَيْنٍ حَمِئَة'' کا صحیح مفہوم کیا ہے اور یہ کہاں پر واقع ہے۔ ان جیسے سوالوں کو حل کرنے سے پہلے آیئے ہم علم جغرافیہ کی کچھ ابتدائی باتوں کو سمجھ لیتے ہیں۔

زمین نظام شمسی میں تیسرے نمبر پر واقع ایک سیارہ ہے، یہ سیارہ اپنے محور پر گھومنے کے ساتھ ساتھ سورج کے گرد بھی گردش کرتا ہے۔

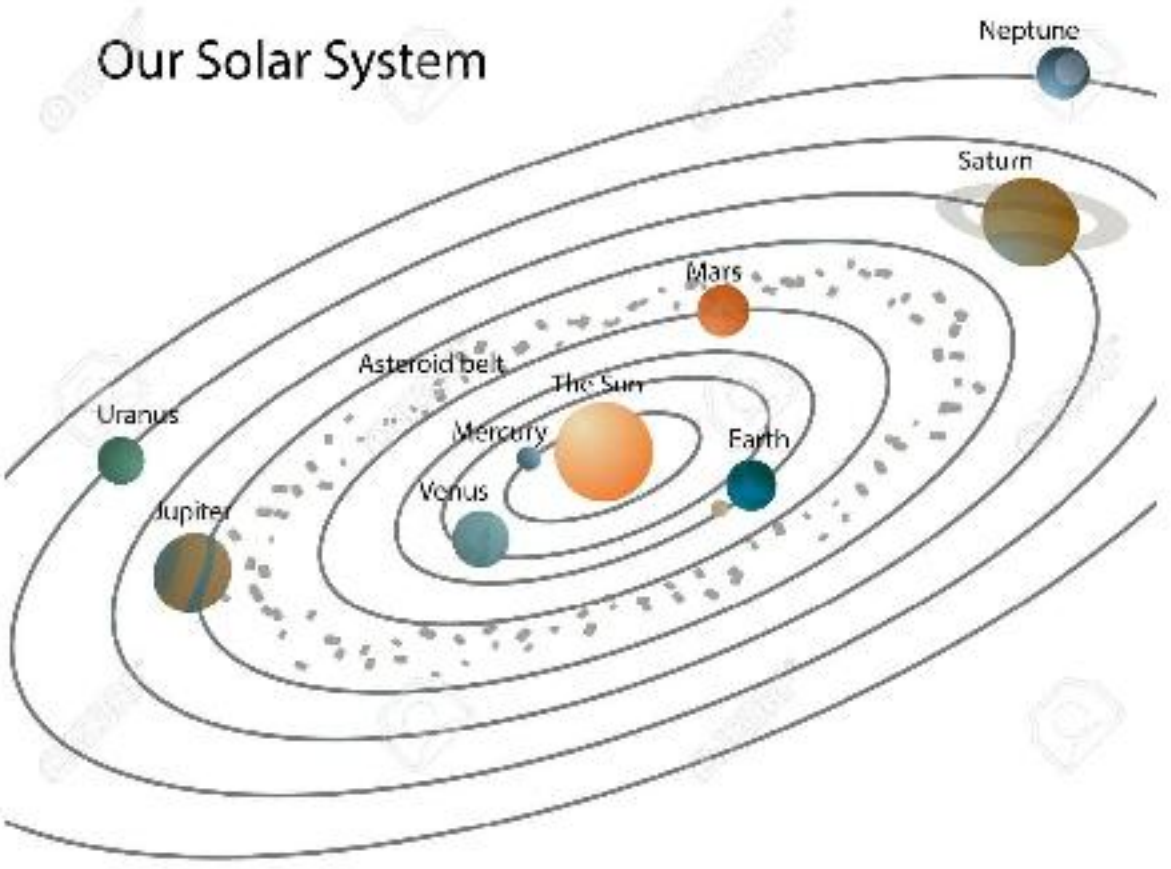

زمین سورج کے گرد جس فرضی دائرے پر گردش کرتی ہے اسے ''مدار ارض (Orbit)'' کہتے ہیں جبکہ زمین کے اندر سے ایک سرے سے دوسرے سرے

کی جانب جانے والے اس فرضی خط مستقیم کو ''محور'' (Axis) کہتے ہیں جس کے اردگرد زمین لٹو کی طرح گھومتی ہے۔ محور کا شمالی سرا قطب شمالی کہلاتا ہے اور جنوبی سرا قطب جنوبی۔

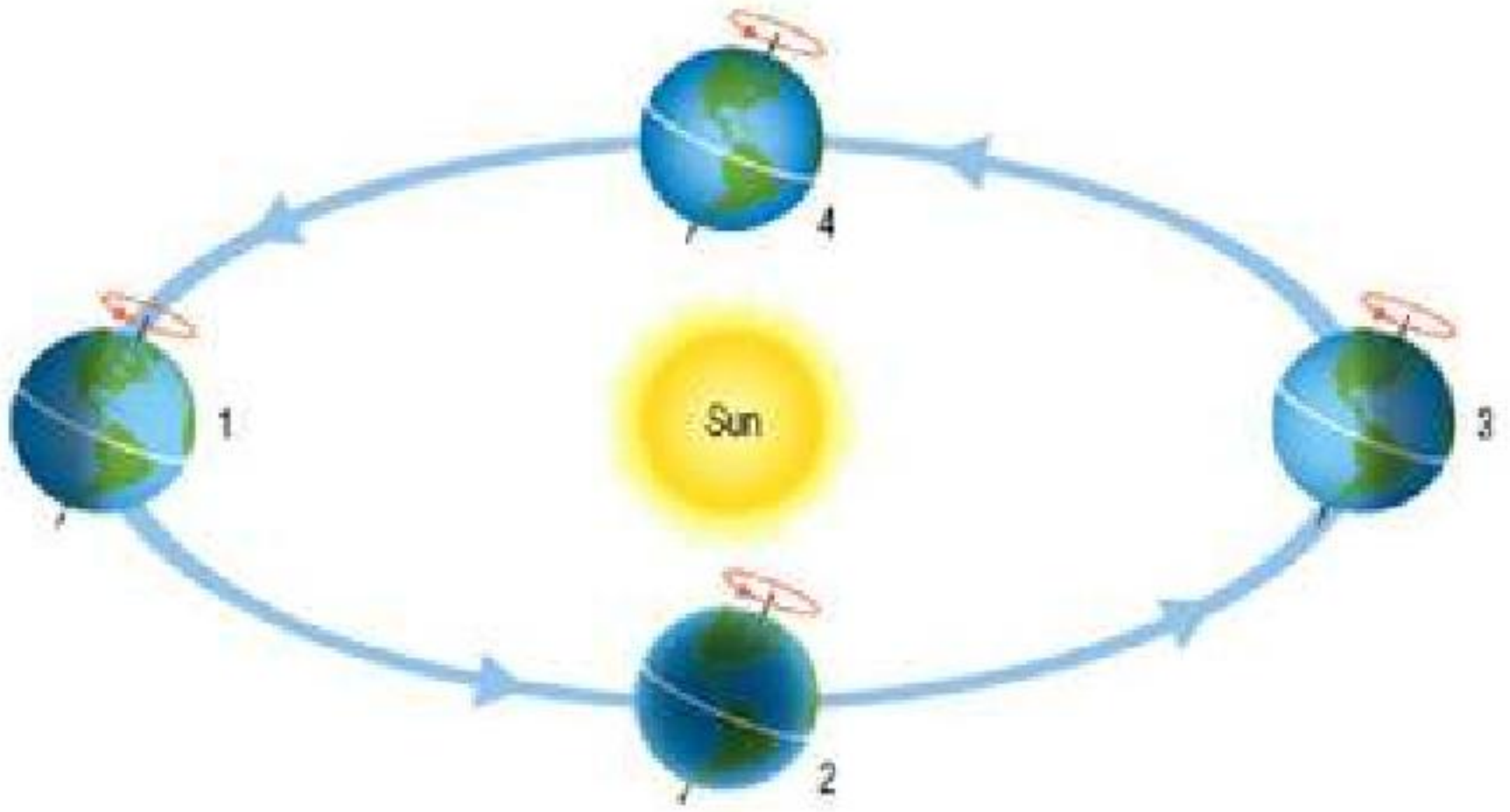

سورج کے گرد اپنے مدار پر چکر لگانے میں زمین کو بارہ مہینے لگتے ہیں، جن سے سال بنتا ہے۔ جبکہ اپنے محور کے گرد ایک چکر پورا کرنے میں اسے چوبیس گھنٹے لگتے ہیں، جس سے رات دن وجود میں آتے ہیں۔

اپنے محور پر گردش کے دوران زمین کا ایک حصہ ہمیشہ سورج کی طرف ہوتا ہے، جبکہ دوسرا آدھا حصہ مخالف سمت میں۔ سورج کی سمت والے حصے پر اجالا ہونے کی وجہ وہاں دن ہوتا ہے اور مخالف سمت والا حصہ اندھیرے میں ہونے کی وجہ سے وہاں رات ہوتی ہے۔ چونکہ زمین ہر آن گردش میں ہوتی ہے اس لئے زمین پر طلوع اور غروب کا منظر بھی ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ اندھیرے والا حصہ جیسے جیسے سورج کی طرف آتا جاتا ہے ویسے ویسے وہاں صبح ہوتی جاتی ہے اور دن والا حصہ جیسے جیسے سورج کی مخالف سمت کی طرف بڑھتا جاتا ہے ویسی ویسے وہاں

رات ہوتی جاتی ہے۔

لیکن سورج کے گرد چکر لگاتے وقت زمین کا محور اپنے مدار پر زاویہ قائمہ نہیں بناتا یعنی زمین عموداً حرکت نہیں کرتی بلکہ گردش کرتے وقت محور قدرے ترچھا رہتا ہے۔ اگر زمین اپنے مدار پر ترچھی ہو کر گھومنے کے بجائے سیدھی رہکر گھومتی تو ایسی صورت میں زمین کے ہر حصہ پر روزانہ بارہ گھنٹے کا دن اور بارہ گھنٹے کی رات ہوتی؛ لیکن چونکہ یہ ترچھی ہو کر گھومتی ہے اس لئے قطب شمالی اور قطب جنوبی میں سے ہر ایک اپنے آس پاس کے علاقوں سمیت یکے بعد دیگرے چھ ماہ تک مسلسل سورج کی روشنی میں رہتا ہے تو دوسرا تاریکی میں۔ جہاں مسلسل روشنی پڑتی ہے وہاں چوبیس گھنٹوں کے دن ہوتے ہیں اور جہاں مسلسل تاریکی ہوتی ہے وہاں چوبیس گھنٹوں کی رات۔

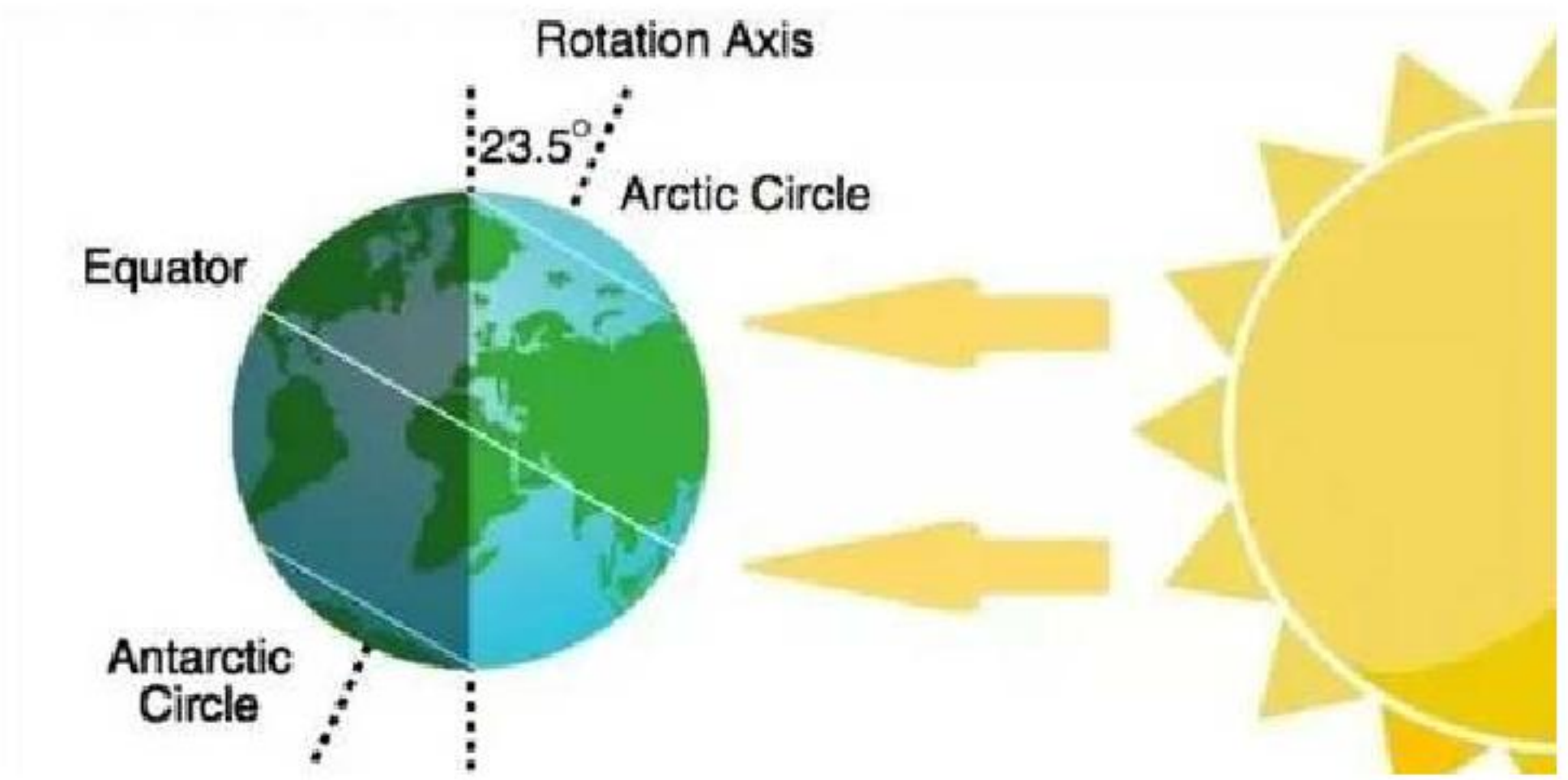

جن علاقوں میں مسلسل چوبیس گھنٹوں کے رات دن ہوتے ہیں انہیں (Poral Region) کہا جاتا ہے۔ قطب شمالی والے علاقے کو منطقۂ باردہ شمالی اور قطب جنوبی والے علاقے کو منطقۂ باردہ جنوبی بھی کہا جاتا ہے؛ کیونکہ ان

دونوں منطقوں کا اکثر حصہ ہزاروں کلومیٹر لمبی چوڑی برف کی موٹی موٹی پرتوں سے ڈھنکا ہوا ہے۔ جس دائرے میں منطقۂ باردہ شمالی واقع ہے اسے آرکٹک سرکل (Arctic circle) کہا جاتا ہے اور جس دائرے میں منطقۂ باردہ جنوبی واقع ہے اسے انٹارکٹک سرکل (Antarctic circle) کہا جاتا ہے۔

منطقۂ باردہ شمالی جہاں چھ چھ ماہ تک چوبیس گھنٹوں کی رات اور چوبیس گھنٹوں کے دن ہوتے ہیں

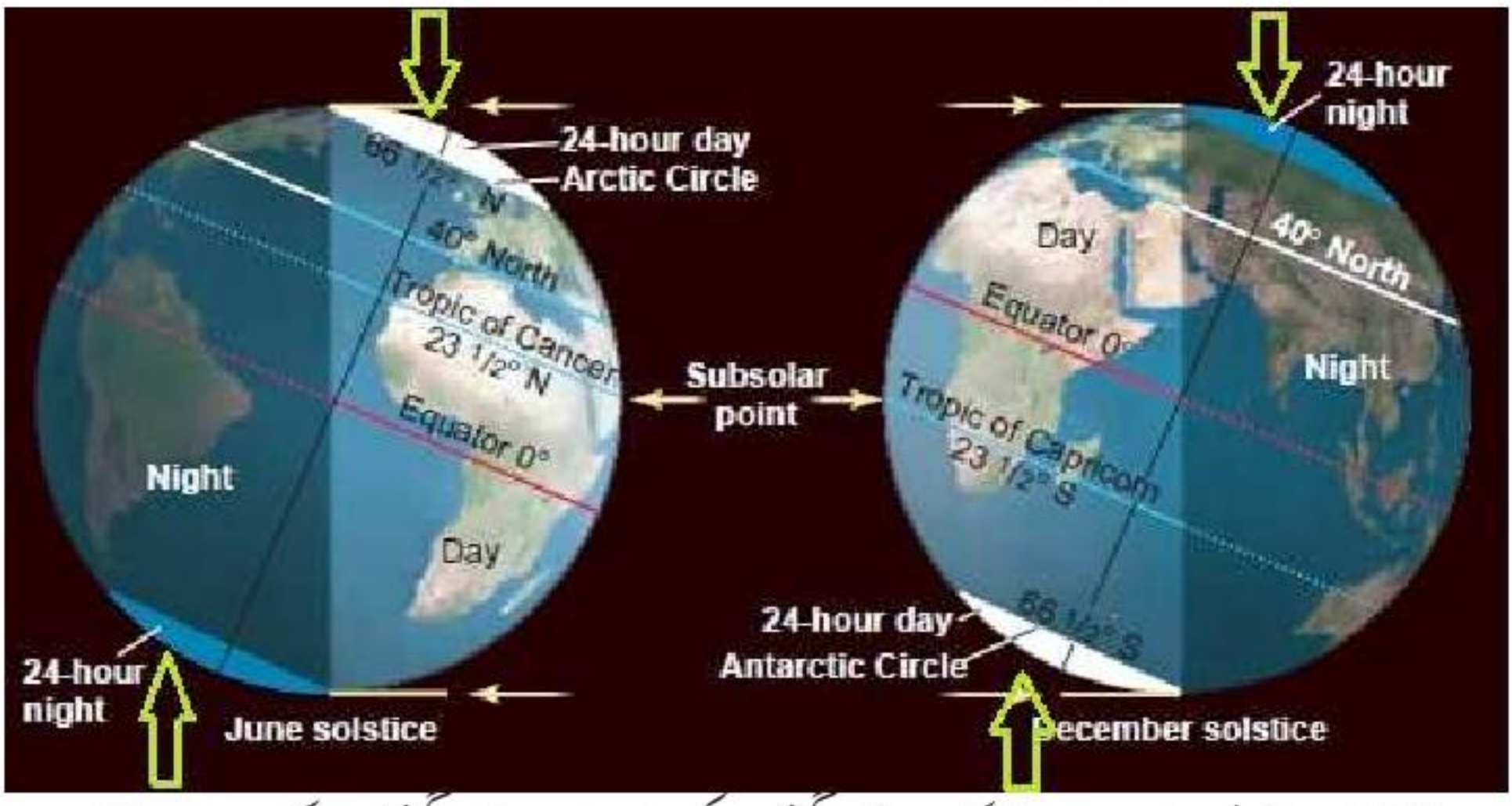

منطقۂ باردہ جنوبی جہاں چھ چھ ماہ تک چوبیس گھنٹوں کی رات اور چوبیس گھنٹوں کے دن ہوتے ہیں

اندھیرے یا اجالے کا غیر معمولی دورانیہ

وقت اور جگہ کے تعین کے لئے سطح زمین کو طولاً و عرضاً کچھ فرضی خطوط کے ذریعہ تقسیم کیا گیا ہے، جنہیں طول بلد اور عرض بلد کہا جاتا ہے۔ عرض بلد والے خطوط میں مذکورہ ذیل پانچ خطوط کو کافی اہمیت حاصل ہے۔

خط استواء، خط سرطان، خط جدی، دائرۂ منطقۂ شمالی، دائرۂ منطقۂ جنوبی ۔

خط استواء زمین کے اردگرد بالکل بیچ میں اس طرح کھینچا گیا ہے کہ وہ زمین کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ خط استواء صفر درجہ عرض بلد پر واقع ہے۔ اس

کے محاذی شمالاً وجنوباً ساڑھے تیئس ساڑھے تیئس درجہ عرض بلد پر خط سرطان اور خط جدی واقع ہیں۔

سورج سال بھر انہی دو خط یعنی خط سرطان اور خط جدی کے درمیان حرکت کرتا دکھائی دیتا ہے۔ خط استواء پر سے سورج سال میں دو مرتبہ ۲۱ مارچ اور ۲۱ ستمبر کو گذرتا ہے۔

۲۱ مارچ کے بعد جب سورج خط استواء سے خط سرطان کی طرف جاتا دکھائی دیتا ہے تو اس وقت منطقۂ باردہ شمالی میں (Polar days) یعنی مسلسل چوبیس گھنٹوں سے زائد رہنے والے دن کا آغاز ہوتا ہے؛ جبکہ منطقۂ باردہ جنوبی میں مسلسل رہنے والی راتیں شروع ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ سورج جب ۲۱ جون کو خط سرطان پر پہونچ جاتا ہے تو اس وقت منطقۂ باردہ شمالی کا پورا علاقہ چوبیس گھنٹے رہنے والے اجالے سے روشن ہوجاتا ہے، جبکہ منطقۂ باردہ جنوبی کے سارے علاقہ میں معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ ۲۲ جون کے بعد سورج دوبارہ خط استواء کی طرف پلٹ جاتا ہے، اب دونوں طرف مسلسل رہنے والے اجالے یا اندھیرے کا دائرہ سمٹتا جاتا ہے، حتیٰ کہ ۲۱ ستمبر کو سورج دوبارہ خط استواء پر پہونچ جاتا ہے۔ اس کے بعد سورج جب ۲۲ ستمبر کو خط جدی کی جانب بڑھنا شروع ہوتا ہے تو معاملہ برعکس ہوجاتا ہے، یعنی قطب شمالی جو گذشتہ چھ ماہ تک مسلسل اجالے میں تھا اب وہاں مسلسل رہنے والی رات کا آغاز ہوجاتا ہے جبکہ قطب جنوبی جو گذشتہ چھ ماہ تک مسلسل رات کے سایہ میں تھا اب وہاں طلوع آفتاب کا

نظارہ شروع ہونے پر مسلسل رہنے والے اجالے کا دور شروع ہوجاتا ہے، حتیٰ کہ ۲۱ دسمبر کو (تین ماہ بعد) جب سورج خط جدی پر پہونچ جاتا ہے تو اس وقت منطقۂ باردہ شمالی کا سارا علاقہ مسلسل رہنے والی رات کی لپیٹ میں آجاتا ہے جبکہ منطقۂ باردہ جنوبی کا علاقہ مکمل اجالے میں۔

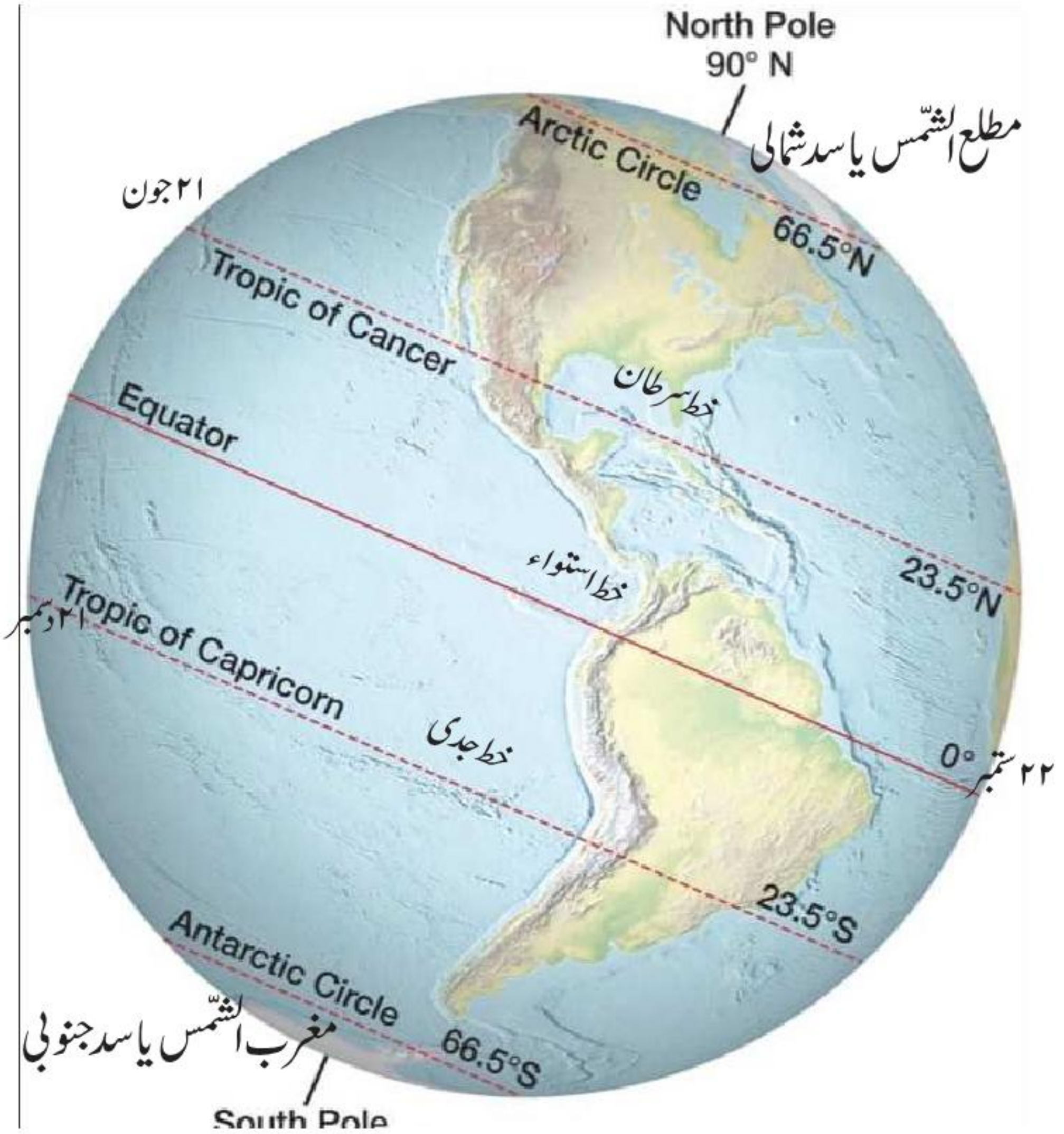

آمدم برسر مطلب

اب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ منطقہ باردہ شمالی اور منطقہ باردہ جنوبی ان دو مقامات میں سے ہی کوئی ایک جگہ ایسی ہونی چاہیے جسے مغرب الشمس کہا جاسکتا ہے؛ اس لئے کہ روئے زمین پر یہی دو علاقے ایسے ہیں جہاں رات اور دن کا

دورانیہ غیر معمولی ہوتا ہے۔

اب ذوالقرنین نے جس علاقہ میں ایسا مشاہدہ کیا تھا، اس کے متعلق قرآن کا بیان ہے کہ وہ ایک ''عین'' تھا، یعنی وہاں ہر سو پانی ہی تھا۔ چنانچہ اب یہ بات طے ہوجاتی ہے کہ ان دو مقامات میں سے وہ علاقہ ''منطقۂ باردہ شمالی'' ہی ہے؛ اس لیے کہ مذکورہ دو علاقوں میں سے منطقۂ بارد جنوبی کا بڑا اور درمیانی حصہ جزیرۂ انٹارکٹا کی خشکی پر مشتمل ہے جبکہ منطقۂ باردہ شمالی کا بیچ بلکہ اکثر و بیشتر حصہ پانی ہی پانی ہے۔

چنانچہ ۲۲ ستمبر کے بعد کا ہی وہ وقت ہے جب ذوالقرنین مغرب الشّمس یعنی منطقۂ باردہ شمالی میں تشریف لے گئے تھے؛ کیونکہ یہی وہ وقت ہے جب قطب شمالی پر مسلسل رہنے والی رات کا آغاز ہوتا ہے جو دھیرے دھیرے ۲۱ دسمبر تک سارے علاقہ کو گھیر لیتی ہے۔ یہی مطلب ہے ''وَجَدَهَا تَغْرُبُ'' کا، کہ اس علاقہ میں سورج مسلسل غروب ہوتا جارہا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ ذوالقرنین نے جس ''عَيْنٍ حَمِئَةٍ'' میں سورج کو مسلسل غروب ہوتے دیکھا تھا، کیا یہی وہ پانی کا علاقہ ہے جسے موجودہ اصطلاح میں (Arctic Ocean) یعنی بحر شمالی کے نام سے جانا جاتا ہے۔۔۔۔۔اگر یہی بات ہے تو کیا پانی کے اتنے بڑے ذخیرے پر ''عین'' کا اطلاق ہوسکتا ہے؟ جبکہ دنیا اسے پانچویں سمندر کے طور پر جانتی ہے۔

پانی کا یہ ذخیرہ کوئی سمندر ہے یا عین؟ اسے سمجھنے کے لئے آیئے پہلے یہ

سمجھتے ہیں کہ قرآن کی رو سے ''عین'' کسے کہتے ہیں۔

عین، ینبوع اور نہر میں فرق

کھارے پانی کے جن بڑے ذخائر کو ''سمندر'' کہا جاتا ہے، عربی میں انہیں ''بحر'' کہتے ہیں جبکہ پینے اور کاشت کے قابل میٹھے پانی کو ''عین'' ینبوع اور نہر'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

عام طور پر غلط فہمی میں ''عین'' اور ''ینبوع'' کو ایک دوسرے کا مترادف سمجھتے ہوئے ان سے ایسا پانی مراد لیا جاتا ہے جسے ہم اپنی زبان میں جھرنا یا چشمہ کہتے ہیں۔

ینبوع: زمین سے پھوٹ کر تیزی سے بہنے والے پانی کو ''ینبوع'' کہا جاتا ہے۔ ''نبع'' کا معنی ہے پھوٹنا اور ابلنا۔ پھوٹنے اور ابلنے کے مفہوم کے ساتھ وزن فعل ''یفعول'' نے اس کے معنی میں ''تیز رفتاری'' کا معنی شامل کر دیا؛ لہٰذا ایسا چشمہ جس کے بہاؤ میں تیزی ہو اسے ''ینبوع'' کہا جائیگا۔

نہر: کا معنی ہے چیرنا، پھاڑنا اور کھودنا۔ نہر الماء: پانی کا زمین پر بہہ کر اپنا راستہ بنالینا۔ نہر الارض: زمین کو پھاڑنا۔ حفر البئر حتی نہر: زمین کو کھودا حتی کہ پانی نکل آیا۔ استنہر السائل: سیال چیز کا تیزی سے بہنا۔ استنہر النہر: دریا کا وسیع جگہ گھیرنا۔۔۔ نہر کے استعمالات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اصولی طور پر ''نہر'' کے لغوی معنی میں زور، تیزی رفتار اور وسعت، یہ تینوں مفہوم ایک ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ لہٰذا سطح ارض پر تیزی سے

بہنے والا ایسا پانی جس میں تیزی کے ساتھ وسعت اور ایسا زور بھی ہو کہ وہ زمین کو چیر کر اپنا راستہ بنالے تو ایسے پانی کو ''نہر'' کہا جاتا ہے۔

عین : جبکہ ''عین'' ہر اس میٹھے اور قابل کاشت پانی کو کہا جائیگا جس میں وسعت کے ساتھ گہرائی بھی ہو۔ چاہے وہ گہرے دریا کی شکل میں بہتا ہو یا کسی سمندر کی طرح مخصوص جگہ پر واقع ہو۔

''العین'' تقریبا ۳۲ معنوں میں مستعمل ہے ، آنکھ ،نقد، بذات خود ، جاسوس ، پانی کا چشمہ، نہر وغیرہ وغیرہ۔العین کے حقیقی معنی میں ''کسی بھی چیز کے اندرون یا گہرائی میں ہونے'' کا مفہوم بنیادی طور پر شامل ہے۔مثلاً آنکھ کو العین اس لئے کہتے ہیں کہ وہ بھی ہڈیوں کے اندر گہرائی میں ہوتی ہے۔جاسوس کو العین اس لئے نہیں کہتے کہ وہ آنکھ سے نگاہ رکھتا ہے بلکہ اس لئے کہ وہ تاک میں رہکر اور اپنے آپ کو چھپا کر مطلوبہ معاملہ کی تہہ اور اندر تک کی خبر رکھتا ہے۔اسی طرح دل کو بھی عین کہا جاتا ہے۔حدیث قرۃ عینی فی الصلوٰۃ کا ترجمہ عام طور پر لوگوں نے اس طرح کیا ہے کہ ''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے'' حالانکہ اس کا صحیح ترجمہ ہے ''میرے دل کا سکون نماز میں ہے'' ؛ کیونکہ ''قرۃ'' خفقان کی ضد ہے، اور یہ دل کی کیفیت ہے آنکھوں کی نہیں ،اور دل بھی جسم کے اندر ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا الفاظ میں غور کرنے پر عین کے معنی میں گہرائی کا مفہوم واضح طور پر پایا جاتا ہے،اس معنی کی تائید سورہ ملک آیت نمبر تیس بھی کرتی نظر آتی ہے۔ :

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَأْتِيكُمْ بِمَاءٍ مَعِينٍ ﴿۳۰ الملك﴾

پوچھئے کہ تم لوگوں کا کیا خیال ہے کہ اگر تمہارا یہ پانی زمین کی گہرائی میں اتر جائے تو کون ہے جو اندرون زمین موجود اس پانی کو تمہیں واپس لا دے۔

نیل وفرات اور دجلہ جیسے دریا کو قرآن نے نہر سے تعبیر کیا ہے۔

قَالَ يَا قَوْمِ أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهَٰذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِنْ تَحْتِي ﴿۵۱ الزخرف﴾

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ ﴿۲۴۹ البقرة﴾

دوسری جانب قرآن نے جس پانی کو نہر سے تعبیر کیا ہے ان پر عین کا اطلاق بھی کیا ہے۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَهَرٍ ﴿۵۴ القمر﴾

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿۴۵ الحجر﴾

وَجَعَلْنَا فِيهَا جَنَّاتٍ مِنْ نَخِيلٍ وَأَعْنَابٍ وَفَجَّرْنَا فِيهَا مِنَ الْعُيُونِ ﴿۳۴ یس﴾

أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِنْ نَخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا ﴿۹۱ الإسراء﴾

مذکورہ آیتوں پر غور فرمائیں! حقیقی معنوں میں فرق ہونے کے باوجود ان آیات میں عین اور نہر کو مترادف کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ سینکڑوں اور ہزاروں کلومیٹر لمبے چوڑے دجلہ وفرات اور نیل وایمزون میں بہتے جس پانی کو عرف عام میں دریا کہا جاتا ہے، اس قسم کے پانی کو قرآن کی اصطلاح کے مطابق عین اور نہر سے تعبیر کیا جائیگا۔

بلکہ قرآن نے سورۂ قمر میں زمین کی چٹانی سطح کے نیچے وسیع اور عریض علاقہ پر پھیلے پانی کے اس نہایت بڑے ذخیرے پر بھی ''عین'' کا اطلاق کیا ہے جس کے متعلق سائنس دانوں نے حالیہ تحقیق میں بتلایا ہے کہ زمین کی تہہ میں اس سے کہیں زیادہ پانی موجود ہے جتنا کہ سطح ارض پر۔ چنانچہ بین الاقوامی سائنسی جریدے ''نیچر'' کی ۲۰۱۴ میں شائع کی گئی ایک تحقیق کے مطابق زمین کی گہرائی میں سطح زمین پر موجود سمندروں سے بھی زیادہ پانی موجود ہونے کا امکان ہے۔۔۔۔حتی کہ بعض سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ زمین کے اندر سطح ارض پر موجود پانی سے تین گنا زیادہ پانی ہونے کا امکان ہے۔

چنانچہ زمین کے اندر کس قدر پانی ہے، اس کا اندازہ طوفان نوح کا حال بیان کرتی قرآن کی اس آیت سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے سے فرمایا تھا: يَا بُنَيَّ ارْكَب مَّعَنَا وَلاَ تَكُن مَّعَ الْكَافِرِين۔ (اے بیٹے ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور کافروں کے ساتھ مت ہو) تو بیٹے نے کہا: قَالَ سَآوِي إِلَى جَبَلٍ يَعْصِمُنِي مِنَ الْمَاء کہ میں کسی پہاڑ پر چڑھ جاؤنگا جو مجھے بچا لیگا، تو نوح علیہ السلام نے جواب دیا قَالَ لاَ عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللّهِ إِلاَّ مَن رَّحِمَ کہ آج اللہ کے حکم سے کوئی بچنے والا نہیں ہے مگر جس پر اللہ ہی رحم فرمائے۔

ملاحظہ فرمائیں! پہاڑوں کو بھی غرقاب کر دینے والا اس قسم کا طوفان صرف سمندروں سے اٹھنے والے بارش کے پانی اور بشکل ینبوع بہنے والے چشموں سے ممکن نہیں تھا بلکہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے زمین کی گہرائی میں بشکل عین موجود

پانی کی بھاری مقدار کو بھی چیر نکالا تھا تبھی جا کر ایسا ہلاکت خیز طوفان برپا کرنا ممکن ہوسکا۔ چنانچہ فرمایا: فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُنْهَمِرٍ ﴿۱۱﴾ وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا فَالْتَقَى الْمَاءُ عَلَى أَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ﴿۱۲﴾ ﴿القمر﴾

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ لغوی خصوصیت اور قرآنی استعمال کے پیش نظر ہم اپنی زبان میں زمین سے نکلنے والے جس پانی کو جھرنا یا چشمہ کہتے ہیں اس پر ینبوع کا اطلاق تو ہوگا؛ لیکن عین کا نہیں، عین اپنے حقیقی معنی میں زمین کے نیچے یا سطح ارض پر دریا، ندی اور نہروں کی شکل میں بہنے والے میٹھے پانی کی اس بھاری مقدار پر بولا جاتا ہے جو نہایت گہرا بھی ہو وسیع وعریض علاقہ پر پھیلا بھی اور تیزی سے بہتا بھی ہو۔

الحاصل عین کے لغوی معنی میں وسعت اور گہرائی کے ساتھ تیزی سے بہنے کے مفہوم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ زمین کی گہرائی میں موجود یہ پانی جب سطح زمین پر نکل کر بہتا ہے تو اسے ''عَيْنٌ جَارِيَةٌ'' کہا جاتا ہے، جب یہی پانی نہایت تیزی کے ساتھ بہتا ہو تو اسے عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّىٰ سَلْسَبِيلًا کہتے ہیں ،جب یہ پانی زمین کو چیر کر سینکڑوں اور ہزاروں میل تک بہتا چلا جائے تو اسے نہر کہا جاتا ہے، جب یہ پانی حرارت وگرمی کے ساتھ نکلے تو اسے عَيْنٍ آنِيَةٍ کہا جاتا ہے، جب یہ پانی فوارے کی شکل میں اچھل اچھل کر نکلتا ہے تو اسے عَيْنَانِ نَضَّاخَتَانِ کہتے ہیں، جب چٹانی سطح کے نیچے کا یہ پانی زمین کو چیر کر بھاری مقدار میں نکالا جاتا ہے تو اس وقت وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا فَالْتَقَى الْمَاءُ عَلَىٰ

أَمْرٍ قَدْ قُدِرَ اور يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا بولا جاتا ہے۔

الغرض لغوی معنی اور مذکورہ بالا آیات میں 'عین' جن صفات سے متصف ہے ان سے یہ بات بالکل عیاں ہوجاتی ہے کہ عین کے پھیلاؤ اور گہرائی کی کوئی حد متعین نہیں، بڑے سے بڑے رقبہ پر بھی وہ پھیلا ہوسکتا ہے اور اسی طرح گہرا سے گہرا تر بھی ہوسکتا ہے۔

اس بحث کے بعد یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ منطقۂ باردہ شمالی کے وسیع و عریض اور گہرائی کے حامل علاقہ میں موجود پانی پر ''عین'' کا اطلاق بالکل درست ہے۔

لیکن رکیے! ایک بڑا سوال یہ ہے کہ اگر قرآن کے استعمال کو دیکھا جائے تو ''عین'' کے اطلاق کے لئے پانی کا میٹھا ہونا بھی ضروری ہے جبکہ منطقۂ شمالی کا یہ پانی تو کھارا ہے، اسی لئے اسے ''بحر یعنی سمندر'' کہا جاتا ہے۔

بلا شبہ علم جغرافیہ میں اس دریا کو پانچویں سمندر کے طور پر جانا جاتا ہے؛ لیکن کیا سائنسی تحقیقات کے مطابق بحر شمالی کا یہ پانی واقعتاً کھارا ہے، کم کھارا ہے یا داستان کچھ اور ہے؟ آیئے اس سوال کو سلجھانے کے لئے پہلے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ قرآن نے منطقۂ شمالی کے اس پانی کو ''عَيْنٌ حَمِئَةٌ'' کیوں کہا ہے۔

اکثر و بیشتر مفسرین نے ''عَيْنٌ حَمِئَةٌ'' کا ترجمہ ''ذات حمأة'' یعنی ''بدبودار کالی مٹی والا پانی یا چشمہ'' سے کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ حیرت انگیز طور پر حالیہ تحقیق میں بحر شمالی کہے جانے والے اس سمندر میں کیچڑ کی بڑی بھاری مقدار

دریافت ہوئی ہے۔۔۔۔۔سائنس داں خود حیران ہیں کہ بھلا لاکھوں مربع کلومیٹر پر پھیلے، پتھریلے علاقوں اور چٹانوں سے گھرے اور سال کے اکثر اوقات برف سے ڈھکے پانی میں کیچڑ کہاں سے آئی!

لائیو سائنس ڈاٹ کام نامی ویب سائٹس پر ۱۴ دسمبر ۲۰۰۷ کو''

(Mysterious Mud Waves Found on Arctic Seafloor)

یعنی بحر شمالی کی تہہ میں لہروں کی شکل میں پراسرار کیچڑ کی دریافت'' کے عنوان سے نشر کئے گئے ایک مضمون میں یہ بات بتلائی گئی ہے کہ برف کی تہہ پر تحقیقات کے دوران سونار ٹکنالوجی سے لی گئی تصاویر سے یہ بات واضح طور پر سامنے آئی ہے کہ بحر شمالی کی تہہ کے مختلف علاقوں میں لہروں کی شکل میں کیچڑ کے بڑے بڑے ٹیلے موجود ہیں، لہروں کی شکل والے ان ٹیلوں میں بعض کی وسعت تو سو فٹ سے بھی

زیادہ ہے۔

محققین اور سائنس داں اس بات کو لیکر حیران ہیں کہ یہ کیچڑ یہاں کیسے آیا اور ان کی بڑی بڑی لہروں کی شکل میں اس طرح کی تشکیل کیسے عمل میں آئی!

ماہرین کا کہنا ہے کہ سمندروں میں پانی کے بہاؤ کی تیزی سے اس قسم کی تشکیل وجود میں آسکتی ہے؛ لیکن بحر شمالی اتنا زیادہ پرسکون ہے کہ اس میں اس طرح لہروں کی شکل میں ڈھیر کا وجود میں آنا سمجھ سے بالاتر ہے۔

"The mud waves, however, were an unexpected surprise. The scientists aren't sure what formed them. "The mud waves could be caused by tidal fluctuations," said expedition scientist Leonard Polyak of Ohio State University. "But that's really just speculation at this point."

ترجمہ: کیچڑ کی لہریں ایک غیر متوقع حیرت کا باعث ہیں۔ سائنسداں فی الحال کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتے کہ یہ کیسے وجود میں آئی ہے۔ اوہائیو اسٹیٹ یونیورسٹی کے مہم جو سائنسدان لیونارڈ پولیاک کا کہنا ہے کہ کیچڑ کی یہ لہریں مدو جزر کی وجہ سے ہوسکتی ہیں۔ لیکن اس وقت یہ واقعی محض قیاس آرائیاں ہی ہیں۔

ملاحظہ فرمائیں:

(www.livescience.com/2137-mysterious-mud-waves-arctic-seafloor.html)

(www.sciencedaily.com/releases/2007/12/071212201343.html)

یقیناً بحیثیت مشاہدۂ ذوالقرنین یہ خبر موجودہ علمی دنیا کے لیے نہایت حیران

کن ہے کہ جب ذوالقرنین بحر شمالی پر وارد ہوئے تو اس وقت اس میں کیچڑ تھا ۔ ۔۔۔سوچیے کہ آخر اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کو کس قسم کی ٹکنالوجی عطا فرمائی ہوگی کہ وہ ہزاروں سال پہلے سورج کے غیر معمولی غروب کے فضائی مشاہدہ کے ساتھ دریا کی تہہ میں ہونے والے اس قسم کے تغیرات کا بھی مشاہدہ کر سکے۔

نیز غور فرمائیں: جو بات دہائیوں کی جدوجہد کے بعد ٹکنالوجی کی مدد سے ہمیں اکیسویں صدی میں معلوم ہو رہی ہے وہ بات قرآن نے کتنے عرصہ قبل اور کیسے دور میں اور کس قدر سادہ الفاظ میں بیان کر دی ہے!

لیکن کیا قرآن نے اس قسم کی باتیں صرف جائے ورود کی نشاندہی کے طور پر ہی ذکر کی ہیں یا ساتھ ساتھ دوسرا بہت کچھ بھی بتلایا جا رہا ہے۔۔۔۔ہاں بیشک اگر ''حَمِئَةٌ'' کے اصل معنی پر غور کیا جائے تو بہت سے دیگر حیرت انگیز انکشافات بھی سامنے آسکتے ہیں۔آیئے جانتے ہیں کہ ''حَمِئَةٌ'' کا اصل معنی کیا ہے؟

کیا ہے عَيْنٌ حَمِئَةٌ؟

وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ

مختلف لوگوں نے ''عَيْنٍ حَمِئَةٍ'' کے مختلف تراجم کئے ہیں۔

تفسیر عیاشی، تفسیر قمی جیسی مشہور شیعہ تفاسیر میں مذکور ایک روایت کے مطابق ''عَيْنٍ حَمِئَة'' سے مراد عین الحیاۃ یعنی آب حیات کا چشمہ ہے۔

دور جدید کے کئی مفسرین نے ''کالے پانی'' کا ترجمہ کیا ہے۔جبکہ اکثر شیعہ وسنی مفسرین نے اس کا ترجمہ ''ذات حمأۃ'' یعنی بدبودار کالی مٹی والا پانی کیا ہے۔

وَجَدَها أى الشمس تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ أى ذات حمأة وهى الطين الأسود من حمئت البئر تحمأ حمأ إذا كثرت حمأتها. روح المعانى

وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ : ذات حمأة من حمئت البئر إذا صارت فيها الحمأة. تفسير نسفى

"حمئة" أى كثيرة الحمأة وهى الطينة السوداء، تقول: حمات البئر حمأ (بالتسكين) إذا نزعت حماتها. وحميت البئر حمأ (بالتحريك) كثرت حماتها. القرطبى

عَنْ مُجَاهِدٍ فِي قَوْلِ اللَّهِ عَزَّ ذِكْرُهُ {تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ} قَالَ : ثَأْطَةٌ. تفسير الطبرى

وذكروا أن المراد بالعين الحمئة العين ذات الحمأة وهى الطين الأسود وأن المراد بالعين البحر فربما تطلق عليه... تفسير الشيعة (الميزان فى تفسير القرآن)

فرأى أنّها تغرب فى بحر غامق أو عين ذات ماء آجن: {وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ. تفسير الأمثل

والحَمْأَةُ : الطِّيْنُ الأَسْوَدُ المُنْتِنُ، وعَيْنٌ حَمِئَةٌ: ذاتُ حَمْأَةٍ. المحيط فى اللغة

أى فى عين ماء ذى طين وحمإ أسود ۔ كشاف

حَمِئَةٌ

حَمِئَةٌ: حمئ يحمأ، حمأ و حمأة سے اسم مبالغہ ہے ۔

حمئ البئر یحمأ حمأ (باب سمع یسمع) کنویں کا بدبودار کالی مٹی والا ہونا۔

حمئ البئر، یحمأ حمأ (باب فتح یفتح) کنویں سے کالی بدبودار مٹی نکالنا۔

احمأت البئر (باب افعال) کنویں میں کالی بدبودار مٹی ڈالنا۔

الحمأ و الحمأۃ: بدبودار کیچڑ، کالی بدبودار مٹی۔

اسی لغوی معنی کے پیش نظر تقریباً تمام اہل معاجم وتفاسیر نے عین حَمِئَة کا معنی ''ذات حمأۃ'' کیا ہے۔ یعنی بدبودار کالی مٹی والا چشمہ۔۔۔۔ جبکہ شاید ''حَمِئَةٌ'' کو صفت کا صیغہ مانتے ہوئے بعض مفسرین نے اس کا ترجمہ ''کثیرۃ الحمأۃ'' یعنی 'بہت زیادہ کالی مٹی والا چشمہ' کیا ہے۔

اب اگر ''حَمِئَةٌ'' کو صفت مشبہ گردانا جائے تو اس کا معنی ہوگا۔ ''ہمیشہ کیچڑ والا ہونا''۔ اور اگر اسم مبالغہ مانا جائے تو اس کا معنی ہوگا ''مسلسل کیچڑ والا ہوتے جانا''۔۔۔۔ سیاق کلام کو مدنظر رکھتے ہوئے مؤخر الذکر معنی کو ترجیح دی جائیگی۔ یعنی ''فعل وجد'' کے دخول کی وجہ سے صرف ''غروب شمس'' کے معنی میں ہی امتداد پیدا نہیں ہوگا بلکہ ''عَيْنٍ حَمِئَةٍ'' کے مفہوم بھی اس کی تاثیر ظاہر ہوگی۔ چنانچہ اب اس کا معنی ہوگا ''اس نے سورج کو ایک ایسے دریا میں مسلسل غروب ہوتے دیکھا جس میں مسلسل کیچڑ آتی جارہی تھی''۔

لیکن رکئے! کیا ''عَيْنٍ حَمِئَة'' کا مذکورہ بالا معنی حقیقی ہے یا مجازی؟

عین حَمِئۃ کا صحیح مطلب کیا ہے؟

اب سوال یہ ہے کہ کیا واقعتاً بحر شمالی میں آج بھی مسلسل کیچڑ آتی جا رہی ہے یا یہ صورت حال صرف اس وقت تھی جب وقت ذوالقرنین وہاں وارد ہوئے تھے اور اب صورت حال دوسری ہوسکتی ہے۔۔۔۔۔آیئے اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ''حَمِئۃ'' کا اصل معنی جانتے ہیں۔

کلام عرب میں ''حمیٔ'' کا استعمال کچھ اس طرح کے جملوں میں نظر آتا ہے۔

حمیٔ البئر : کنواں کیچڑ والا ہوگیا۔

حمیٔ زید علی بکر : زید بکر پر برانگیختہ ہوگیا۔

رجل حمیٔ العین : وہ شخص جس کی آنکھ میں شدید تکلیف ہو۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ﴿۲۶ الحجر﴾

حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ ۔۔۔۔۔﴿۸۶ الکھف﴾

اب سوال یہ ہے کہ ان تمام جملوں میں ''حمیٔ'' کا معنی مختلف ہے تو ان میں اصل معنی کیا ہے؟

لغت عربی میں جس طرح الفاظ کے استعمال میں حقیقت ومجاز ایک معمول کی بات ہے اسی طرح فاعل اور صلات کے تنوع سے فعل کے معانی کا اختلاف و تنوع بھی ایک اصولی اور عام بات ہے، لیکن یہ بھی ایک اصولی بات ہے کہ جس کسی

فعل کا معنی صلات اور فاعل کے تنوع سے بدل جائے پھر بھی ان میں ایک قدر مشترک معنی ضرور موجود ہوتا ہے جو کہ فعل کا حقیقی معنی کہلاتا ہے۔۔۔۔۔وہی قدر مشترک خاصیت جب کسی جگہ بتلانی مقصود ہو تو ایسے الفاظ کو مجازاً دوسری جگہوں پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔مثلاً ''رقد، یرقد'' جس کا معنی ہے سونا۔جب اس کا فاعل ''السوق'' ہو تو اس کا ترجمہ ہوگا بازار کا مندا ہو جانا۔

جب فاعل ''الحر'' آئے تو ترجمہ ہوگا گرمی کم ہو جانا۔

جب اسکا صلہ ''عن الامر'' آئے تو اس کا ترجمہ ہوگا کسی کام سے غافل ہو جانا۔

مذکورہ مثالوں پر غور کیجیے! فاعل کے بدلنے سے معانی میں تفاوت واقع ہو چکا ہے لیکن پھر بھی ان تمام میں ایک معنی قدر مشترک کے طور پر موجود ہے اور وہ ہے ''معمول کے فرائض اور سرگرمی کا معطل ہو جانا''۔ٹھیک اسی طرح لفظ ''حمیٔ'' سے بنے جملوں پر غور کیجیے یہاں بھی معانی کے تفاوت کے باوجود ایک معنی سب میں موجود ہے اور وہ ہے۔''اندرونی دباؤ کی وجہ سے کسی چیز کا اپنی حدود کو توڑتے ہوئے اپنے حجم سے بڑھ جانا''۔

چنانچہ ''کنواں، چشمہ اور آنکھ جیسی ہر وہ چیز جو اپنی حدود کو توڑتے ہوئے چاروں اور پھیل جائے، اس پر ''حمیٔ'' کا اطلاق کیا جائیگا ۔مثلاً

حمیٔ زید علی فلان (زید کسی پر برانگیختہ ہو گیا) یہ اس وقت بولا جائے گا جب کوئی غصہ کی حالت میں ایسا مشتعل ہو جائے کہ آنکھ پلکوں سے باہر کی طرف چلی آئے۔ اسی کو ہمارے محاورے میں کہتے ہیں۔''آنکھیں نکالنا'' یا ''آنکھیں پھاڑ کے

دیکھنا''۔

رجل حمئ العین (ایسا شخص جس کی آنکھ میں شدید تکلیف ہو) یہ ایسے شخص کے لئے بولا جائیگا جو آنکھ کی ایسی بیماری میں مبتلا ہوجائے جس میں آنکھ کا ڈورا پلکوں سے باہر آجاتا ہے۔

حمئ البئر (کنواں کیچڑ والا ہوگیا) یہ اس وقت بولا جائیگا جب کنویں کے آس پاس بنی مٹی یا پتھر کی دیوار پانی میں گر کر پانی کی سطح کو اوپر اٹھاتے ہوئے پھیلا دے۔

ٹھیک اسی طرح حمئت العین کا معنی ہوگا ''تیزی سے بہتا میٹھے پانی کا ایسا ذخیرہ جس کا حجم بڑھ جانے کی وجہ سے اپنے آس پاس موجود کناروں کو توڑ پھلانگ کر پھیل گیا ہو۔ جبکہ ''حَمِئة'' اسم مبالغہ ہونے کی وجہ سے عین حَمِئة کا معنی ہوگا ''پانی کا ایسا ذخیرہ جس کا حجم مسلسل بڑھتے جانے کی وجہ سے وہ کناروں کو توڑ

کر مسلسل پھیلتا جا رہا ہو۔

اب کسی بھی چیز کے حجم کے بڑھ کر پھیلنے کے معنی میں جو چیز اہمیت کی حامل ہے وہ ''اس کے آس پاس موجود آڑ اور حفاظتی دیوار کا ٹوٹنا''۔ مثلاً کمزوری یا غصہ کی وجہ سے آنکھوں کی پلکوں کی پکڑ کمزور ہو جانا۔ کنویں کی آس پاس موجود دحفاظتی دیوار کا ٹوٹ جانا۔

منطقۂ شمالی میں واقع دریا کے کناروں کی شکل میں موجود یہی وہ حفاظتی آڑ ہے جسے توڑ کر یہ دریا پھیلتا جا رہا تھا۔

کیا یہ مفہوم درست ہے؟

اب دیکھنا یہ ہے کہ ''حَمِئَة'' کا جو معنی اوپر نکالا گیا ہے، اس کی تائید '' وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ﴿۲۶ الحجر﴾ '' میں موجود ''حَمَإ'' سے ہوتی ہے؟

مسنون: ''سن'' سے مشتق ہے جس کے معنی میں اتار و چڑھاؤ اور کھردرے پن کو پاٹ کر ہمواری پیدا کرنے کا مفہوم شامل ہے۔ سن الشیٔ: چکنا کرنا۔ سن السکین: چھری تیز کرنا۔ سن الطریق: راستہ بنانا۔ سن العقدۃ: گرہ کھولنا۔ سن الامر: کسی بات کو واضح کرنا۔ سن الارض: زمین کا گھاس چرلیا جانا۔ گھاس سے خالی ہو جانا۔

اب مسنون یہ ''حَمَإ'' کی صفت ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ ''حَمَإ'' میں کھردراپن اور اتار و چڑھاؤ جیسا مفہوم ضرور ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس سے مراد

ایسی مٹی ہوگی جو پانی کی وجہ سے پھول چکی ہو۔۔۔۔یہی بات ''فَاسْتَفْتِهِمْ أَهُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَم مَّنْ خَلَقْنَا ۚ إِنَّا خَلَقْنَاهُم مِّن طِينٍ لَّازِبٍ ﴿۱۱﴾ الصافات﴾'' میں ''طِينٍ لَّازِبٍ'' سے بتلائی گئی ہے۔

اللازب :لزَب الطِّينُ: لزِق وتماسك : شديد متماسك الأجزاء۔ دخل بعضُه في بعض ۔ چپکی ہوئی۔باہم پیوست ، گتھی ہوئی ۔

یعنی پہلے مٹی کو ایٹمی یا عنصری سطح تک پانی ملا کر مخصوص طریقہ پر پھلایا گیا، پھر مخصوص سطح پر بھر بھری بنکر پھولی ہوئی مٹی کے اجزاء کو باہم اس قدر ملا دیا گیا کہ اس سے وہ صلصال یا سلالۃ تیار ہوا جس سے انسان کی تخلیق وجود میں آئی ہے۔

الغرض ''حَمَأ'' ایسی گیلی مٹی کو کہتے ہیں جو اپنی ایٹمی یا عنصری سرحد کو توڑ کر اپنے اصل حجم سے بڑھ چکی ہو۔پھر اسے ''مسنون'' یعنی اتنا پاٹا گیا کہ وہ ''لازب'' یعنی اس کے اجزا باہم اس قدر پیوست ہو گئے کہ جس سے وہ صلصلال یا سلالۃ تیار ہو سکے جس سے انسان کی تخلیق عمل میں لائی جا سکے۔

اس طرح ''حَمَأ'' کے معنی میں کناروں کو توڑ کر پھیل جانے کا معنی اس معنی کی تائید کرتا ہے جو ''عين حَمِئة'' کی لغوی تحقیق کے دوران بیان کیا گیا ہے۔

مزید تائید

کبھی کبھی جس طرح حرکات کی تبدیلی سے متضاد معانی پیدا کئے جاتے ہیں اسی طرح حرف لام کے بدلنے پر بھی متضاد معنی پیدا کیا جا سکتا ہے۔چنانچہ حمی یحمی حماية کا معنی ہے: حفاظت کرنا، دیوار بن جانا، آڑ بنکر حفاظت کرنا۔

اب یہاں حرف لام ''ی'' کو ہمزہ'' سے بدلنے پر بالکل متضاد معنی پیدا ہو گیا۔یعنی

حفاظتی دیوار کا ٹوٹ جانا، حفاظت نہ کرنا۔

اگر یہ قیاس درست ہے تو ایسی صورت میں مذکورہ تمام مثالوں کا معنی کچھ اس طرح ہوگا ۔

حمئ البئر : کنواں کیچڑ والا ہوگیا۔یعنی ایسا کنواں جس کے کنارے ٹوٹ چکے ہوں۔

حمئ زید علی بکر : زید بکر پر برانگیختہ ہوگیا۔یعنی ایسا شخص جس کی آنکھیں پلکوں کی کمزوری کی وجہ سے غصہ کی حالت میں باہر نکل آئے۔

رجل حمئ العین : وہ شخص جس کی آنکھ میں شدید تکلیف ہو۔یعنی ایسا شخص جس کی آنکھوں پر پلکوں کی پکڑ نہ رہے۔

لہٰذا اب عین حمئۃ کا معنی ہوگا 'ایسا دریا جس کے کنارے مسلسل ٹوٹتے جانے کی وجہ سے وہ پھیلتا جارہا ہو۔

چنانچہ منطقۂ شمالی کے اس دریا کے کنارے اتنے زیادہ ٹوٹے پھوٹے ہیں کہ روئے زمین کے کسی اور دریا کے کناروں میں ایسی ناہمواری نہیں پائی جاتی۔

جس وقت ذوالقرنین وہاں تشریف فرما ہوئے تھے اس وقت کناروں کا یہ کٹاؤ ''عین'' یعنی دریا کے تیز بہاؤ کی وجہ سے پیدا ہوکر مسلسل بڑھتا جارہا تھا۔

اس کٹاؤ کی وجہ سے بے شمار ندیوں کے علاوہ ایسے سات دریاؤں کا پانی آج بھی اس میں آکر گرتا رہتا ہے جن کا شمار دنیا کے بڑے دریاؤں میں ہوتا

ہے۔

شاید یہ دنیا کا واحد ایسا پانی ہوگا جس میں بڑے بڑے دریاؤں کے علاوہ بحر الکاہل اور بحر اوقیانوس کا پانی بھی داخل ہوکر مسلسل اس کی سطح میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔

سمندر اور دریا کے پانی کے علاوہ اس میں کیچڑ بھی مسلسل بہہ کر آیا کرتی تھی ۔۔۔۔ چنانچہ اس دریا میں لہروں کی شکل میں موجود کیچڑ کے ٹیلے دریا کے بہاؤ کی اس تیزی کو صاف دکھا رہے ہیں جو ذوالقرنین کی آمد کے وقت ہوا کرتی تھی۔

اب اس طرح ''عین حَمِئة'' کا ترجمہ '' کیچڑ والا پانی '' کرنا مجازاً درست ہوگا؛ لیکن اس کے ذریعہ وہ مفاہیم ادا نہیں ہو پاتے جو ''عین حَمِئة'' میں موجود ہیں؛ لہٰذا اس کے لئے ''دریائے ناہنگم کنار'' یا ''پھیلتا جارہا دریا'' جیسا کوئی ایسا لفظ استعمال کرنا ہوگا جو ''عین حَمِئة'' کے مفاہیم کو سمجھانے میں معاون ہو سکے۔

آرکٹک اوشن یا عین حمئۃ

آیت ''حَتَّى إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ'' میں موجود تمام باتوں کا مصداق ثابت ہوجانے کے بعد ابھی بھی ایک اہم سوال باقی ہے، وہ ہے منطقۂ شمالی میں موجود اس دریا کے پانی کا کھارا پن کہ اگر یہ پانی '' بحر یعنی سمندر'' نہیں بلکہ ''عین'' ہے تو اس کا پانی کھارا کیوں ہے؟

متداول علم جغرافیہ کے مطابق روئے زمین پر پانچ سمندر ہیں: بحر الکاہل

، بحر اوقیانوس، بحر ہند، بحر جنوبی اور بحر شمالی۔

بحر شمالی دنیا کے ۵ سمندروں میں سب سے چھوٹا، کم گہرا اور سب سے ٹھنڈا ہے۔اس کے رقبہ کی کمی کے پیش نظر بہت سے ماہرین بحریات اسے بحر کے بجائے بحیرۂ آرکٹک کہتے ہیں۔ اس سمندر کے بیشتر حصے پر برف جمی ہوئی رہتی ہے۔ یہاں آبی حیات بھی بہت کم ہے جبکہ کھارا پن دیگر تمام سمندروں کے مقابلے سب سے کم ہے۔

اس کا رقبہ ۱۴۰۵۶۰۰۰ مربع کلومیٹر (۵۴۴۰۰۰۰ مربع میل) ہے۔ اس کے ساحل کی لمبائی ۴۵ ہزار ۳۸۹ کلومیٹر (۲۸ ہزار ۲۰۳ میل) ہے۔اس کی اوسط گہرائی ۳۹۵۳ فٹ (۱۲۰۵ میٹر) ہے۔سب سے گہری جگہ ۱۵۳۰۵ فٹ (۴۶۶۵ میٹر) ہے۔

یہ قطب شمالی سے تقریباً ۶۰ درجہ عرض بلد تک پھیلا ہوا ہے۔اسے چاروں طرف سے یورپ، روس، کناڈا، گرین لینڈ اور الاسکا جیسے خشکی والے علاقوں نے گھیرا ہوا ہے۔ یہ آبنائے بیرنگ کے ذریعے بحر الکاہل اور بحیرۂ گرین لینڈ کے ذریعے بحر اوقیانوس سے جڑا ہوا ہے۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ منطقۂ شمالی میں موجود اس پانی پر عین کا اطلاق درست ہے یا نہیں ؟

سب سے پہلے ہم اس کے پانی کی ترکیب دیکھتے ہیں۔

بحر شمالی کو (Upside-Down) یعنی الٹا سمندر بھی کہا جاتا ہے۔ عام طور ہوتا یہ

ہے کہ روئے زمین کے عام سمندروں کا پانی اوپر سے (نسبتاً) گرم اور کھارا ہوتا ہے جبکہ نچلی سطح کا پانی نسبتاً ٹھنڈا اور کم کھارا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ سورج کی شعاعیں جب سمندر پر پڑتی ہیں تو وہ سطح سمندر سے میٹھے پانی کو بھاپ بنا کر فضا میں اڑا دیتی ہیں، نتیجتاً نمکیات پیچھے چھوٹ جاتی ہیں اور سطح کا پانی نسبتاً زیادہ کھارا ہوجاتا ہے۔ لیکن نارویجین سیاح فریڈ جوف نانسن نے ۱۸۹۶ء - ۱۸۹۳ء کے درمیان جب بحر آرکٹک کا سفر کیا تو اتفاقی طور پر انہیں پتہ چلا کہ آرکٹک اوشن کی سطح کا پانی اوپر سے ٹھنڈا اور میٹھا ہے جبکہ نیچے کا نسبتاً گرم اور کھارا۔ چنانچہ انہوں نے اس سمندر کا نام (Upside-Down) یعنی الٹا سمندر رکھ دیا۔ نانسن کے بعد متعدد سمندری ماہرین نے بھی انکے اس مشاہدے کی تصدیق کی۔

لیکن کیا آرکٹک اوشن کا یہ پانی دیگر سمندروں کے مقابلے محض اس معنی کر مختلف ہے کہ اسے الٹا سمجھا جائے یا ان میں کوئی بنیادی فرق بھی ہے؟

مختلف ماحول اور موسم کی تبدیلی کے پیش نظر آرکٹک اوشن کے پانی کو مختلف قسم کی تہہ میں تقسیم کیا جاتا ہے؛ بنیادی طور پر وہ تین تہوں پر مشتمل ہے۔ ایک ٹھنڈی اور میٹھے پانی کی تہہ اور اس کے نیچے نسبتاً گرم اور کھارے پانی کی تہہ اور

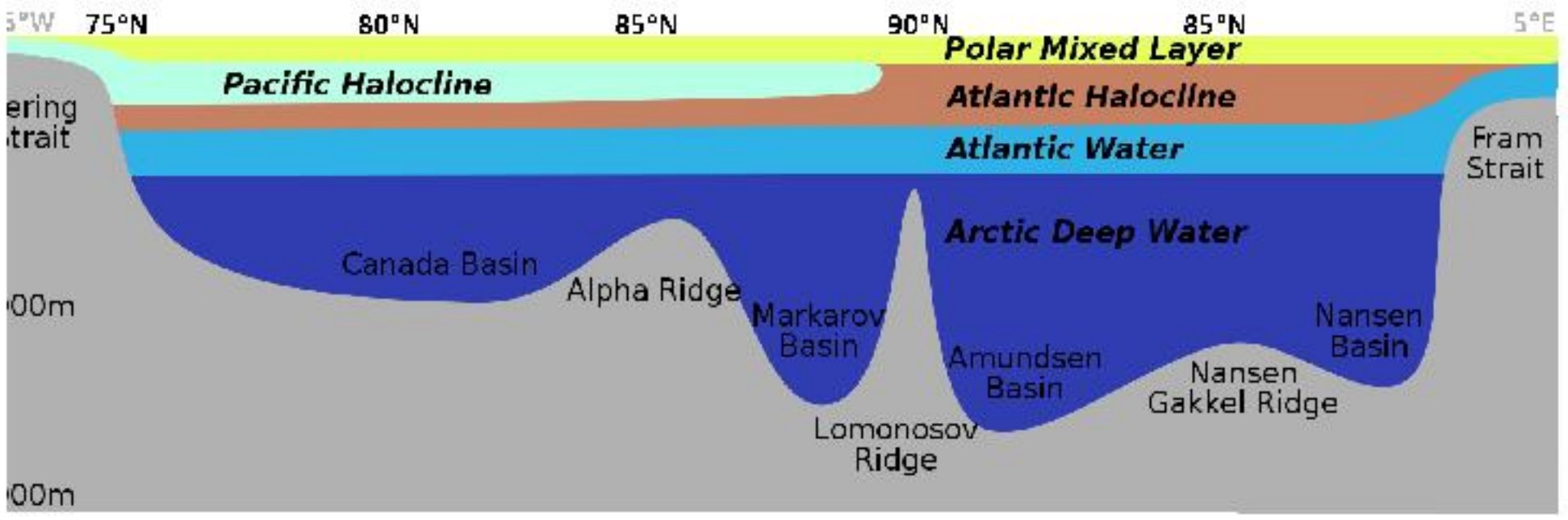

نیچے گہرائی میں مزید میٹھے پانی کی تہہ۔

آرکٹک اوشن میں موجود میٹھا پانی تین بڑے مختلف ذرائع سے مل کر بنتا ہے۔

ایک: آرکٹک اوشن کے اطراف میں ایسے بیسیوں دریا بہتے ہیں جن کا پانی بالآخر بحر شمالی سے جا ملتا ہے۔ان دریاؤں میں بعض ایسے بھی ہیں جن کا شمار روئے زمین پر بہنے والے سب سے بڑے دریاؤں میں ہوتا ہے۔

دو: خود آرکٹک اوشن کی تہہ سے نکلنے والا پانی۔

تیسرا: آرکٹک اوشن کی سطح پر موجود برف کی موٹی تہہ اس کا تیسرا ذریعہ ہے۔

یہ تینوں پانی مل کر میٹھے پانی کی تہہ بناتے ہیں جبکہ کھارے اور گرم پانی کی تہہ اس پانی سے بنتی ہے جو بحر اٹلانٹک سے آکر یہاں شامل ہوتا ہے اور یہی وہ تہہ ہے جس نے آرکٹک اوشن کے حقیقی پانی یعنی عین کی سطح کو اوپر اٹھا رکھا ہے۔

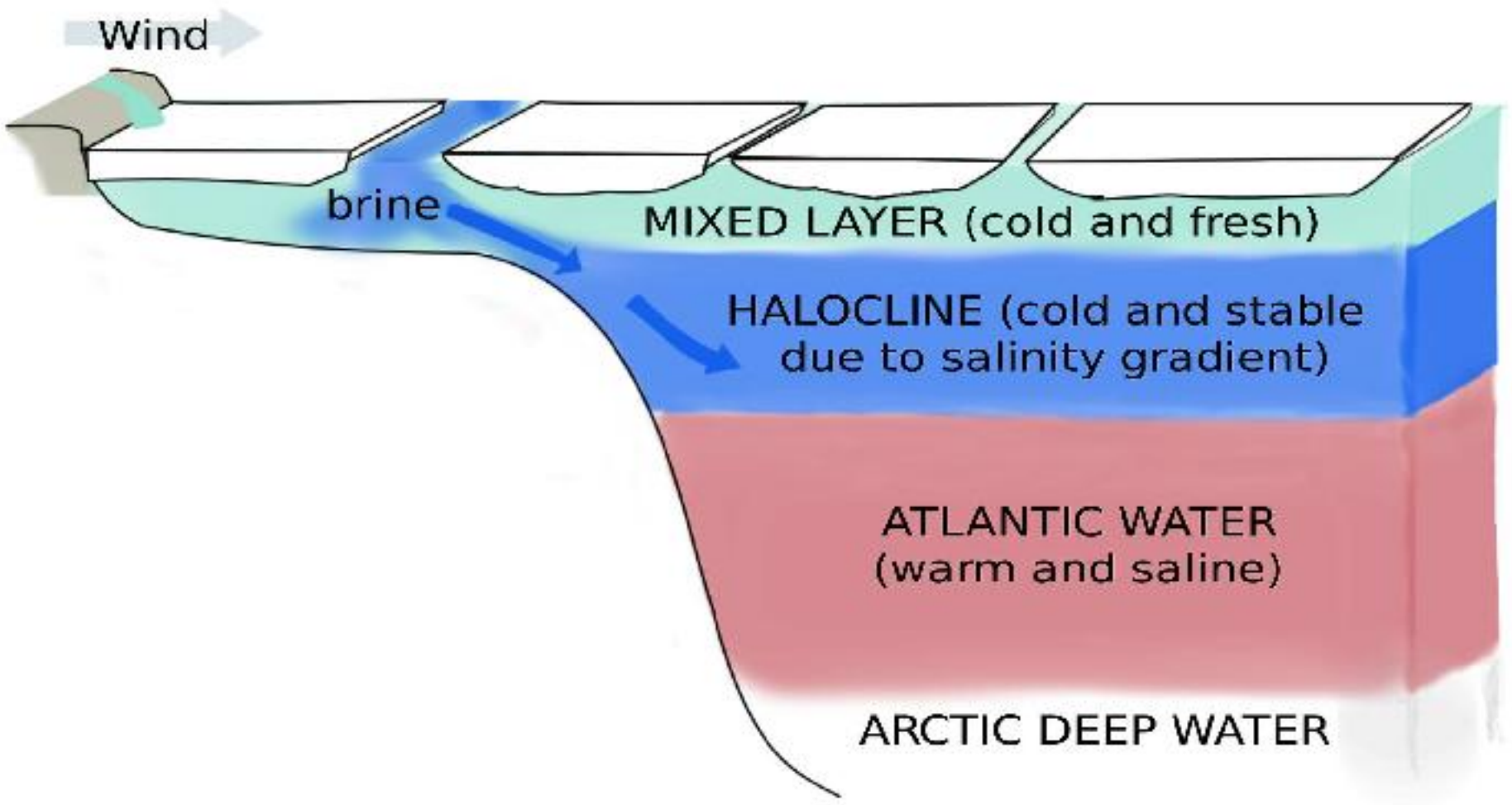

اب چونکہ کھارے پانی کی جو تہہ وہاں پائی جاتی ہے وہ دراصل انٹلانٹک اور بحر الکاہل سے آکر داخل ہونے والے پانی سے بنی ہے، یہ اس عین کا حقیقی پانی نہیں؛ لہٰذا اسے بحر یا بحیرہ کہنا درست نہیں بلکہ اس کا اصل پانی میٹھا ہونے کی وجہ

سے اسے ''عین'' ہی کہنا درست ہوگا۔

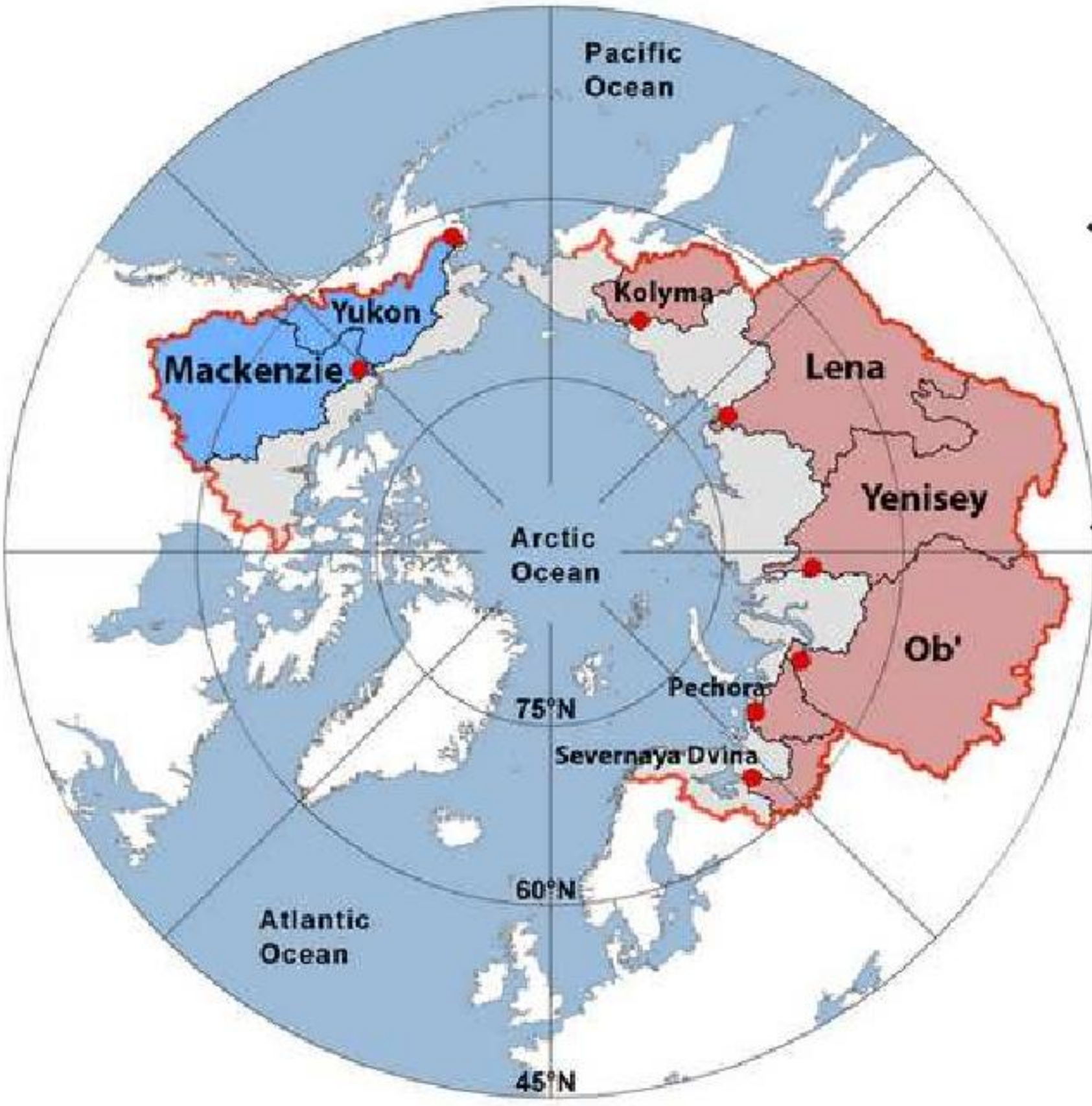

پانچ بڑے دریا جن کا پانی بحر شمالی میں آکر شامل ہو جاتا ہے

الحاصل قرآنی بیان اور جدید سائنسی تحقیق کے پیش نظر ہمارے سامنے یہ بات اب واضح ہو چکی ہے کہ منطقۂ باردہ شمالی کے اس پانی کو ''بحر'' کہنا درست نہیں بلکہ یہ ایک ''عین'' ہی ہے جس کے پانی میں بیرونی مداخلت کی وجہ سے کیچڑ کے علاوہ کھارا پانی بھی سرایت کر چکا ہے۔

'' حَمِئَة '' اسم مبالغہ کا صیغہ ہونے کے علاوہ ''فعل وجد'' کی وجہ سے اس میں استمرار و امتداد کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔ یعنی بحر شمالی کے کنارے مستقل طور پر کٹے پھٹے ہونے کی وجہ سے کیچڑ کے علاوہ اس میں آس پاس کے دریا اور سمندروں کا پانی بھی ہر وقت آکر شامل ہوتا رہتا ہے۔ اور جس کی وجہ سے بحر شمالی کے میٹھے

پانی کی سطح مسقل طور پر اوپر اٹھتی جارہی ہے۔

گذشتہ بائیس سالہ تحقیقات کے بعد سائنس دانوں کی جانب سے نشر کردہ ایک رپورٹ کے مطابق بحر شمالی کی سطح مختلف جگہوں پر سالانہ آدھ انچ سے لیکر ساڑھے تین انچ تک اوپر اٹھتی جارہی ہے۔ جبکہ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اب تک یہ سطح اپنی اصل حد سے کئی سو میٹر اوپر اٹھ چکی ہے کیونکہ اس میں درآنے والے سمندری پانی کی پرت ہی کم وبیش ۴۰۰ سے ۶۰۰ میٹر کمیت کی حامل ہے۔

لیکن چونکہ قرآن نے دریائے شمالی کے اس مشاہدہ کی نسبت ذوالقرنین کی جانب کی ہے اس لئے اس صورت حال کا آج بھی اسی طرح برقرار ہونا ضروری نہیں جو ذوالقرنین کی آمد کے وقت تھی۔

چنانچہ سورج کے غیر معمولی دورانیے والا طلوع وغروب آج بھی اسی طرح جاری ہے جیسا کہ پہلے ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس دریا میں بہاؤ کی وہ تیزی آج نہیں پائی جاتی جو ذوالقرنین کی آمد کے وقت تھی، البتہ کناروں کے کٹاؤ اور دریا میں موجود لہروں کی شکل والے کیچڑ کے ٹیلے اس بات کے زندہ گواہ ہیں کہ کبھی اس دریا میں پانی بڑی تیزی کے ساتھ بہا کرتا تھا۔

الغرض قرآن کے بیان کے مطابق جس وقت ذوالقرنین قطب شمالی کے آس پاس موجود دریا پر تشریف لے گئے تو دریا کے بہاؤ کی تیزی کی وجہ سے اس کے کنارے ٹوٹتے جارہے تھے، جس کی وجہ سے اس میں درآنے والی مٹی اور کیچڑ کے علاوہ دیگر دریاؤں کے ساتھ بحر اوقیانوس اور بحر الکاہل کا پانی بھی اس کی سطح کو

مسلسل اوپر اٹھاتے جارہے تھے۔

لیکن کیا وجہ ہے کہ دریا کے اندر باہر اس قسم کے اثرات پیدا کرنے والی دریا کی وہ تیزی آج دکھائی نہیں دیتی جو ذوالقرنین کی آمد کے وقت موجود تھی؟

سائنس دانوں کے عام خیال کے مطابق سمندر کا تیز بہاؤ ہی کیچڑ کی ایسی لہریں وجود میں لاسکتا ہے جبکہ بحر شمالی میں برف کی چٹانوں کی وجہ سے پانی اتنا پر سکون ہوکر بہتا ہے کہ وہاں اس طرح کی لہریں پیدا ہونا ناممکن سا لگتا ہے! گویا ایک وقت ایسا تھا جب یہ علاقہ برف کی ان چٹانوں سے خالی تھا جس نے پانی کے بہاؤ کو کافی حد تک کم کردیا ہے۔

کیا خیال ہے! اگر ہم یہ مانیں کہ جس وقت ذوالقرنین منطقۂ شمالی پر تشریف لے گئے تھے اس وقت وہاں ہزاروں کلومیٹر لمبے چوڑے علاقہ پر پھیلی برف کی وہ ہزاروں فٹ موٹی چٹانیں موجود ہی نہیں تھیں جنہوں نے کافی حد تک پانی کے بہاؤ کو کم کر رکھا ہے؟

یقیناً ہمارے قاری اس قسم کے خیال کو ایک قسم کی لاعلمی بتلائینگے؛ کیونکہ سائنس دانوں کے دعوے کے مطابق قطبین پر موجود برف کی یہ موٹی موٹی پرتیں لاکھوں سالوں پر محیط قدرتی عمل کے نتیجہ میں وجود میں آئی ہیں۔

چلو اس خیال میں کس قدر سچائی ہے یا سائنس دانوں کا یہ دعوی کتنا درست ہے، اسے اگلے صفحات میں دیکھا جائیگا۔ لیکن سر دست اتنا عرض کرتے چلیں کہ بقول سائنس داں بحر شمالی میں لہروں کی شکل میں موجود کیچڑ کے ٹیلے اس بات کے

گواہ ہیں کہ اس دریا میں کبھی پانی نہایت تیز رفتاری سے بہا کرتا تھا۔اور ایسی صورت حال تبھی واقع ہوسکتی ہے جب وہاں برف کی موٹی موٹی چٹانوں کا وجود نہ ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ برف کی یہ چٹانیں کب وجود میں آئیں؟ لاکھوں سال پہلے یا پھر چند ہزار سال پہلے ذوالقرنین کے اس سفر کے بعد جس میں انہوں نے ''عین'' کو اپنے حقیقی معنی میں تیز رفتاری کے ساتھ بہتا دیکھا تھا۔

فَأَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٨٥﴾ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَوَجَدَ عِندَهَا قَوْمًا ۗ قُلْنَا يَا ذَا الْقَرْنَيْنِ إِمَّا أَن تُعَذِّبَ وَإِمَّا أَن تَتَّخِذَ فِيهِمْ حُسْنًا ﴿٨٦﴾ قَالَ أَمَّا مَن ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهُ ثُمَّ يُرَدُّ إِلَىٰ رَبِّهِ فَيُعَذِّبُهُ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿٨٧﴾ وَأَمَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُ جَزَاءً الْحُسْنَىٰ ۖ وَسَنَقُولُ لَهُ مِنْ أَمْرِنَا يُسْرًا ﴿٨٨﴾

ترجمہ: چنانچہ وہ ایک بلند پروازی مہیا کرنے والی شے کے درپے ہوئے۔ یہاں تک کہ جب وہ سورج کے غروب ہونے والی ایک ایسی جگہ پہونچے جہاں دیکھا کہ مسلسل پھیلتے جارہے دریا کے علاقہ میں سورج غیر معمولی طور پر غروب ہوتا جا رہا ہے۔ اور اس دریا کے آس پاس ایک قوم ملی ۔ ہم نے کہا اے ذوالقرنین (تیرے اختیار میں ہے) تو انہیں سزا بھی دے سکتا ہے یا ان کے ساتھ اچھائی کا معاملہ بھی کرسکتا ہے۔ اس نے کہا کہ جس نے ظلم کیا ہے اسے بلاشبہ ہم سزا دینگے ،اور پھر جب وہ اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا جائیگا تو وہ اسے غیر متصور عذاب دے گا۔ ہاں جس نے ایمان لاکر نیک عمل کئے ہیں تو (رب کے یہاں) اسکے لئے

بہترین بدلہ ہے ہی اور ہم بھی اس کے ساتھ ہماری قدرت و اختیار کے مطابق آسانی کا معاملہ کرینگے۔

عین حمئۃ کے آس پاس بسنے والی قوم

اب سوال یہ ہے کہ مغرب الشّمس یعنی (North polar region) میں واقع عین حمئۃ یعنی دریائے بے ہنگم کنار سے لگے علاقوں میں تو گرین لینڈ، آئس لینڈ، ناروے، سویڈن، فنلینڈ، روس، الاسکا اور کناڈا جیسے کئی ممالک کی سرحدیں شامل ہیں تو کیا ان میں سے کسی ایک ملک کا کوئی ایک شہر یا علاقہ تھا جہاں وہ قوم آباد تھی جس سے ذوالقرنین کی ملاقات ہوئی تھی یا پھر اس دریا کے کنارے واقع ہر ملک میں وہ قوم بود و باش کیا کرتی تھی۔

وَوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا

قَوم: (اسم) الجمع : أقْوام ۔ : الجماعةُ من النَّاس تجمعهم جامعة

يقومون لها۔ قَوْمُ الرَّجُلِ: أَقْرِبَاؤُهُ الَّذِينَ يَجْتَمِعُونَ مَعَهُ فِي جَدٍّ وَاحِدٍ أَوْ سُلاَلَةٍ وَاحِدَةٍ۔ وقوم النبی: من بعث فیھم۔

قوم کا اطلاق لوگوں کے ایسے گروہ پر کیا جاتا ہے جو مخصوص قسم کی اقدار و روایات، خصائل و عادات یا حسب ونسب میں مشترک ہوں۔ چاہے وہ کسی ایک جگہ آباد ہوں یا الگ الگ خطوں میں۔

دوسری طرف ''عند'' سے کنارے کی کوئی ایک جگہ مراد نہیں لی جاسکتی بلکہ عین کی چاروں اور ہر کنارے پر یکساں طور پر اس کا اطلاق کیا جائیگا ۔لہٰذا ذو القرنین نے دریائے بے ہنگم کنار پر جس قوم سے ملاقات کی تھی وہ اس دریا کی چاروں سمتوں میں جا بجا قیام پذیر ہونی چاہیے۔۔۔۔۔اگر یہی بات ہے تو اب سوال یہ ہے کہ وہ قوم آج کہاں ہے ، کیونکہ سخت سردی اور برف کی وجہ سے اس دریائے شمالی کے آس پاس کے علاقے انسانی آبادی سے تقریباً خالی ہیں۔۔۔۔ کیا وہ وہاں سے وہ نقل مکانی کر چکی ہے، یا پھر صفحۂ ہستی سے ناپید ہو چکی ہے۔

آرکٹک سرکل میں آباد اقوام میں ایک قوم ایسی ہے جسے '' اسکیمو'' (Eskimo) یا ''انوئٹ'' (Inuit) کہتے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ یہ قوم منطقۂ باردہ شمالی کے اصل باشندے ہیں ۔آج کل ان کی آبادی تقریباً ۱۷۵۰۰۰ ہے، جو شمالی روس ، الاسکا ، کناڈا اور گرین لینڈ کے شمالی علاقوں میں کم وبیش ۱۰۰۰۰ سالوں سے آباد ہیں۔

انتہائی سرد علاقوں میں رہنے والی اس قوم کا جینیاتی ڈھانچہ اور خون کی

تشکیل دیگر اقوام عالم سے کچھ امتیازی خصوصیات کی حامل ہے۔ لیکن مختلف علاقوں میں رہنے کے باوجود یہ قوم آپس میں تہذیبی اور جسمانی طور پر کم وبیش یکساں خصوصیات کی حامل ہے۔

اس علاقہ میں سبزی اور پیڑ پودے تقریباً نایاب ہیں؛ لہٰذا برفانی ہرن، سفید بھالو جیسے چوپایوں کے علاوہ وہیل، سیل اور دیگر قسم کی مچھلیاں اور دریائی حیات ان کی روزمرہ خوراک کا حصہ ہے۔ ضرورت پڑنے پر یہ لوگ کچے گوشت پر بھی گذارہ کر لیتے ہیں۔ موسم سرماں میں یہ لوگ برف کا مکان بنا کر بھی رہتے ہیں۔

سال کے اکثر اوقات یہ علاقہ برف سے ڈھکا ہونے کی وجہ سے یہاں پہیوں والی گاڑی چلانا انتہائی مشکل ہے؛ لہٰذا وسائل حمل ونقل کے سب سے بڑے ذریعہ کے طور پر سلیڈ ڈوگ کا استعمال کیا جاتا ہے، جس میں پہیے نہیں ہوتے بلکہ کتوں کے ذریعہ انہیں کھینچوایا جاتا ہے۔

کیا یہ ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ اسی قوم کی نسل سے ہوں جن سے ذوالقرنین کی ملاقات ہوئی تھی یا پھر وہ قوم کہیں اور نقل مکانی کر چکی ہے؟ ۔۔۔قصۂ ذوالقرنین کو ''ذکر'' کہنے کا تقاضہ یہ ہے کہ ہمیں صرف اس قوم کا اتہ پتہ ہی نہیں بلکہ اس قوم کے ساتھ کئے گئے سزا وجزا کے معاملہ کے شواہد بھی خارج میں نظر آنے چاہیے!

لیکن اس سوال کے حتمی جواب سے پہلے ہمارے سامنے قرآنی بیان کے

پیش نظر اصل پہیلی یہ ہے کہ جس وقت ذوالقرنین اس علاقہ میں گئے تھے اس وقت وہاں برف کی ایسی ہزاروں کلومیٹر لمبی چوڑی چادروں کا وجود نہیں تھا؛ کیونکہ اس وقت اس دریا کے تیز بہاؤ کے ساتھ اس میں لہروں جیسے کیچڑ کے ٹیلوں کے بنتے جانے کا سلسلہ جاری تھا، اگر موجودہ دور کی طرح وہ علاقہ اس وقت بھی برف سے ڈھکا ہوتا تو نہ دریا تیزی سے بہتا اور نہ اس میں لہروں کی شکل میں کیچڑ کے ٹیلے بنتے ۔۔۔۔نیز اس دریا کے کنارے ہر طرف لوگوں کی بود و باش بھی اس بات کی طالب ہے اس وقت وہاں موجودہ دور کی طرح سخت ٹھنڈا اور برفانی آب و ہوا والا برف والا ماحول نہیں تھا ۔

تو پھر یہ برف کیسے وجود میں آ گئی اور وہاں رہنے والی قوم کہاں چلی گئی ۔۔۔۔اس نہایت اہم سوال کا جواب آگے چل کر، فی الحال خلاصۂ کلام پر ایک نظر پھیر لیتے ہیں۔

الحاصل

ذوالقرنین جس مغرب الشّمس میں تشریف لے گئے تھے اس کی جن جن امتیازی نشانیاں کے ساتھ جو منظر نامہ قرآن نے پیش کیا ہے وہ روئے زمین کے تمام علاقوں میں سے صرف اور صرف منطقۂ باردہ شمالی میں موجود پانی اور اسکے آس پاس کے علاقوں پر ہی چسپاں ہوتا ہے۔

نمبر ایک : جب ذوالقرنین اس جگہ تشریف لے گئے تو اس وقت وہاں غیر معمولی طور پر سورج غروب ہوتا جا رہا تھا۔ چنانچہ قطب شمالی سے نیچے کی طرف

واقع دائرۂ منطقۂ شمالی تک پورا علاقہ ۲۲ یا ۲۳ ستمبر سے شروع ہوکر ۲۱ دسمبر یعنی تین ماہ تک دھیرے دھیرے چوبیسوں گھنٹے مسلسل رہنے والی تاریکی کی لپیٹ میں آتا جاتا ہے۔

نوٹ: یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ عوام الناس میں عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ منطقۂ باردہ شمالی اور منطقۂ باردہ جنوبی کے تمام علاقوں میں مکمل چھ چھ ماہ تک کے مسلسل دن یا رات پائے جاتے ہیں۔ یہ بات درست نہیں، صرف قطبین کے علاقے ہی ایسے ہیں جہاں چھ چھ ماہ تک کے رات یا دن وجود پذیر ہوتے ہیں، جیسے جیسے دائرۂ منطقۂ شمالی اور دائرۂ منطقۂ جنوبی کی جانب بڑھتے چلے جائیں ویسے ویسے مسلسل رہنے والے رات دن کا دورانیہ کم ہوتا جاتا

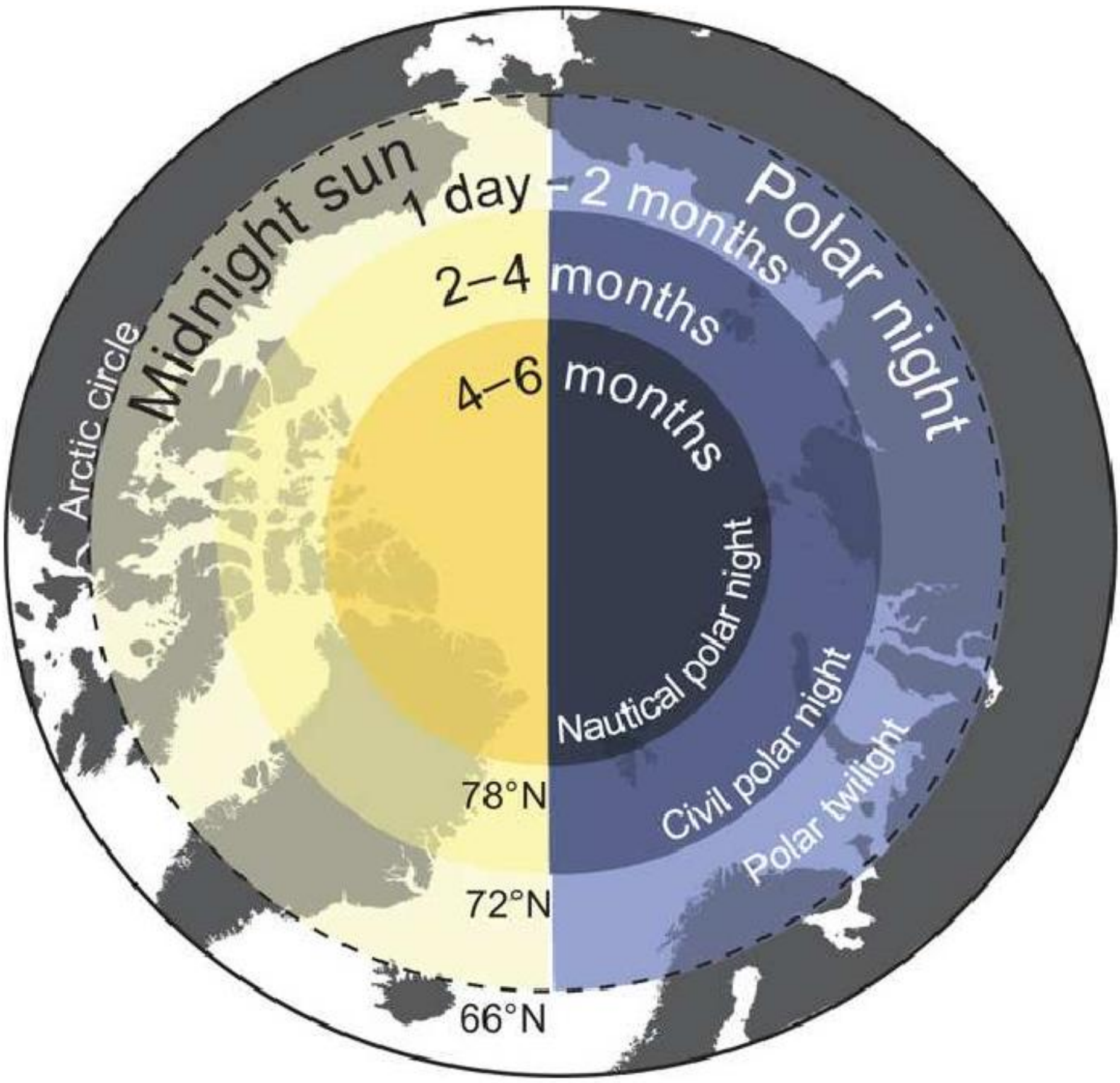

ہے ۔مثلاً ناروے میں واقع لوفوٹن آئسلینڈ (lofotun Island) کو دیکھیں تو وہاں ایک ماہ جبکہ ترومسو (Tromso) شہر میں تقریباً ۲ سے ۳ ماہ تک مسلسل رہنے والی راتیں پائی جاتی ہیں ۔جبکہ رات کا یہ دورانیہ گھٹتے گھٹتے سویڈن کے کیرونا (Kiruna) جیسے شہر میں محض ۲۴ سے ۲۸ گھنٹے تک رہجاتا ہے۔

نمبر دو: قرآن کے بیان کے مطابق منطقۂ شمالی کا یہ پانی بحر الکاہل، بحر اوقیانوس اور بحر ہند کی طرح کوئی سمندر نہیں بلکہ یہ اصلاً میٹھے پانی پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ایک دریا ہے۔ چنانچہ جغرافیائی علم کی بنیاد پر کسی بھی طرح اس پانی پر بحر یعنی سمندر کا اطلاق درست نہیں ہوسکتا۔

نمبر ۳: اس دریا کو قرآن نے ''حمئۃ'' سے متصف کیا ہے، چنانچہ پانی کے بہاؤ کی تیزی کی وجہ سے اس دریا کے کنارے انتہائی غیر متوازن، کٹے پھٹے اور ناہموار ہونے کی وجہ سے آس پاس موجود سمندر اور دریاؤں کا پانی منطقۂ شمالی میں موجود دریا میں گر کر اس کی سطح کو مسلسل اوپر اٹھاتا جارہا تھا۔

نمبر چار: دریا اور سمندر کے پانی کے علاوہ کیچڑ کے مسلسل اس دریا میں شامل ہوتے جانے کے مشاہدہ کی نسبت قرآن نے ''وجد'' کے ذریعہ ذوالقرنین کی جانب کی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ہزاروں سال پہلے ذوالقرنین نے جو دیکھا تھا اس کا آج ویسا کا ویسا ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ اس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ نزول قرآن کے وقت منطقۂ شمالی کی کیفیت اس وقت سے قدرے جداگانہ ہوسکتی ہے جس وقت ذوالقرنین وہاں تشریف لے گئے تھے۔ چنانچہ آج پانی کے

بہاؤ میں وہ تیزی تو نہیں لیکن میٹھے پانی کے ذخیرے، کٹے پھٹے کنارے اور کیچڑ کے ٹیلوں کی شکل میں اس کے شواہد آج بھی موجود ہیں؛ بلکہ بحر الکاہل اور بحر اوقیانوس سمیت بے شمار دریاؤں کا پانی آج بھی اس دریا میں اسی طرح شامل ہوتا جا رہا ہے جیسے اس وقت ہوا کرتا تھا۔

نمبر پانچ: اب ذرا غور فرمائیں کہ کسی جگہ رات دن کے دورانیہ کا اندازہ اس جگہ زمینی یا پانی کی راہ سے جا کر بھی لگایا جا سکتا ہے؛ لیکن ایسا مشاہدہ کہ زمین کے دو مختلف علاقوں میں رات دن کو بیک وقت دیکھتے ہوئے اس بات کا مشاہدہ بھی کرنا کہ کسی مخصوص علاقہ میں رات کا دائرہ روز بروز مسلسل بڑھتا جا رہا ہو، ایک ایسا مشاہدہ کہ دریائے شمالی کی سرحدوں کی نا استواری کے ساتھ اس کے کناروں پر بسی قوم کا معاینہ بھی کیا جا سکے، یقیناً ایسا معاینہ صرف فضا سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ قرآن نے اسی قسم کے فضائی مشاہدہ کا تذکرہ کیا ہے؛ اور یہی وجہ ہے کہ ابتدائی آیات میں ذوالقرنین کو ہر قسم کی بلند پرواز سواری سے نوازنے کا دعوی کیا گیا تھا، چنانچہ ذوالقرنین نے قطب شمالی پر جا کر فضائی مشاہدہ کرتے ہوئے دیکھا کہ ہزاروں مربع کلومیٹر پر مشتمل دریائے بے ہنگم کنار کا علاقہ کس طرح مسلسل رہنے والے اندھیرے کے دائرے میں آتا جا رہا ہے جبکہ زمین کے دوسرے حصوں میں چوبیس گھنٹوں کے دوران رات دن کی آمد و رفت اپنے معمول کے مطابق جاری ہے۔

سمندری راستے بحر شمالی کو پار کرنے والے پہلے شخص کے طور پر

(Fridtjof Nansen) فریجوف نانسن کا نام لیا جاتا ہے، جنہوں نے ۱۸۹۶ میں اس سمندر کو پار کیا تھا۔ جبکہ یو ایس نیوی میں آفسر رہنے والے امریکی سیاح روبرٹ ایڈوین (Robert Edwin Peary) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ۱۹۰۹ میں سب سے پہلے قطب شمالی پر پہونچے تھے۔۔۔۔۔لیکن دلائل وشواہد کے ساتھ پیش کئے گئے ذوالقرنین کے سفرنامہ کے بعد اب اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ اس علاقہ کا پہلا وارد کون ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے اتنا عرض کرتے چلیں کہ ''عربی مبین'' کے اصول و قواعد کی بنیاد پر کی گئی ماقبل کی تشریح کے بعد مخالفین اسلام کا وہ مشہور اعتراض بے بنیاد ہوکر رہجاتا ہے کہ ''اگر قرآن اللہ کا کلام ہوتا تو اس میں یہ بات نہ کہی جاتی کہ سورج کیچڑ والے پانی کے چشمہ میں ڈوبتا ہے''۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آیتوں کے غلط ترجموں کو بنیاد بنا کر قرآن کو انسانی کاوش ثابت کرنے کی کوشش کرنے والے مخالفین اسلام اپنی حق پرستی کا ثبوت دیتے ہوئے اس بات کا اعتراف کرتے ہیں یا نہیں کہ یہ قرآن کسی انسان کے بس کا نہیں بلکہ ایک زبردست علیم وخبیر ہستی کا کلام ہے۔

الحاصل ذوالقرنین کے پہلے مقام سفر ''مغرب الشّمس'' سے مراد ۳۳° ۶۶ عرض بلد شمالی پر واقع دائرۂ منطقۂ باردہ شمالی کے اندر کا سارا علاقہ ہے؛ اس لیے کہ قرآن نے ذوالقرنین کی جس جائے ورود پر غروب شمس کی جس کیفیت کا اطلاق کیا ہے وہ اس دائرے کے اندر موجود سارے علاقہ پر صادق آتی ہے۔

ہاں ایک نہایت اہم سوال ابھی بھی باقی ہے کہ منطقۂ شمالی پر موجود ہزاروں کلومیٹر لمبی چوڑی جو برف ذوالقرنین کی آمد کے وقت موجود نہیں تھی وہ بعد میں کیسے وجود میں آگئی اور اس دریا کے آس پاس گرین لینڈ، آئس لینڈ، ناروے، سویڈن، فنلینڈ، روس، الاسکا اور کناڈا جیسے ممالک میں رہنے والی وہ قوم کہاں چلی گئی اور ان کے ساتھ ذوالقرنین کے جزا وسزا کے وعدہ کا کیا ہوا؟ اس سوال کا جواب ان شاء اللہ تیسرے سفر کے بعد۔

دوسرا سفر: مطلع الشّمس

(South polar region) یعنی منطقۂ قطب جنوبی کے اس علاقے کا سفر جہاں سورج مہینوں تک طلوع یا غروب نہیں ہوتا۔

ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٨٩﴾ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلَىٰ قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَل لَّهُم مِّن دُونِهَا سِتْرًا ﴿٩٠﴾ كَذَٰلِكَ وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿٩١﴾

پھر وہ ایک بلند پروازی مہیا کرنے والی شے کے درپے ہوئے۔ یہاں تک کہ جب وہ سورج کے طلوع ہونے کی ایک ایسی جگہ پہونچے جہاں انہوں نے سورج کو ایک قوم پر اس طرح مسلسل طلوع ہوتے دیکھا کہ ہم نے ان کے مفاد کی خاطر سورج کی طرف پردہ نہیں رکھا تھا۔

یعنی ذوالقرنین جس علاقہ میں گئے تھے وہاں خط استواء اور اس کے آس پاس کے علاقوں کی طرح چوبیس گھنٹوں کے دوران اپنے معمول کے مطابق سورج عموداً یعنی سروں پر سے گذرتا ہوا غروب نہیں ہوتا تھا بلکہ اسکے برخلاف افق ہی افق پر دائیں سے بائیں چکر لگاتا ہوا روز بروز بلند ہوتا نظر آتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں وہاں اس وقت چوبیسوں گھنٹے والے متواتر دن کا زمانہ تھا۔

علماء مؤرخین اور مفسرین نے چونکہ ذوالقرنین کو محض ایک فاتح عالم اور عظیم الشان عادل بادشاہ کے روپ میں دیکھا ہے اس لئے بہت سوں نے آیت کا مطلب بتلاتے ہوئے لکھا ہے کہ

''ذوالقرنین کی دوسری مہم ایران کے مشرق کی طرف تھی، وہ فتوحات کرتا ہوا آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ وہ ایسے مقام پر پہونچ گیا جہاں بالکل غیر متمدن لوگ بستے تھے۔ ''ان کے اور آفتاب کے درمیان آڑ نہیں تھی'' کا مطلب غالباً یہ ہے کہ وہ خانہ بدوش تھے اور تعمیر شدہ مکانات میں رہنے کے بجائے کھلے میدانوں میں زندگی گذارتے تھے۔ (تذکیر القرآن، مولانا وحیدالدین خان)

یعنی وہ ممالک فتح کرتا ہوا مشرق کی جانب ایسے علاقے تک پہونچ گیا جہاں مہذب دنیا کی سرحد ختم ہوگئی تھی اور آگے ایسی وحشی قوموں کا علاقہ تھا جو عمارتیں بنانا تو درکنار خیمے بنانا تک نہیں جانتی تھیں۔ (تفہیم القرآن، مولانا ابوالاعلی مودودی)

اردو و عربی کے تقریباً تمام مفسرین و شارحین قرآن نے مذکورہ آیت کی وہی وضاحت رقم فرمائی ہے جو مذکورہ بالا دونوں حضرات نے پیش کی ہے، تقریباً

سبھی حضرات نے مطلع الشمس کو انتہائے مشرق کے معنی میں لیا ہے، جس طرح مغرب الشّمس کو انتہائے مغرب کے معنی میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح لَمْ نَجْعَلْ لَهُمْ مِنْ دُونِهَا سِتْرًا کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انتہائے مشرق میں پائی جانے والی قوم اتنی غیر متمدن تھی کہ گھر اور خیمے بنانا بھی نہیں جانتی تھی بلکہ کھلے آسمان تلے رہا کرتی تھی۔ حتی کہ بعض حضرات نے تو یہ لکھ دیا کہ وہ کپڑے پہننا بھی نہیں جانتی تھی۔ مشہور شیعہ تفسیر ''قمی'' میں لکھا ہے: لم یعلموا صنعة الثیاب کہ وہ قوم کپڑے بنانا نہیں جانتی تھی۔ جبکہ تفسیر ''عیاشی'' میں لکھا ہے: لم یعلموا صنعة البیوت کہ وہ گھر بنانا نہیں جانتے تھے۔

آیئے اب ان آیات کو لغوی تحلیل کے ذریعہ سمجھتے ہیں۔

وَجَدَهَا تَطْلُعُ : مقام اول میں وضاحت ہو چکی ہے کہ ''وجد'' فعل یقین کے بعد آنے والا جملہ حال اور ذوالحال پر مشتمل ہوتا ہے۔ ''تغرب'' کی طرح یہاں بھی ''تطلع'' فعل مضارع فعل کے جاری ہونے پر دلالت کرتا ہے، چنانچہ ''وَجَدَهَا تَطْلُعُ'' کا معنی ہوگا: اس نے سورج کو مسلسل طلوع ہوتے پایا۔

الغرض آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح خط استوا اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں چوبیس گھنٹوں کے دوران دن رات بدلتے رہتے ہیں، زمین کا

جنوبی نصف کرہ میں مختلف عرض بلد پر سورج کے طلوع کا مختلف نظارہ

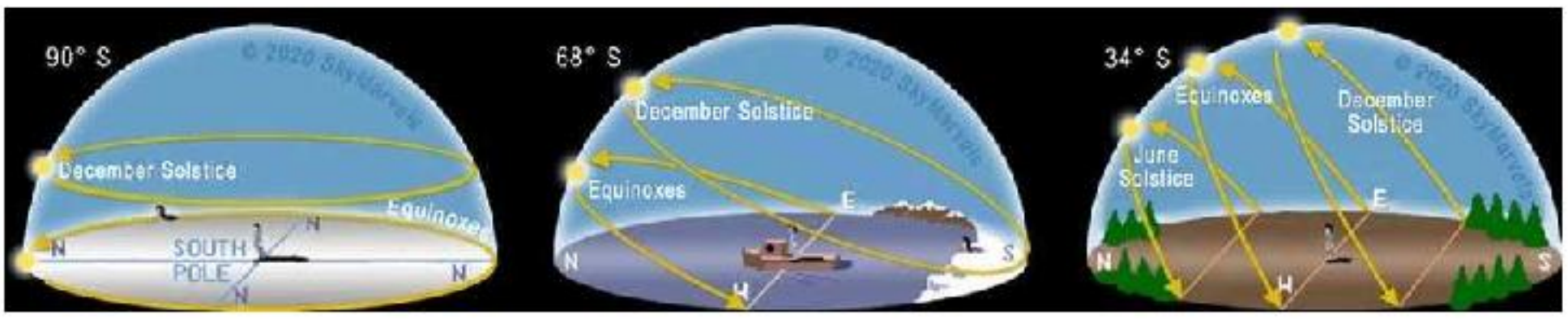

ایک حصہ سورج کے سامنے آتا جاتا ہے ٹھیک اسکے پیچھے والے حصے پر رات ہوتی جاتی ہے ، اس طرح کا دورانیہ اس مطلع الشّمس میں نہیں تھا جہاں ذو القرنین تشریف لے گئے تھے بلکہ جب ذو القرنین وہاں تشریف لے گئے تو ان دنوں وہاں سورج روز بروز افق پر بلند سے بلند تر ہوتا دکھائی دیتا تھا ۔

منطقۂ باردہ جنوبی (South polar region)

اہل علم کے سامنے اب مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی کہ ذوالقرنین جس مطلع الشّمس کے علاقہ میں تشریف لے گئے تھے وہ علاقہ منطقۂ باردہ جنوبی کے علاوہ کوئی نہیں ؛ کیونکہ منطقۂ باردہ شمالی جہاں پہلے تشریف لے گئے تھے اس کے علاوہ یہی وہ علاقہ ہے جہاں سورج کے مسلسل طلوع ہوتے جانے کا ایسا منظر پیش آسکتا ہے جس کا مشاہدہ ذوالقرنین نے کیا تھا، چنانچہ یہاں سال میں ۲ دن سے لیکر چھ ماہ تک کے لمبے دن اور اسی طرح کی غیر معمولی راتیں وجود میں آتی رہتی ہیں۔

مغرب الشّمس کی وضاحت کے دوران ہم یہ بات دیکھ چکے ہیں کہ ذوالقرنین ۲۲ ستمبر کے بعد منطقۂ باردہ شمالی کے علاقہ میں تشریف لے گئے تھے جہاں انہوں نے سورج کو دریائے بے ہنگم کنار میں مسلسل غروب رہتے دیکھا تھا۔ اب ۲۲ ستمبر کے بعد اور ۲۱ دسمبر سے پہلے کا ہی وہ عرصہ تھا جب ذوالقرنین مطلع الشّمس یعنی منطقۂ باردہ جنوبی میں تشریف فرما ہوئے تھے ؛ کیونکہ یہی وہ عرصہ ہے جب سورج قطب جنوبی پر ۲۲ ستمبر کو چمکنے کے بعد دھیرے دھیرے اس کے

سارے اطراف مسلسل رہنے والے اجالے کے دائرے میں آتے جاتے ہیں، حتیٰ کہ ۲۱ دسمبر تک سارا علاقہ مسلسل رہنے والے دن کی روشنی کے دائرے میں آجاتا ہے۔ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلَىٰ قَوْمٍ۔ انہوں نے دیکھا کہ سورج ایک قوم پر مسلسل طلوع ہوتے جارہا ہے۔

منطقۂ باردہ جنوبی کے کوائف

منطقۂ باردہ جنوبی (South Friged Zone) میں واقع جزیرۂ انٹارکٹا ایک کروڑ بیالیس لاکھ مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا اور سب سے زیادہ اوسط بلندی رکھنے والا براعظم ہے۔ یہ دنیا کے سات براعظموں میں پانچویں نمبر آتا ہے، جو سرد ترین، خشک ترین اور سب سے زیادہ تیز ہواؤں والا براعظم ہے۔

اس براعظم کا ۹۸ فی صد علاقہ برف کی موٹی چادر سے ڈھنکا ہوا ہے۔ یہ برف ۱۴ ملین مربع کلومیٹر پر پھیلی ہوئی ہے۔ نیشنل جغرافیہ کی رپورٹ کے مطابق یہ چادر اوسطاً دو کلومیٹر موٹی ہے۔ جبکہ بعض جگہوں پر اسکی موٹائی ساڑھے چار کلو

میٹر تک ناپی گئی ہے۔

روئے زمین پر موجود تازے پانی کا ننانوے فی صد حصہ برف کی شکل میں پایا جاتا ہے، جس کے تقریباً ۶۱ فی صد حصہ پر انٹارکٹکا کی برف مشتمل ہے۔ اگر انٹارکٹا کی یہ برف پگھل جائے تو سطح سمندر ساٹھ میٹر (دوسو فٹ) تک بلند ہو سکتی ہے۔

دنیا کے پانچ سمندر بحر الکاہل، بحر اوقیانوس، بحر ہند، بحر جنوبی اور بحر شمالی میں سے بحر جنوبی براعظم انٹارکٹکا کے ارد گرد گردش کرتا ہے۔ اس سمندر کی بیرونی سرحد کسی بری علاقے سے ملنے کی بجائے بحر الکاہل، بحر اوقیانوس اور بحر ہند سے ملتی ہے۔ اس کا کل رقبہ ۲۰۳۲۷۰۰۰ مربع کلومٹر ہے، رقبہ کے اعتبار سے یہ چوتھے نمبر پر ہے۔ اس کی گہرائی ۴ سے ۵ ہزار میٹر کے درمیان ہے، سب سے زیادہ گہرائی ۷ ہزار ۳۲۵ میٹر ہے۔

بقیہ سمندروں سے بحر جنوبی کو ممتاز کرنے والی ایک بڑی خصوصیت جزیرۂ انٹارکٹا کے گرد مغرب سے مشرق اس کے پانی کا تیزی سے بہاؤ ہے، اس سمندر کا

یہ پانی برفانی تودوں، خطرناک طوفانوں اور بلند و بالا موجوں کی وجہ سے ایک منفرد مقام رکھتا ہے، اسی وجہ سے اسے روفیسٹ واٹر (Roughest Water) یعنی ناہموار اور بڑے اتار و چڑھاؤ والا پانی کہا جاتا ہے۔

براعظم انٹارکٹکا کی قوم

''قوم'' سے مراد جس طرح منطقۂ باردہ شمالی میں واقع ''دریائے بے ہنگم کنار'' کے چاروں اور بسنے والے مشترکہ خصوصیات کے حامل لوگ مراد ہیں اسی طرح مشترکہ خصوصیات کی حامل یہ قوم بھی جزیرۂ انٹارکٹا میں جگہ جگہ بسا کرتی تھی۔

لیکن سوال یہ ہے کہ انٹارکٹکا کا یہ علاقہ تو ہر طرف ہزاروں فٹ موٹی برف کی چادر سے ڈھنکا ہوا اور اس قدر سرد ہے کہ آج بھی مکمل حفاظتی ساز و سامان اور جدید ٹکنالوجی سے آراستہ ہونے کے باوجود وہاں چند دنوں کے لئے بھی رہنا نہایت مشکل ہے، تو بھلا ایسے سرد ترین علاقے میں کوئی کیسے رہ سکتا ہے جہاں

نہ بارش ہوتی ہے اور نہ کھیتی باڑی ؟!

کہیں ایسا تو نہیں کہ جس طرح منطقۂ شمالی میں ذوالقرنین کی آمد کے وقت برف کا وجود نہیں تھا اسی طرح انٹارکٹکا پر بھی اس وقت برف موجود نہیں تھی ؟

آیئے پہلے ہم آیت کے اگلے جملہ ''لَمْ نَجْعَلْ لَهُمْ مِنْ دُونِهَا سِتْرًا'' کو سمجھ لیتے ہیں ۔

تَطْلُع : ''اصحاب کہف'' نامی کتاب میں اس بات کی وضاحت ہو چکی ہے کہ ''طلوع'' صرف افق سے قرص شمس کے نمودار ہونے کا نام نہیں بلکہ افق سے قدرے اوپر اٹھ کر مخصوص بلندی تک پہونچنے پر بھی اسے طلوع شمس ہی کہا جاتا ہے۔

من دونہا : ''من دون'' انقطاع تعلق پر دلالت کرتا ہے۔ یہ انقطاع کس نوعیت کا ہوتا ہے، اس کی تعیین سیاق وسباق سے ہوتی ہے۔ جیسے

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ ------

﴿البقرة ١٦٥﴾

فَاتَّخَذَتْ مِن دُونِهِمْ حِجَابًا فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا

﴿مریم ١٧﴾

وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُونَ وَوَجَدَ مِن دُونِهِمُ امْرَأَتَيْنِ تَذُودَانِ ------ ﴿القصص ٢٣﴾

إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّن دُونِ النِّسَاءِ بَلْ أَنتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ

﴿الأعراف ٨١﴾

ٹھیک اسی طرح ''ستر'' کے ذریعہ سورج سے انقطاع کا مطلب یہ ہوگا کہ حرارت و روشنی کی شکل میں آنے والی اس کی ہر قسم کی تابکاری روک دی جائے ۔۔۔۔تو کیا انٹارکٹکا کی اس قوم اور سورج کے بیچ ''ستر'' یعنی پردہ نہ ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ سورج سے نکلنے والی ہر قسم کی روشنی اور تابکاری اس قوم تک بنا کسی رکاوٹ کے پہونچ جایا کرتی تھی؟

سِتْرًا : قرآن میں ستر کے مشتقات تین جگہ وارد ہوئے ہیں۔

وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُورًا ﴿۴۵ الإسراء﴾

جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپ کے اور ان لوگوں کے درمیان ایک غیر مرئی پردہ حائل کر دیتے ہیں جو آخرت پر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

وَمَا كُنتُمْ تَسْتَتِرُونَ أَن يَشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَا أَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُودُكُمْ وَلَٰكِن ظَنَنتُمْ أَنَّ اللَّهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيرًا مِّمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۲۲ فصلت﴾

تم یہ بات نہیں چھپا سکتے تھے کہ تمہاری سماعت، تمہاری آنکھیں اور تمہاری جلد تمہارے خلاف گواہی دیں؛ لیکن تمہارا خیال تھا کہ جو کچھ تم کیا کرتے ہو، اللہ ان میں سے بہت سی باتوں کو نہیں جانتا۔

اگر قرآن میں وارد ''ستر'' اور '' حجاب'' کے استعمال پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ستر کا تعلق صرف حاسۂ بصر سے ہے جبکہ حجاب کا تعلق حاسۂ بصر کے علاوہ جسمانی رسائی سے بھی ہے۔ یعنی حجاب کے اندر جسمانی اور بصری دونوں طرح

روکنے اور مانع بننے کا معنی پایا جاتا ہے، جبکہ ستر ایسی آڑ پر بولا جاتا ہے جس کا تعلق آنکھ کی رسائی کو روکنے سے ہو۔

وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ ۚ ..... ﴿٥٣ الأحزاب﴾

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ ﴿٥١ الشورى﴾

كَلَّا إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ ﴿١٥ المطففين﴾

حجاب اور ستر کے اس فرق کو ہم آیت ''وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُورًا ﴿٤٥ الإسراء﴾'' میں وارد ''حِجَابًا مَّسْتُورًا'' سے بھی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ ''حِجَابًا مَّسْتُورًا'' کا معنی ہوگا ''غیر مرئی حجاب''۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار کے درمیان ''حجاب'' ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ تک جسمانی یا بصری کسی بھی طرح کی رسائی حاصل نہیں کر سکتے، لیکن ''حِجَابًا مَّسْتُورًا'' یعنی غیر مرئی حجاب کا مطلب یہ ہوگا کہ رسول اللہ اور کفار کے درمیان حجاب تو ہے لیکن اس حجاب کو وہ دیکھ نہیں سکتے۔ گویا وہ رسول اللہ کو دیکھ سن رہے ہیں لیکن پھر بھی ان کا دیکھنا سننا کالعدم ہے۔

الغرض ''ستر'' کا تعلق صرف حاسۂ بصر سے ہونے کی وجہ سے ''ستر'' کے معنی میں سورج کی ہر قسم کی روشنی اور تابکاری کے بجائے صرف مرئی روشنی کو روکنے

کا معنی پایا جاتا ہے۔

یہ ایک سائنسی حقیقت ہے کہ حاسۂ بصر کا کام روشنی پر منحصر ہے، جب روشنی کسی چیز سے ٹکرا کر ہماری آنکھوں میں داخل ہوتی ہے تو وہ چیزیں ہمیں نظر آتی ہیں ۔۔۔۔اور کسی چیز سے مرئی روشنی کو روکنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز ہمیں نظر نہیں آسکتی۔

اب انٹارکٹکا کے علاقہ میں ''ستر'' نہ ہونے کا سادہ الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ سورج سے نکلنے والی ہر قسم کی مرئی روشنی بغیر کسی رکاوٹ کے ان لوگوں تک پہونچ جایا کرتی تھی۔

مرئی روشنی کیا ہے؟

کائنات میں نظر آنے والے بے شمار ستاروں کی طرح نظام شمسی کے مرکز میں واقع سورج بھی ایک ستارہ ہے۔۔۔۔۔دیگر سیاروں اور سیارچوں کی طرح زمین بھی سورج کے گرد گردش کرتی ہے۔۔۔۔۔ یہ نظام شمسی ملکی وے نامی کہکشاں کا ایک حصہ ہے۔۔۔ملکی وے میں ایسے بے شمار سورج موجود ہیں۔

سورج کی سطح بنیادی طور پر ہائیڈروجن اور ہیلیم جیسے عناصر سے بنی ہے۔ اس میں ہائیڈروجن کا تناسب بلحاظ کمیت تقریباً ۷۴ فی صد اور ہیلیم کا تناسب بلحاظ کمیت تقریباً ۲۴ فی صد ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے عناصر جیسے لوہا، نکل، آکسیجن، سیلیکان، سلفر، میگنیشیم، کاربن، نیون، کیلشیم اور کرومیم جیسے عناصر بھی معمولی مقدار میں موجود ہیں۔

سورج پر جوہری عمل (فیوژن ری ایکشن) یا عمل ایتلاف کے نتیجہ میں اسکی سطح کا درجۂ حرارت تقریبا پانچ ہزار پانچ سو دس سینٹی گریڈ تک رہتا ہے۔

اس جوہری عمل یعنی فیوژن ری ایکشن کے نتیجہ میں شعاعوں کی شکل میں انتہائی کثیر مقدار میں توانائی خارج ہوتی ہے۔

سورج سے نکلنے والی اس توانائی کو برقناطیسی اشعاع (electromagnetic radiation) کہا جاتا ہے۔

برقناطیسی اشعاع میں سات شعاعیں پائی جاتی ہیں۔

1.Gamma Rays 2. X-Rays 3. U.V. (Ultra Violet) Rays 4. Visible Rays - comprising: Violet, Indigo, Blue, Green, Yellow, Orange, and Red 5 .I.R.(Infra Red) Rays 6. Microwaves 7. Radiowaves

لیکن جو شعائیں سورج سے نکل کر زمین کی طرف آتی ہیں ان میں کچھ ایسی بھی ہیں جو حیوانوں اور نباتات کے لئے انتہائی نقصاندہ ثابت ہوسکتی ہیں۔ لہٰذا رب العالمین نے زمین کے گرد موجود فضائی غلاف کی مختلف پرتوں کے ذریعہ مختلف قسم کی نقصاندہ شعاعوں کو روکے رکھنے کا انتظام بھی بنا رکھا ہے، چنانچہ ایسی کچھ شعائیں فضا کی مختلف پرتوں میں جذب ہوجاتی ہیں، کچھ منعکس ہوجاتی ہیں تو کچھ کمزور ہوکر ضرورت کے مطابق سطح زمین تک پہونچتی رہتی ہیں ۔

ان میں سے بالائے بنفشی کی ایک قسم (Ultraviolet UVC)، زیرین

سرخ (infrared rays) اور بڑی طول موج رکھنے والی ریڈیو ویو (Long-wavelength radio waves)، ایکس ریز (X-Rays) اور گاما ریز (Gamma Rays) جیسی شعاعوں کو فضائی غلاف میں موجود مختلف پرتیں سطح زمین تک پہونچنے نہیں دیتیں ۔

فضائی غلاف

دراصل زمین ایک کرہ ہے، اس کے اوپر گیسوں کا ایک غلاف ہے جسے فضا یا کرۂ ہوا (atmosphere) بھی کہتے ہیں ۔

موجودہ تحقیقات کی دسترس کے مطابق کہا جاتا ہے کہ فضا کی یہ سرحد تقریباً دس ہزار کلومیٹر کی بلندی پر جا کر ختم ہوجاتی ہے۔

فضا کا یہ غلاف پانچ بڑی اور چند ثانوی حیثیت کی حامل پرتوں میں منقسم ہے۔ پانچ بڑی پرتیں اس طرح ہیں۔

کرۂ متغیرہ (Troposphere): یہ زمین سے متصل کرۂ ہوا کی سب سے نچلی پرت ہے۔ یہ پرت سطح زمین سے شروع ہوتی ہے اور خط استوا سے ۱۷ کلومیٹر جبکہ شمالی وجنوبی قطبین سے تقریباً ۹ کلومیٹر تک بلند ہے۔ موسمی تبدیلیاں، بادل، بارش اور ہوا کا تعلق اسی پرت سے ہے۔

کرۂ قائمہ (Stratosphere): یہ کرۂ ہوا کی دوسری پرت ہے۔ تقریباً ۵۰ کلومیٹر کی بلندی پر اس کی حد ختم ہوتی ہے۔ اوزون نامی پرت اسی کرہ قائمہ میں واقع ہے۔

کرۂ میانی (Mesosphere): یہ کرۂ ہوا کی تیسری اور درمیانی پرت ہے۔ اس کی حد ۸۵ کلومیٹر پر ختم ہوتی ہے۔

کرۂ حراری (Thermosphere): یہ کرۂ ہوا کی چوتھی پرت ہے۔ مختلف پرتوں کے برعکس اس کرہ میں نیچے سے اوپر جاتے ہوئے درجۂ حرارت میں کمی کی بجائے اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اسے کرۂ حراری کہا جاتا ہے۔ اس کی حد سطح ارض سے کم وبیش ۶۵۰ کلومیٹر تک بلند ہے۔

کرۂ روانیہ: کرۂ حراری کے بیچ ہوا کا ایک اور غلاف بھی ہوتا ہے جسے کرۂ روانیہ یا آیونی کرہ کہا جاتا ہے۔ اس کی حد زمین سے ۵۰۰ تا ۱۰۰۰ کلومیٹر تک بلند ہے۔ بین الاقوامی خلائی اسٹیشن اسی کرہ میں واقع ہے۔ اس کے کچھ حصے کرۂ بیرونی کی سرحد سے بھی تجاوز کر جاتے ہیں۔

کرۂ بیرونی (Exosphere): یہ کرۂ ہوا کی آخری پرت ہے۔ اس کی حد تقریباً ۱۰۰۰۰ کلومیٹر پر جا کر ختم ہو جاتی ہے۔

فضائی غلاف میں موجود سورج کی شعاعوں کو روکے رکھنے والی ان

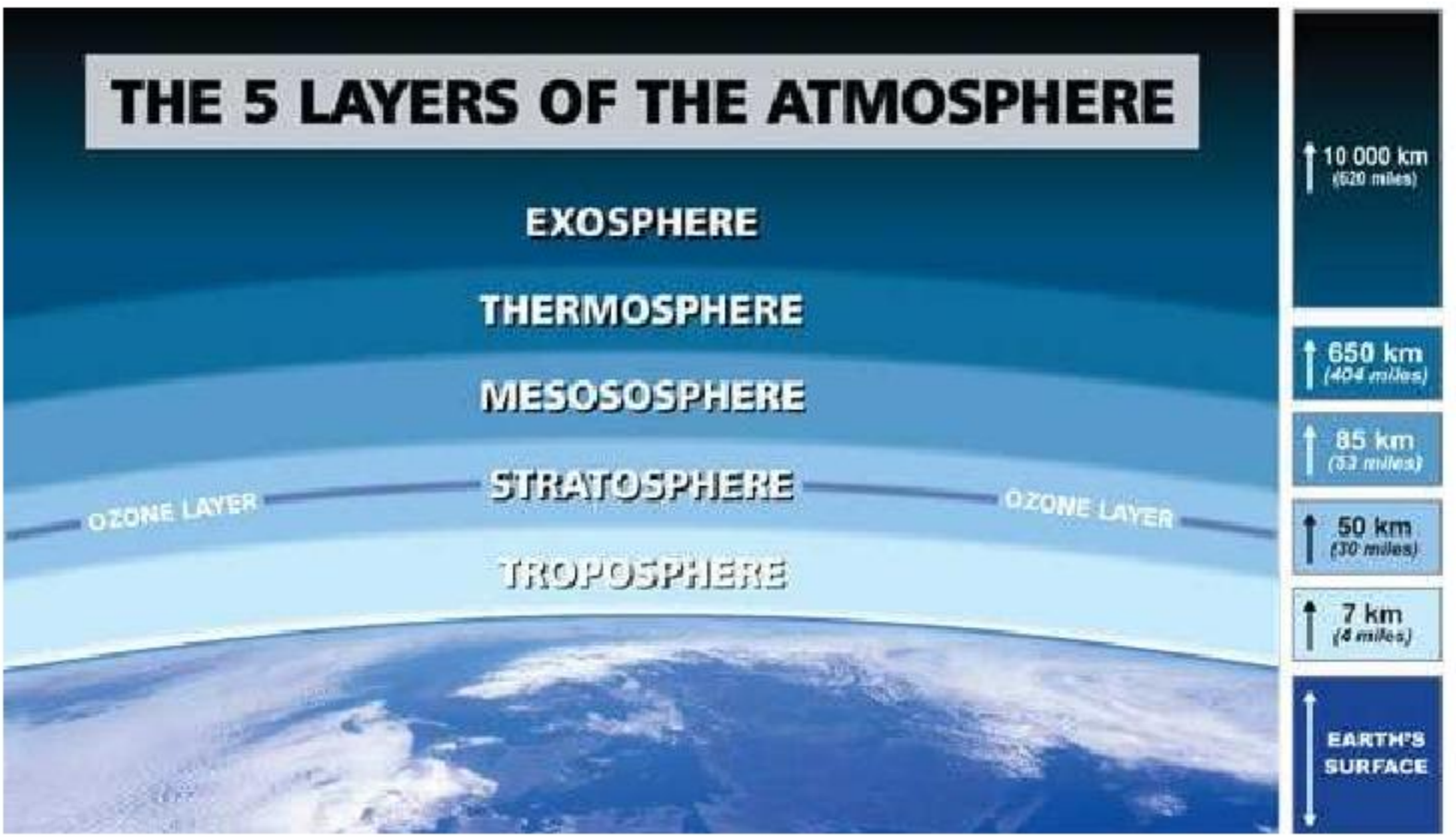

پرتوں کو بھی ''ستر'' کہہ سکتے تھے؛ لیکن ''ستر'' کے لغوی معنی میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ''ستر'' کا اطلاق ایسے مانع پر کیا جائیگا جس کا تعلق مرئی روشنی سے ہو۔

مرئی روشنی

برقناطیسی اشعاع (electromagnetic radiation) میں توانائی کا انحصار مختلف طول موج پر ہوتا ہے۔ طول موج جتنی بڑی ہوگی اتنی توانائی کم ہوگی اور طول موج جتنی کم ہوگی توانائی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ چنانچہ گاما ریز سب سے چھوٹی طول موج والی ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ توانائی کی حامل ہوتی ہے اور ریڈیو ویو جیسی شعاعیں بڑی طول موج والی ہونے کی وجہ سے کم توانائی کی حامل ہوتی ہیں۔

سورج سے آنے والی روشنی اور توانائی زمین پر موجود تمام جاندار اور نباتات کی نمو اور بقا میں جہاں انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہے وہیں ان کے کچھ منفی اثرات بھی ہیں۔

برقناطیسی اشعاع (electromagnetic radiation) میں چوتھے نمبر پر موجود ۴۰۰ سے ۷۰۰ نینومیٹر طول موج رکھنے والی شعاعوں کو انسانی آنکھ دیکھ سکتی ہے، اسی لئے اسے مرئی روشنی (Visible Rays) کہا جاتا ہے۔ ۴۰۰ سے ۷۰۰ نینومیٹر سے کم یا زیادہ طول موج رکھنے والی شعاعیں انسانی آنکھ کی گرفت میں نہیں آسکتیں۔ بالفاظ دیگر انسانی آنکھ جو کچھ دیکھ سکتی ہے وہ انہیں مرئی روشنی کی بدولت ممکن ہے، جب یہ روشنی کسی چیز سے ٹکرا کر انسانی آنکھ میں

داخل ہوتی ہے تو وہ چیز ہمیں نظر آتی ہے۔

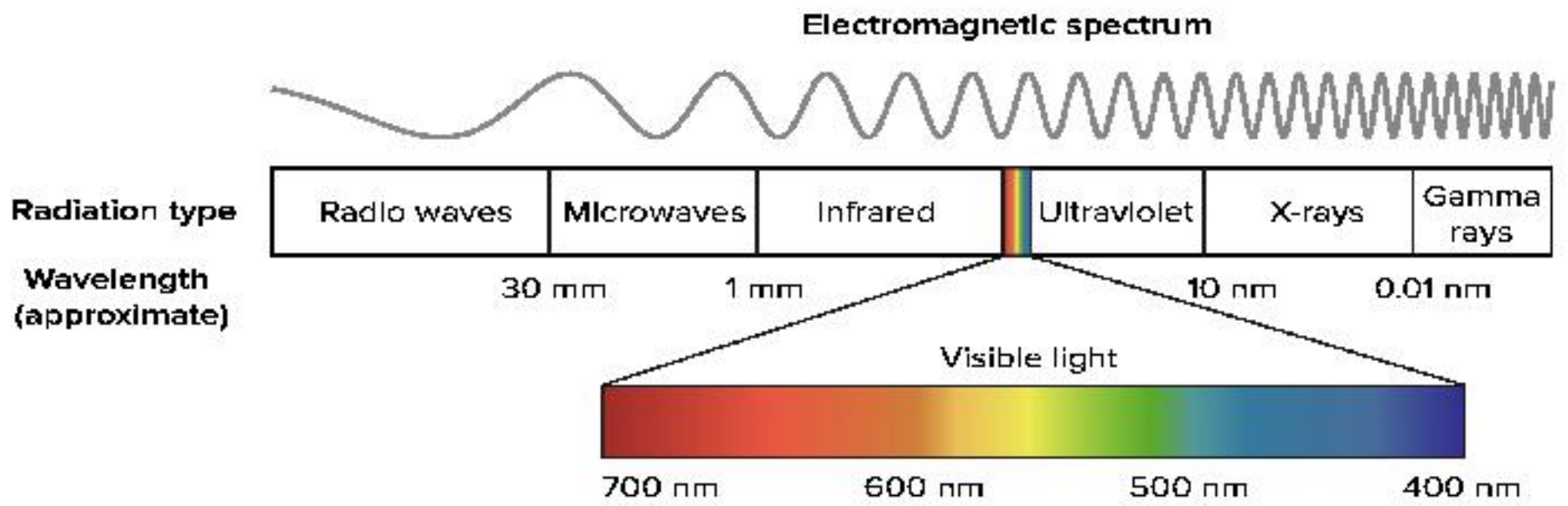

اب جو چیز اس مرئی روشنی کو کسی چیز تک پہونچنے نہ دے اسے ''ستر'' کہا جائیگا، جبکہ جس چیز سے روشنی کو روکا جائے اسے ''مستور'' کہا جائیگا۔ مستور: چھپا ہوا یعنی ایسی چیز جسے انسانی آنکھ دیکھ نہ سکے۔ ''حِجَابًا مَّسْتُورًا'' کا معنی ہوگا'' غیر مرئی حجاب''۔

ایک سوال

اب اگر ''ستر'' کسی ایسی چیز کو کہا جاتا ہے جو مرئی روشنی کو روک دے تو پھر اس میں اس قوم کا امتیاز کیا تھا ؛ کیونکہ ۴۰۰ سے ۷۰۰ نینومیٹر طول موج رکھنے والی یہ مرئی روشنی تو انٹارکٹکا کی طرح زمین کے ہر خطہ پر بغیر کسی رکاوٹ کے پہونچتی رہتی ہے تو اس میں ان لوگوں کے لئے ''ستر'' نہ بننے کا کیا مطلب؟

اس سوال کے جواب سے پہلے ''ستر'' کی لغوی اور صرفی تحقیق پر مزید غور کر لیتے ہیں۔

''ستر'' نکرہ فعل ماضی منفی بلم کے بعد واقع ہونے کی وجہ سے کثرت پر دلالت کرنے کی وجہ سے ''لَمْ نَجْعَلْ لَهُمْ مِنْ دُونِهَا سِتْرًا'' کا معنی کچھ اس

طرح ہونا چاہیے تھا: ہم نے ان لوگوں کے مفاد کے خاطر وہاں سورج کی مرئی روشنی کو روکنے والا کوئی حائل نہیں بنایا تھا۔۔۔یعنی لوگ اور سورج کی مرئی روشنی کے درمیان آڑ بننے والے پردے ایک سے زائد ہو سکتے ہیں، ان میں سے وہاں ایک بھی پردہ نہیں تھا۔۔۔لیکن یہ ترجمہ درست نہیں۔۔۔اس کا صحیح ترجمہ اس طرح ہوگا: ہم نے ان لوگوں کے مفاد میں سورج سے آنے والی کسی بھی قسم کی مرئی روشنی کو روکنے والی چیز نہیں رکھی تھی۔یعنی تعدد و کثرت مرئی روشنی میں ہوگا، مانع بننے والی چیز میں نہیں۔

اگر اول الذکر معنی درست ہوتا تو ''ستر'' کے بجائے ''ساتر'' کا لفظ استعمال کیا جاتا، نیز ''سِتْرًا'' کا لفظ مِنْ دُونِهَا سے پہلے لایا جاتا۔یعنی عبارت اس طرح ہوتی: لَمْ نَجْعَلْ لَهُمْ سِتْرًا مِنْ دُونِهَا ۔ یا لَمْ نَجْعَلْ لَهُمْ ساترا مِنْ دُونِهَا''۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مصدر اسم فاعل کے معنی میں ہوتا ہے۔گویا'' ستر'' ''ساتر'' کے معنی میں ہوگا۔۔۔بلاشبہ یہ بات اصولی طور پر درست ہے؛لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دونوں کے استعمال میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔۔۔چنانچہ زیر بحث مقام میں فاعل کے بجائے ''فِعْل'' کے وزن پر آنے والے مصدر کا استعمال کمال معنی کی طرف توجہ کا طالب ہے۔ مثلاً

وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ﴿۷۶، یوسف﴾

وَفَوْقَ كُلِّ عالم عَلِيمٌ بھی کہا جا سکتا تھا؛لیکن اس میں معنی کی طرف وہ توجہ نہیں

پائی جاتی جو ''ذِی عِلْمٍ'' میں ہے۔

'' فِعْل'' کا وزن کمال معنی کے علاوہ کسی چیز کا ایک چھوٹا سا جزء ہونے پر بھی دلالت کرتا ہے۔ مثلاً

وَيَسْأَلُونَكَ عَن ذِي الْقَرْنَيْنِ ۖ قُلْ سَأَتْلُو عَلَيْكُم مِّنْهُ ذِكْرًا ﴿۸۳ الکھف﴾

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِّنْ عِندِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿۶۵ الکھف﴾

...فَلْيَنظُرْ أَيُّهَا أَزْكَىٰ طَعَامًا فَلْيَأْتِكُم بِرِزْقٍ مِّنْهُ ... ﴿۱۹ الکھف﴾

''ذکراً'' کے ذریعہ ذوالقرنین کی مکمل داستان کے بجائے اس کا ایک مختصر سا حصہ بیان کرنے کی بات کہی جارہی ہے جبکہ کمال معنی پر دلالت کی رو سے اس کا معنی ہوگا کہ'' وہ بات ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم ہوگی کہ سامع کو کامل اطمینان ہوجائے''۔

خضر علیہ السلام کو ''علماً'' کے ذریعہ اپنے بے پایاں علم میں سے تھوڑا سا علم عطا کرنے کی بات کی جارہی ہے لیکن اس علم کی کمال وسعت کا عالم یہ تھا کہ اس سے کسی بھی چیز کا حال دیکھ کر اس کے ماضی اور مستقبل کا ایسا پتہ لگا یا لیا جا سکتا تھا کہ ایک عام انسان کے حواس اس کا سوچ بھی نہیں سکتے۔

اصحاب کہف نے ''برزق'' کے ذریعہ ''ازکی طعاما'' والی مخصوص نوعیت کے کھانے کا اتنا حصہ منگوایا تھا کہ وہ انکی صرف بھوک نہیں بلکہ لمبی مدت تک حالت رقودیت میں رہنے کی وجہ سے لاحق ہونے والی جسمانی کمزوری کو دور کرنے کے

لئے بھی کافی ہو۔

ٹھیک اسی طرح ساتر کی بجائے ''ستر'' استعمال کرنے کا مقصد لفظ کے معنی کی مکمل ادائیگی کی طرف توجہ دلانی ہے۔۔۔۔۔ چنانچہ ستر کا کمال معنی ہوگا: ایسی چیز جو مرئی روشنی کو کسی حال میں گذرنے نہ دے ۔۔۔۔۔ ستر نہ ہونے کا مطلب ہوگا کہ ایسا کوئی حائل اور مانع نہ ہو جو کسی بھی قسم کی مرئی روشنی کو روک سکے۔

''ستر'' کے وزن میں جزئیت کے معنی کا مطلب یہ ہوگا کہ ''مرئی روشنی کو روکے رکھنے والا جو ''ستر'' زمین کے دوسرے حصوں پر موجود ہے اس کا ایک حصہ انٹارکٹکا پر موجود نہیں ۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ مرئی روشنی صرف وہ نہیں جو سائنس دانوں کے ذریعہ بیان کی جاتی ہے بلکہ ۴۰۰ سے ۷۰۰ نینو میٹر کا طول موج رکھنے والی شعاعوں کے علاوہ بھی کوئی ایسی شعاع ہے جسے انسان دیکھ سکتا ہے۔ گویا انٹارکٹکا میں موجود اس وقت کے لوگ دیگر مرئی روشنی کی طرح اس شعاع کو بھی دیکھ سکتے تھے لیکن دنیا کے دیگر حصوں میں ''ستر'' ہونے کی وجہ سے لوگوں تک وہ روشنی نہیں پہونچ پاتی تھی۔

چنانچہ انٹارکٹکا اور زمین کے بقیہ حصوں کی فضا کے درمیان اگر ایسی مابہ الامتیاز کوئی چیز ہے تو وہ ہے ''اوزون کی پرت''۔ اوزون کی یہی تہہ وہ ''ستر'' ہے جو زمین پر ساری جگہ تو موجود ہے لیکن انٹارکٹکا پر موجود نہیں ۔ اور اس ستر کے نہ ہونے کی وجہ سے جو شعاع انٹارکٹکا کی زمین پر پہونچتی ہے وہ ہے Ultra

Violet یعنی بالائے بنفشی شعاع۔

بالائے بنفشی شعاع کو تین درجوں میں منقسم کیا جاتا ہے۔

الٹراوائلیٹ A (لمبی طول موج) UVA ۴۰۰ سے ۳۱۵ نینومیٹر تک

الٹراوائلیٹ B (درمیانی طول موج) UVB ۳۱۵ سے ۲۸۰ نینومیٹر تک

الٹراوائلیٹ C (چھوٹی طول موج) UVC ۲۸۰ سے ۱۰۰ نینومیٹر تک

اوزون کی تہہ (Ozone layer)

زمین کے گرد موجود فضائی غلاف کی مختلف پرتوں میں دوسرے نمبر کی پرت کرۂ قائمہ (Stratosphere) میں گیس کی ایک تہہ ہے جسے اوزون تہہ کہتے ہیں۔ یہ تہہ زمین کی سطح سے تقریباً ۱۹ کلومیٹر سے شروع ہوکر ۴۸ کلومیٹر تک بلند ہے۔

اوزون ایک سہ ایٹمی سالمہ ہے جو آکسیجن کے تین جوہروں (O3) پر مشتمل ہے۔

کرہ ہوائی کی آکسیجن جب سورج سے آتی ہوئی ۱۸۵ نینومیٹر طول موج

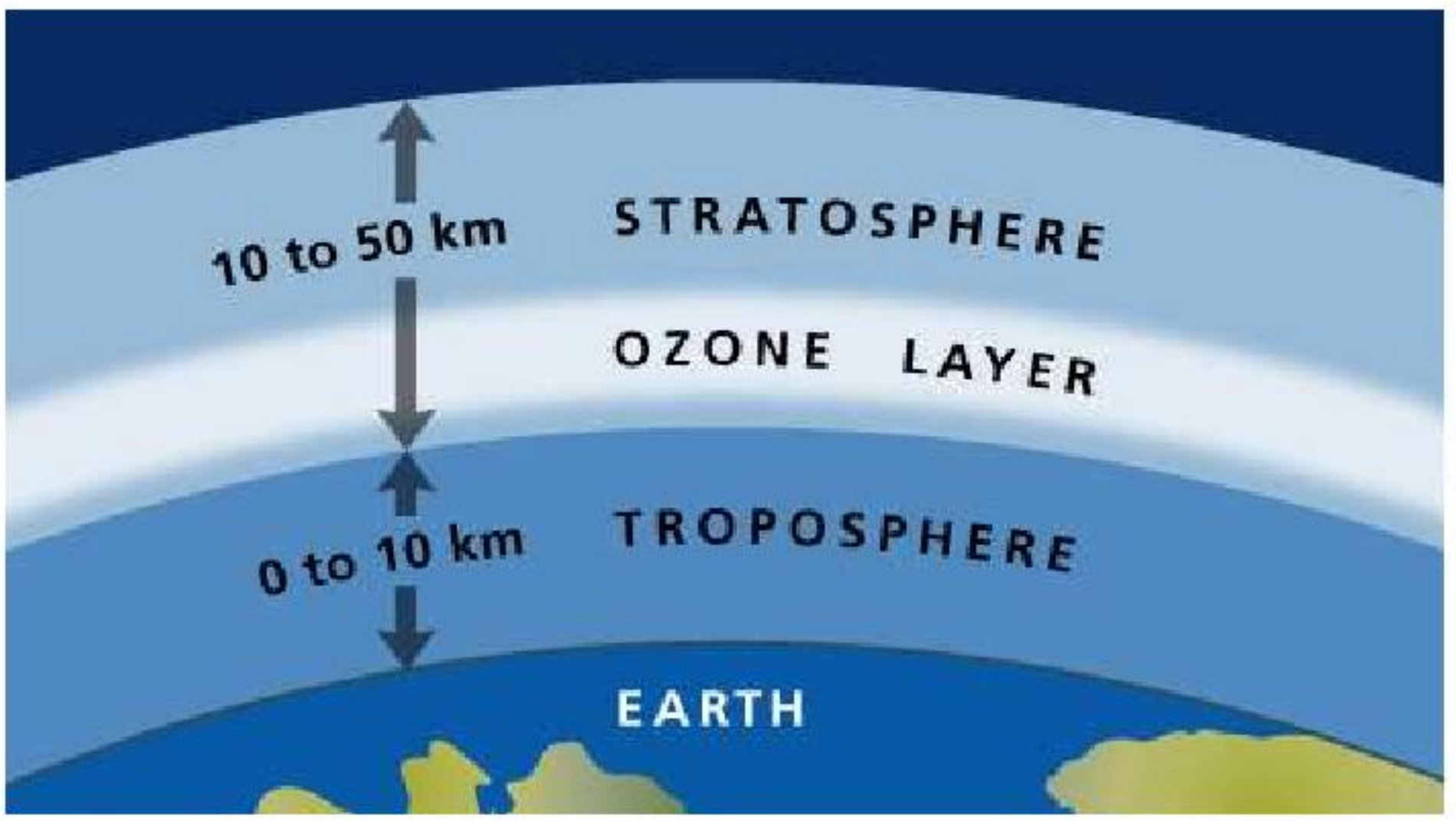

والی الٹراوائلیٹ C جذب کرتی ہے تو اوزون میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ اوزون الٹراوائلیٹ B کو ۹۷ سے ۹۹ فی صد تک جذب کر لیتی ہے جس کی وجہ سے اس نقصاندہ شعاع کی نہایت قلیل مقدار ہی سطح زمین تک پہونچ پاتی ہے۔ البتہ الٹراوائلیٹ A سطح زمین پر ہر جگہ بنا کسی رکاوٹ کے پہونچتی رہتی ہے۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔لیکن انٹارکٹکا پر ''ستر'' یعنی اوزون کی پرت میں شگاف ہونے کی وجہ سے الٹراوائلیٹ اے کی طرح الٹراوائیلیٹ بی بھی بغیر کسی مانع کے پہونچ جایا کرتی ہے۔

نوٹ: یہاں ایک بات ذہن نشیں رہے کہ اوژون نامی پرت میں شگاف یا ہول ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ زمین پر موجود فضائی غلاف میں واقعتاً کوئی ایسا علاقہ ہے جہاں اوژون نامی پرت بالکل معدوم ہو بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس پرت کی کثافت یا بناوٹ ایسی نہیں ہوتی کہ وہ دیگر علاقوں کی طرح اپنا اثر دکھا کر ہر قسم کی الٹراوایولیٹ شعاعوں کو روک سکے۔

ناسا کی ویب سائٹ پر نشان اوزون ہول کی تصویر

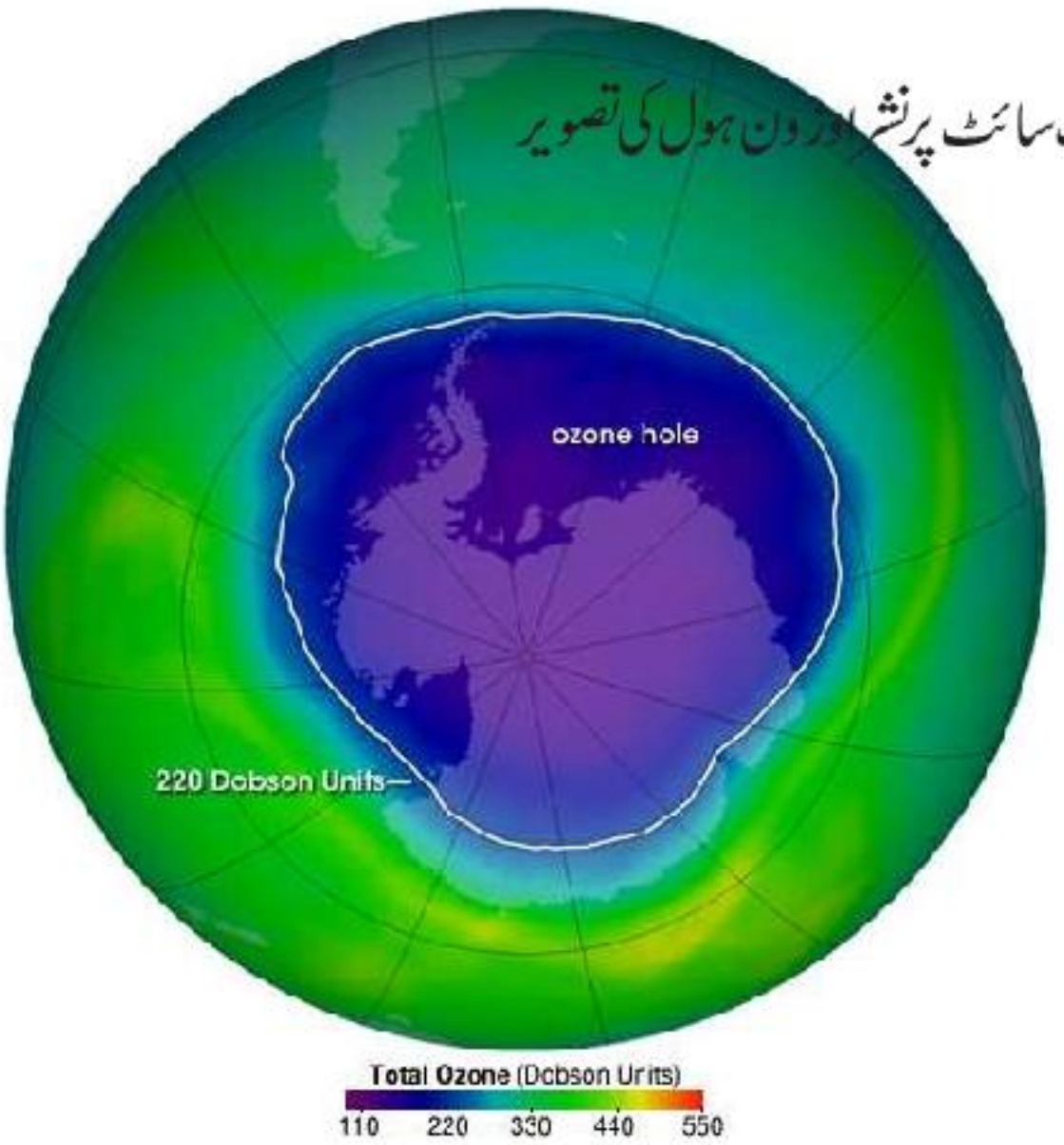

یہی فائدہ ہے ''ساتر'' کے بجائے ''ستر'' استعمال کرنے کا۔ ''ساتر'' کا لفظ فاعل کو بتلاتا ہے، اس کا استعمال تب کیا جاتا جب اوزون کی تہہ اس جگہ بالکل معدوم ہوتی، جبکہ ''ستر'' معنوی خصوصیت کی طرف توجہ دلاتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں مرئی روشنی کو روک سکے ایسی کوئی چیز نہیں تھی، اس بات سے قطع نظر کہ جس علاقہ میں وہ قوم آباد تھی وہاں یا تو سرے سے اوزون کی پرت ہی نہ ہو یا پھر وہاں پرت تو ہو لیکن اس کی کمیت و کثافت اس قسم کی نہ ہو کہ وہ سورج کی کسی بھی مرئی روشنی کو روک سکے۔

وقت نزول بالائے بنفشی

وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلَىٰ قَوْمٍ سے معلوم ہوتا ہے کہ انٹارکٹکا کی زمین پر یہ روشنی ہمیشہ نہیں پہونچا کرتی تھی بلکہ بوقت طلوع یعنی جب وہاں مسلسل رہنے والے دنوں کا آغاز ہوتا تھا تب وہ وہاں آیا کرتی تھی۔ چنانچہ سائنس دانوں کی تحقیق کے مطابق ستمبر اور اکتوبر کے مہینے میں جب انٹارکٹکا پر موسم گرماں کی ابتدا ہوتی ہے اس وقت ہی وہاں الٹراوایولیٹ بی کی تیزی شروع ہوتی ہے۔

کیا بالائے بنفشی مرئی روشنی ہے؟

انٹارکٹکا کے متعلق قرآن کے اس بیان کی وضاحت وتصدیق کے بعد کہ زمین کے دوسرے علاقوں کے برخلاف واقعتاً وہاں پر اوزون کی ایسی پرت نہیں کہ وہ درمیانی طول موج رکھنے والی بالائے بنفشی شعاع (الٹراوائیلیٹ بی) کو روک سکے، لیکن اب بڑا سوال یہ ہے کہ بالائے بنفشی شعاع تو انسانی آنکھ کے لئے

قابل شناخت ہی نہیں تو پھر اسے مرئی روشنی میں کیسے شمار کیا جا سکتا ہے؟

بلاشبہ روشنی اور بصارت سے متعلق لکھی گئی ہر کتاب، رسالے اور جریدے میں یہی بات لکھی اور سکھائی جاتی ہے کہ بالائے بنفشی شعاع کو انسانی آنکھ نہیں دیکھ سکتی ؛ لیکن ۱۲ جولائی ۲۰۱۸ء کو (Plos One) اور ۲۱ اگست ۲۰۱۸ء کو (University Of Georgia) کی ویب سائٹ پر نشر شدہ جارجیا یونیورسٹی کی نئی تحقیق کے مطابق انسانی آنکھ الٹراوایولیٹ شعاعوں کو بھی دیکھ سکتی ہے۔

Ultraviolet light (UV), which ranges from 10 to 400 nanometers, is not detectable to the human eye. Yet, new research from the University of Georgia found that people can see ultraviolet light, and the health implications may be significant.

In a study recently published in PLOS One, co-authors Billy R. Hammond and Lisa Renzi-Hammond show that 100 percent of the participants, all young adults, were able to detect an isolated UV peak at 315 nm.

“Every textbook that is written on vision, optometry, ophthalmology, introduction to psychology, sensation and perception all say the same thing, that

humans cannot see ultraviolet light. We have now shown otherwise," said Renzi-Hammond.

(https://publichealth.uga.edu/uga-study-finds-people-can-see about-consequences-for-eye-health/)

(http://journals.plos.org/plosone/article?id=10.1371/journal.pone.0199940)

ستر نہ ہونے کا مفاد

لَمْ نَجْعَلْ لَهُمْ مِنْ دُونِهَا سِتْرًا ۔ ترجمہ: ہم نے (دیگر لوگوں کے برخلاف) ان لوگوں کے مفاد کی خاطر سورج اور ان لوگوں کے درمیان کسی بھی طرح کی مرئی روشنی کو روکنے والا حائل نہیں بنایا تھا ۔

لَهُمْ: میں لام برائے افادیت ہے۔ یعنی جو مرئی روشنی ان لوگوں تک پہونچا کرتی تھی وہ ان کے مفاد کے خاطر تھی۔ جس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ زمین کے دوسرے لوگوں کے لئے وہ نقصاندہ ہوسکتی ہے۔ چنانچہ سورج کی الٹرا وایولیٹ کرنیں انسان، چرند پرند، نباتات، پیڑ پودے حتی کہ معدنیات کے لئے بھی مختلف قسم کے نقصان اور بیماریاں، ڈی این اے کی خرابی حتی کی انسانی جلد کے کینسر کا سبب بھی بن سکتی ہے۔

كَذَٰلِكَ وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿٩١﴾

یہاں ایک سوال یہ تھا کہ جب اس قسم کی شعاعیں حیوانات و نبات دونوں کے لئے اس قدر نقصاندہ ہیں تو پھر وہ قوم اس کے خطرناک اثرات سے

کیسے بچ سکتی تھی ۔ بھلا انسانی نسل میں کسی ایسی نسل کا وجود بھی ہوسکتا ہے جو اس طرح کی دیگر گوں صلاحیت کی مالک ہو کہ خطرناک شعاعوں کی زد میں رہنے کے باوجود اس کے نقصان سے محفوظ رہ جائے ! بلکہ مزید برآں یہ کہا جارہا ہے کہ یہ شعاعیں اس قوم کے مفاد میں تھیں ! ۔ نیز یہ سوال بھی ہوسکتا تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ساری زمین پر تو شعاعوں کو جذب کرنے والی پرتیں موجود ہوں لیکن کوئی ایک مخصوص علاقہ اس سے مستثنی ہو؟

اس سوال کا جواب قرآن نے كَذَٰلِكَ وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿۹۱﴾ سے دیا ہے کہ ہاں یہ اسی طرح (ہمارے قانون کے مطابق) ہے اور ہاں اس جگہ فی الحال موجود ماحول کے محرکات سے بھی ہم باخبر ہیں۔

بالائے بنفشی کا اثر

یہ بھی ایک سائنسی حقیقت ہے کہ روشنی صرف دیکھنے کے کام نہیں آتی بلکہ حیوانات ونباتات دونوں کی زندگی ، صحت اور خدوخال کی نشوونما میں بھی نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔ چنانچہ الٹراوایولیٹ شعاع مدافعتی نظام کی تقویت کے علاوہ انسانی جلد میں وٹامن ڈی ۳ کی پیدائش کو بڑھا کر ہڈیوں کو مضبوط کرنے کا کام بھی کرتی ہے۔

بقیہ لوگوں کے برخلاف انٹارکٹکا پر رہنے والی اس قوم کے لئے الٹرا وایولیٹ بی شعاعوں کا فائدہ مند ہونا اس بات کا مقتضی ہے کہ اس قوم کا نظام انہضام ، قدوقامت اور خدوخال دنیا کی بقیہ اقوام سے کسی قدر مختلف ہو۔۔۔۔

لیکن سوال یہ ہے کہ انٹارکٹکا پر تو انسانی آبادی کا نام ونشان بھی نہیں ملتا جبکہ اس واقعہ کو ''ذکر'' کہنے کا تقاضا یہ ہے کہ اس قسم کی قوم کا اتہ پتہ ضرور ملنا چاہیے۔

ہاں! قرآن'' كَذَٰلِكَ وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿٩١﴾ '' کے ذریعہ یہی بات کہتا ہے کہ جس وقت ذوالقرنین انٹارکٹکا پر وارد ہوئے تھے اس ماحول سے آج کا زمینی ماحول مختلف ہے۔۔۔۔گویا وہ قوم آج وہاں موجود نہیں۔

لیکن روئے زمین پر بالائے بنفشی شعاعوں کی وجہ پیدا شدہ ایسے واضح فرق والی کوئی قوم اگر تلاشی جائے تو ہمیں ایک ہی قوم میں ایسی خصوصیات نظر آتی ہیں، اور وہ ہے ''افریقہ کی سیاہ فام قوم''۔

تو کیا افریقہ میں بسنے والے سیاہ فام لوگوں کے اجداد پہلے انٹارکٹکا پر بود و باش کیا کرتے تھے۔ اگر ہاں تو وہ کونسے حالت تھے جس کی وجہ سے وہاں بسنے والی سیاہ فام قوم نقل مکانی کرتے ہوئے افریقہ کی سرزمین پر آوارد ہوئی۔۔۔۔۔ انتہائی دلچسپ اور اہم سوال کا جواب ان شاء اللہ تیسرے سفر کے بعد۔

كَذَٰلِكَ وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿٩١﴾

مفسرین نے كَذَٰلِكَ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جس طرح مغرب الشّمس کے لوگوں کو وعظ ونصیحت کرتے ہوئے ذوالقرنین نے کہا تھا کہ جن لوگوں نے ایمان لاکر نیک عمل انجام دئے ہیں ان کے ساتھ ہم بھی اچھائی کا برتاؤ کرینگے اور آخرت میں بھی انہیں بہترین بدلہ دیا جائیگا؛ لیکن جو کافر ہیں، انہیں ہم بھی سزا دینگے اور آخرت میں بھی سخت عذاب کا سامنا کرنا ہوگا، ٹھیک اسی طرح مطلع الشّمس

کی قوم سے خطاب کرتے ہوئے انہیں بھی وعظ ونصیحت کرتے ہوئے خبردار کیا تھا۔

لیکن کَذٰلِكَ کی یہ وضاحت درست نہیں۔۔۔۔قرآن جب کسی واقعہ اور جملہ کے اختتام کے بعد کَذٰلِكَ کومفرد استعمال کرتا ہے تو وہ درحقیقت مذکورہ عبارت میں کہی گئی بات کومؤکد کرتا ہے یا ماقبل کی عبارت سے قاری کے ذہن میں پیدا ہونے والے کسی تذبذب کو یہ کہہ کر دور کرتا ہے کہ اسے تعجب خیز اور غیر معمولی نہ سمجھا جائے بلکہ یہ قانون خداوندی اور سنت اللہ کے مطابق ہی ہے۔ جیسے

كَذَٰلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا بَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿۵۹﴾

كَذَٰلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ ﴿۲۸ الدخان﴾

كَذَٰلِكَ وَزَوَّجْنَاهُم بِحُورٍ عِينٍ ﴿۵۴ الدخان﴾

ثُمَّ نُنَجِّي رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا ۚ كَذَٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنجِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۰۳ یونس﴾

اسی طرح اس مقام پر کَذٰلِكَ کا مطلب ہوگا کہ مرئی روشنی کو روکنے والی پرت کا عدم وجود اس قوم کے حق میں ہونا، سنت اللہ کے برخلاف نہ سمجھا جائے بلکہ جس طرح دنیا کے دیگر حصوں میں حیوانات اور نباتات کی اپنی اپنی ضرورتوں کے مطابق مخصوص قسم کا ماحول، آب وہوا اور ہر چیز فراہم کی گئی ہے اسی طرح رب العٰلمین نے انٹارکٹکا پر بسنے والی اس قوم کے لئے بھی ان کی ضرورت کے مطابق ہی ایسی فضا تشکیل دی تھی جو سورج کی شعاعوں کو روک نہ سکے؛ لہٰذا اسے کوئی غیر

معمولی امر نہ سمجھا جائے بلکہ یہ بھی 'كَذٰلِكَ' یعنی اسی طرح معمول کے مطابق واقعہ ہی ہے جیسا کہ دنیا میں دوسری جگہوں پر سب کچھ کیا جا رہا ہے۔

كَذٰلِكَ: اس کا ترجمہ ہم ''قانون خداوندی کے مطابق'' بھی کر سکتے ہیں۔یعنی جس طرح رب العالمین نے جس پروگرام اور قوانین کے تحت دنیا کو رواں دواں رکھا ہے، اسی طرح کے قوانین کے مطابق ہی یہاں وہ مخلوق آباد تھی۔

كَذَٰلِكَ وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿۹۱﴾

ہاں یہ قانون خداوندی کے مطابق ہی ہے اور اس جگہ (ان کے بعد) اب موجود ماحول کے محرکات سے بھی ہم اچھی طرح باخبر ہیں۔

أَحَطْنَا:

أحاط الحائط: دیوار بنانا۔ أحاط القوم بالبلد: شہر کا گھیرا ڈالنا۔ أحاط بالأمر: کسی بات کا پورا علم رکھنا۔

خُبْرًا: خَبُرَ الأَمْرَ: عَرَفَهُ عَلَى حَقِيقَتِهِ، جَرَّبَهُ بات کی تہہ تک پہونچ گیا۔

خَبَرَ الحياةَ: عَلِمها وعرَف حقيقتَها عن تجربة زندگی کی حقیقت سمجھ گیا۔

خُبْرًا:

الخُبْرُ: اسم ہے۔کسی واقعہ یا مظہر کے پیچھے عامل ومحرک کے علم کو خبر کہتے ہیں۔

خَبَرَتْهُ التَّجَارِبُ خَبْرًا وخُبْرَةً و خِبْرَةً: عَلَّمَتْهُ تجربوں نے حقائق سے آگاہ کر دیا۔یعنی ان عوامل ومحرکات سے آگاہ کر دیا جو زندگی کے اتار و چڑھاؤ کے پیچھے کارفرما ہیں۔

الخُبْرُ : قرآن میں دو مقام پر آیا ہے، ایک قصۂ موسیٰ وخضر علیہما السلام میں اور دوسرا زیر بحث آیت میں۔

وَ كَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿۶۸﴾ الکھف

كَذٰلِكَ وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿۹۱﴾ الکھف

جب موسی علیہ السلام نے خضر علیہ السلام سے درخواست کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں آپ کے ساتھ رہکر رہنمائی کی کچھ وہ باتیں سیکھنا چاہتا ہوں جو تمہیں عطا کی گئی ہیں تو خضر علیہ السلام نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا: قَالَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۶۷﴾ وَ كَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿۶۸﴾ الکھف

کہ آپ میرے ساتھ ہرگز صبر سے نہیں رہ پائینگے۔ بھلا آپ کسی ایسی بات پر کیسے ضبط کر سکتے ہیں جس کی تہہ یعنی محرک کو سمجھنا آپ کے دائرۂ ادراک میں نہیں۔

یعنی میرے تمام کاموں کے پیچھے کچھ وجوہات اور محرکات کارفرما ہوتے ہیں؛ لیکن آپ ان محرکات اور عوامل کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے؛ لہٰذا آپ میرے ان کاموں کو دیکھ کر انہیں برداشت نہیں کر پائینگے۔

اللہ تعالیٰ نے خضر علیہ السلام کو ادراک واحساس کی ایسی اضافی صلاحیت سے نوازا تھا کہ جس کے ذریعہ وہ حال دیکھ کر ماضی اور مستقبل سے وابستہ ایسی دنیا اور مظاہر کو بھی محسوس کر لیتے تھے جن کا ایک عام انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ اسی صلاحیت کی بنا پر وہ مستقبل سدھارنے کی غرض سے ایسے کام کر لیتے تھے جو بظاہر

عام انسان کے لئے غلط ہوتے تھے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی معیت میں پیش آئے جو تین واقعات قرآن نے بیان کئے ہیں ان میں ایک کشتی کو نقصان پہونچانے کا واقعہ ہے، دوسرا ایک بچہ کو قتل کر دینے کا ہے اور تیسرا گرتی دیوار کو تعمیر کرنے کا ہے۔

کشتی کو عیب دار بنانے کے پیچھے، بچے کو قتل کرنے کے پیچھے اور دیوار بنانے کے پیچھے کچھ محرکات تھے، ان محرکات وعوامل کے علم کو ''خبر'' کہا گیا ہے۔ الغرض ''خبر'' سے مراد ہر اس محرک کا علم ہے جو کسی مظہر کے پیچھے کارفرما ہو۔

كَذَٰلِكَ وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿۹۱﴾ ہاں وہ قانون خداوندی کے مطابق ہی ہے اور (اس قوم کے بعد) اب اس جگہ موجود چیز کی تہہ یعنی محرک سے بھی ہم اچھی طرح باخبر ہیں۔

کیا مطلب ہے اس کا؟

ماقبل آیت ''لَمْ نَجْعَل لَّهُم مِّن دُونِهَا سِتْرًا'' سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ ذوالقرنین جب انٹارکٹکا پر تشریف لے گئے اس وقت کی فضا جس نوعیت پر تشکیل دی گئی تھی وہ وہاں بسنے والی قوم کے مفاد کی خاطر تھی۔۔۔۔۔۔ چنانچہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ بالائے بنفشی جیسی شعاعیں تو ڈی این اے کو نقصان پہنچا کر کینسر تک کا سبب بن سکتی ہے تو بھلا یہ اس قوم کے مفاد میں کیسے ہو سکتا ہے۔ ''كَذَٰلِكَ'' کے ذریعہ یہی بات سمجھائی گئی ہے کہ اسے غیر معمولی نہ سمجھا جائے بلکہ یہ سب قوانین ربوبیت اور سنت اللہ کے مطابق ہی تھا۔

اس کے بعد وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿۹۱﴾ سے یہ کہا جارہا ہے کہ موجودہ وقت میں وہاں جو کچھ ہے اس کے پیچھے کے محرک سے بھی ہم اچھی طرح باخبر ہیں۔

گویا ذوالقرنین کی آمد کے وقت انٹارکٹکا کی آب وہوا اور فضا کا جو ماحول تھا ویسا اب نہیں ہے، بلکہ بہت کچھ بدلا ہوا ہے اور جس وجہ سے یہ تبدیلی آئی ہے اس کے محرک سے بھی ہم اچھی طرح واقف ہیں۔

''لَدَيْهِ''

مفسرین نے ''ہ'' ضمیر کا مرجع ذوالقرنین کو قرار دیتے ہوئے ترجمہ کیا ہے کہ ''ہم ذوالقرنین کے پاس جو ساز وسامان تھا اس سے باخبر ہیں۔ لیکن ''ہ'' ضمیر کا مرجع ذوالقرنین کو ماننا درست نہیں بلکہ اس کا مرجع مطلع الشّمس ہے؛ کیونکہ ''لدی'' موجود اور حال پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی نزول قرآن کے وقت انٹارکٹکا کی صورت حال کے متعلق کہا جارہا ہے کہ آج کا زمینی ماحول اس ماحول سے مختلف ہے جو ذوالقرنین کی وہاں آمد کے وقت تھا اور ہم اس کے پیچھے کے محرک سے بھی واقف ہیں۔

آیت نمبر ۹۰ میں فضائی اور زمینی دو قسم کے مشاہدہ کی بات ہے؛ اب مابعد آیت نمبر ۹۱ میں وارد ''لَدَيْهِ'' کے ذریعہ ایک اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ آج انٹارکٹکا پر جو تغیر ہوا ہے وہ زمینی سطح کا ہے فضائی نہیں، چنانچہ حیران کن بات ہے کہ اوزون کی پرت آج بھی اسی طرح وہاں موجود نہیں جیسا کہ ذوالقرنین

کی آمد کے وقت نہیں تھی۔

الغرض ذوالقرنین کی آمد کے وقت جس انٹارکٹکا پر لوگ بسا کرتے تھے، (ظاہر سی بات ہے کہ اس وقت ندی، دریا، پیڑ پودے، درخت، چرند و پرند اور جانور وغیرہ سب کچھ ہوگا) وہ انٹارکٹکا آج ہزاروں کلومیٹر لمبی چوڑی برف کی تہہ میں ڈھنکا ہوا ہے۔ نا قابل رہائش بنا دینے والی ماحول کی اس تبدیلی کے پیچھے کسی ناگزیر محرک کو بتلاتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

كَذَٰلِكَ وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿٩١﴾ ہاں یہ قانون خداوندی کے مطابق ہی ہے اور اس جگہ (ان کے بعد) موجود زمینی ماحول کے محرک سے بھی ہم اچھی طرح باخبر ہیں۔

الغرض زمینی سطح پر برف وغیرہ کی شکل میں ہوئی اس تبدیلی کے متعلق کہا جارہا ہے کہ اس کے محرک سے بھی ہم اچھی طرح باخبر ہیں۔

برف کی چادر کے نیچے دریافت شدہ ۴۰۰ کے قریب تالاب، جھیلیں اور بہتے دریا کے علاوہ سائنس دانوں کی یہ کھوج (کہ قطب جنوبی پر اوزون نامی پرت میں بہت بڑا شگاف ہے جس سے بالائے بنفشی کی خطرناک شعاعیں زمین تک پہونچتی رہتی ہے) قرآن کے اس دعوے کی تصدیق کے لئے کافی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ماضی میں مخصوص صلاحیت کی حامل ایک قوم وہاں بسا کرتی تھی اور اس قوم کے لئے وہاں سورج کی ہر قسم کی مرئی روشنی بلا کسی رکاوٹ کے پہونچ جایا کرتی تھیں۔

براعظم انٹارکٹکا

یہ براعظم سرد ترین اور خشک ترین آب و ہوا کا حامل ہونے کی وجہ سے یہاں انسانوں کی کوئی باقاعدہ اور مستقل آبادی نہیں ۔ البتہ یہاں مختلف ممالک نے سائنسی تحقیقات کے لئے ریسرچ سینٹر قائم کئے ہوئے ہیں جن میں سال کے مختلف اوقات میں تقریباً ۲۰۰۰ سے ۵۰۰۰ تک سائنسداں تحقیقی کاموں میں لگے رہتے ہیں۔

یہاں خورد بینی جراثیم کی کئی اقسام دریافت کی گئی ہیں ؛ لیکن سخت قسم کی ٹھنڈی آب و ہوا اور ہر طرف برف ہی برف ہونے کی وجہ سے بڑے حیوانوں میں پینگوین، بعض قسم کے سمندری پرندے اور سیل، وہیل جیسے سمندری جانداروں کے علاوہ دوسرا کوئی چوپایہ یہاں نہیں پایا جاتا۔

سائنسدانوں کے لئے جزیرۂ انٹارکٹکا ایک پراسرار علاقے سے کم نہیں ، حیاتیات کے عام اصول سے ہٹ کر دو دو تین تین کلومیٹر برف کی موٹی تہہ کے نیچے ملنے والی حیاتیات اور نباتات نے سائنس دانوں کو حیرانی میں مبتلا کر رکھا ہے ۔ برف کی موٹی چادر کے نیچے کئی کئی کلومیٹر لمبے چوڑے ۴۰۰ سے زائد تالاب کی موجودگی ، بلند و بالا پہاڑوں کا سلسلہ اور اسی طرح ایسے بہت سارے انکشافات آئے دن سامنے آتے جارہے ہیں جن کا سائنس دانوں کے پاس ابھی تک کوئی تسلی بخش جواب نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ تقریباً ۱۰۰ ملین سال پہلے جزیرۂ انٹارکٹکا پر برف موجود

نہیں تھی ، اس وقت وہاں بھی اسی طرح کی زندگی کی چہل پہل پائی جاتی تھی جس طرح دنیا کے دیگر حصوں کا حال ہے؛ لیکن ۳۴ ملین سال پہلے اچانک آب وہوا میں تبدیلی رونما ہوئی اور کئی لاکھ سالوں کے دوران براعظم انٹارکٹکا پر سیکڑوں میٹر موٹی اور ہزاروں کلومیٹر لمبی چوڑی برف کی تہہ جمتی چلی گئی۔

الغرض جزیرۂ انٹارکٹکا پر موجود برف ، برف کے اندر اور برف کے نیچے کیا ہے یا جو کچھ دریافت ہوا ہے ان کی قابل قبول توجیہ کرنے سے سائنس داں فی الحال قاصر نظر آرہے ہیں۔

کیا انٹارکٹکا پر بسنے والی وہ قوم غیر مکلف تھی؟

قرآن کے بیان سے یہ بات واضح ہے کہ مطلع الشّمس یعنی جزیرۂ انٹارکٹکا پر جس قوم سے ذوالقرنین کی ملاقات ہوئی تھی ، وہ قوم آج وہاں موجود نہیں۔

لیکن ایک سوال یہ ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ قرآن نے جن تین قوموں سے ذوالقرنین کی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے ان میں سے مغرب الشّمس میں واقع دریائے شمالی کے آس پاس بسنے والی اور بین السدین رہنے والی قوم سے گفتگو کا تو تذکرہ کیا ہے؛ لیکن مطلع الشّمس والی قوم کے بارے میں وہ بالکل خاموش ہے؟ حتیٰ کہ ان کی شرعی حیثیت کے بارے میں بھی کوئی ذکر نہیں چھیڑا ۔ اسکی وجہ کیا ہے؟

ایسا نہیں ہے بلکہ مقام ثالث میں بین السدین قوم کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن نے ''من دونھما'' کا لفظ استعمال کیا ہے، جس سے انٹارکٹکا پر بسنے والی قوم کا مکلف ہونا معلوم ہوتا ہے۔ یعنی ذوالقرنین نے جزا وسزا کا جو معاملہ مغرب

الشّمس والی قوم کے ساتھ کیا تھا وہی معاملہ مطلع الشّمس والی قوم سے بھی کیا تھا۔

خلاصۂ کلام

ذوالقرنین کا دوسرا سفر مطلع الشّمس یعنی زمین کے ایک ایسے علاقے میں ہوا تھا جہاں دن کا دورانیہ غیر معمولی یعنی چوبیسوں گھنٹوں مسلسل رہنے والے دن پر مشتمل ہوتا تھا۔

مطلع الشّمس سے مراد دائرۂ منطقۂ باردہ جنوبی کے اندر کا سارا علاقہ ہے؛ اس لیے کہ قرآن نے ذوالقرنین کی جس جائے ورود پر طلوع شمس کی جس کیفیت کا اطلاق کیا ہے وہ اس دائرے کے اندر موجود سارے علاقہ پر صادق آتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس بات کا مقتضی یہ بھی ہے کہ زمین گول ہے اور اپنے مدار پہ مخصوص زاویہ سے جھک کر حرکت کرتی ہے؛ کیونکہ زمین کو گول اور مخصوص زاویہ پر جھک کر متحرک مانے بغیر یہ تصور قائم ہی نہیں ہوسکتا کہ زمین کے کسی حصہ پر چوبیس گھنٹوں کے درمیان رات دن کی آمد ورفت بھی ہو اور دوسری طرف مسلسل چوبیس گھنٹوں کے رات اور دن بھی پائے جاتے ہوں!۔

اگر زمین کو گول نہ مانا جائے تو قرآن کا یہ کہنا درست نہ ہوتا کہ سورج کی یہ مرئی روشنیاں ان پر اس وقت گرتی تھیں جب سورج طلوع یعنی افق سے مخصوص بلندی پر ہوتا تھا۔

دائرۂ منطقۂ جنوبی میں واقع براعظم انٹارکٹکا پر مخصوص صلاحیت کی حامل ایک قوم رہا کرتی تھی جو آج وہاں موجود نہیں۔

یہاں کی فضا میں ''ستر'' یعنی اوزون کی تہہ نہ ہونے کی وجہ سے دیگر مرئی روشنی کے ساتھ بالائے بنفشی کی بی قسم بھی مسلسل پہونچتی رہتی تھی۔

مرئی روشنی صرف وہ نہیں جس کا طول موج ۴۰۰ سے ۷۰۰ کے درمیان ہے بلکہ بالائے بنفشی شعاع بھی مرئی روشنی کے زمرے میں آتی ہے۔

الٹراوایولیٹ شعاع کا کسی قوم کے مفاد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انٹارکٹکا پر بسنے والی وہ قوم عام لوگوں کی بنسبت قدرے مختلف نظام انہضام اور الگ خدوخال کی حامل تھی۔

دلائل وشواہد کے پیش نظر اس بات کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں کہ افریقہ کے سیاہ فام لوگ اسی قوم کے افراد ہیں جو کبھی انٹارکٹکا میں بسا کرتی تھی۔

انٹارکٹکا کی فضائی حالت یعنی اوزون کی پرت کا نہ ہونا اپنی اسی صورت حال پر موجود ہے جو ذوالقرنین کی آمد کے وقت تھی لیکن وہاں کی زمینی حالت اس قدر بدل چکی ہے کہ وہاں انسان بود و باش اختیار نہیں کرسکتا۔ چنانچہ یہ علاقہ آج ہزاروں کلومیٹر لمبی چوڑی برف کی چادروں سے ڈھنکا ہوا ہے اور اسی وجہ سے وہاں بسنے والی قوم آج وہاں موجود نہیں۔

زمینی ماحول کی یہ تبدیلی کسی بڑے محرک کی بنا پر تھی۔۔۔۔۔ان شاء اللہ اگلے صفحات میں ہم یہ بھی دیکھینگے کہ وہ کونسا محرک تھا جس کی بنا پر وہاں لوگوں کی بود و باش کے بجائے ہر طرف برف ہی برف ہے۔

ستر کا مطلب یہ بھی ہے کہ سورج سے زمین کی طرف آنے والی مرئی روشنی

مختلف مختلف قسم کی ہوتی ہیں جنہیں مختلف فضائی پرتوں کے ذریعہ روکا جاسکتا ہے۔

''لہم'' میں لام برائے افادیت ہونے کی وجہ سے جہاں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ الٹراوایولیٹ بی کی یہ شعاعیں سیاہ فام قوم کے مفاد میں تھیں وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بقیہ دنیا کے لئے اوزون کی یہ پرت حفاظتی تہہ کا کام دے رہی ہے۔

چنانچہ جدید تحقیقات کے مطابق الٹراوایولیٹ بی انسان سمیت جاندار، حشرات الارض، پیڑ پودے اور معدنیات تک کو نقصان پہونچا سکتی ہے۔ اوزون کی تہہ میں تخفیف کی وجہ سے انسانی زندگی پر ہونے والے منفی اثرات میں جلدی کینسر، موتیا میں اضافہ، قوت مدافعت میں کمی، جسمانی نشوونما کے عمل میں بے قاعدگی اور جنیاتی امراض میں اضافہ شامل ہے۔

جبکہ عام انسانوں کے برخلاف بالائے بنفشی شعاعوں کے بداثرات سے محفوظ رہنا حتی کہ ہزاروں سال بتنے کے باوجود سیاہ فام قوم میں قوت مدافعت کی زیادتی، نظام انہضام کا اختلاف، ہڈیوں کی مضبوطی اور جلد میں میلانن کی کثرت اس بات کے گواہ ہیں کہ بالائے بنفشی شعاعیں کس طرح ان لوگوں کے لئے فائدہ مند تھیں۔

اوزون کی جس پرت کو قرآن بقیہ دنیا کے لئے حفاظتی تہہ کہہ رہا ہے اس کی دریافت ۱۹۱۳ء میں فرانسیسی طبیعیات دان چارلس فیبری اور ہنری بوسن نے کی تھی

۔جبکہ انٹارکٹکا کی فضا میں موجود اوزون ہول کی خبر ۱۹۸۵ء میں سب سے پہلے سائنسی جریدے نیچر میں نشر ہوئی تھی۔

۱۹۷۰ء کی دہائی میں سائنس دانوں نے اس خطرے کی نشاندہی کی تھی کہ انسانوں کے بنائے گئے مختلف مرکبات اور زہریلی گیسیں اوزون کی اس تہہ کو نقصان پہنچا رہی ہیں۔چنانچہ بالائے بنفشی شعاعوں کے خطرات سے بچنے کے لئے ۱۹۸۷ء میں ویانا کنونشن کے بین الاقوامی معاہدے کے تحت وضع کئے گئے ''مونٹریال پروٹوکول'' کے ذریعہ بہت سے ایسے صنعتی مرکبات پر پابندی لگائی گئی جن سے خارج ہونے والی گیسیں اوزون کی تہہ کو متاثر کرتی ہیں۔۔۔۔۔۔ سائنس دانوں کا اندازہ ہے کہ اگر پابندیوں پر اسی طرح عمل ہوتا رہا تو اس صدی کے اواخر تک اوزون کی تخفیف ۱۹۶۰ والی سطح پر بحال ہوجائیگی۔۔۔۔لیکن یاد رہے کہ انٹارکٹکا میں موجود اوزون ہول کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑیگا چونکہ یہ نامعلوم تاریخ سے اسی طرح چلا آرہا ہے۔

براعظم انٹارکٹکا دنیا کے (roughest water) یعنی شدید اتار و چڑھاؤ والے پانی سے گھرا ہونے کی وجہ سے دور جدید کی ٹکنالوجی سے آراستہ جہازوں کے باوجود آج بھی اس جیسے ٹھاٹھیں مارتے پانی کو پار کرنے میں کافی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔معلوم تاریخ کے مطابق یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ جزیرۂ انٹارکٹکا کو پہلی بار روسی جہاز راں میخائل لیزاریف اور فابیان گوٹلیب وون نے ۱۸۲۰ء میں دیکھا تھا۔جبکہ ایک امریکی سیاح جان ڈیویس وہ شخص ہے جس نے

۱۸۲۱ء میں انٹارکٹکا پر سب سے پہلے اپنے قدم رکھے تھے۔ دوسری جانب قطب جنوبی کی کھوج لگانے والے سب سے پہلے شخص کے طور پر نارویجین سیاح رولڈ ایمنڈسن کا نام آتا ہے۔۔۔۔۔لیکن قرآن مین بیان کردہ ذوالقرنین کی روداد سننے کے بعد اب آپ ہی بتائیں کہ منطقۂ باردہ جنوبی کا پہلا مسافر کون ہے!

ایسے کئی سوالوں کو ذہن میں رکھ کر قرآن کی اس آیت کو سمجھیے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ ''ہم نے ذوالقرنین کو ہر قسم کی بلند پرواز سواری اور وسائل حمل ونقل عطا کئے تھے''۔

لیکن ذوالقرنین کا کمال صرف یہ نہیں کہ ہزاروں سال پہلے وہ انٹارکٹا کے ایسے دور افتادہ علاقہ میں پہونچ چکے تھے بلکہ وہ ایسی صلاحیت اور ٹکنالوجی کے حامل بھی تھے کہ جس کی بنیاد پر فضا کا معائنہ کرتے ہوئے انہوں نے یہ بھی پتہ لگالیا تھا کہ الٹراوایولیٹ جیسی شعاعیں جو زمین کے دیگر علاقوں میں اوزون کی پرت کی وجہ سے نہیں پہونچ پاتیں وہ یہاں بلاکسی رکاوٹ کے پہونچ جاتی ہیں۔

اصل داستاں ابھی باقی ہے۔۔۔۔

انٹارکٹکا کے سفر سے متعلق یہ آیات ذوالقرنین کے اس مشاہدہ کی صرف خبر نہیں دے رہی جو انہوں نے منطقۂ جنوبی کے سفر کے دوران کیا تھا بلکہ قرآن کی یہ آیات براعظم انٹارکٹکا اور اس پر بسنے والی قوم کے ماضی، حال اور مستقبل کے متعلق ایسا بہت کچھ بیان کر رہی ہیں جس کو سمجھنے کے لئے سائنس داں رات دن ایک کرتے نظر آرہے ہیں۔

اس روداد کا ایک انتہائی اہم سوال کہ اگر سیاہ فام قوم کا اصل مسکن انٹارکٹکا ہے تو وہ وہاں سے نقل مکانی کرتے ہوئے افریقہ کیسے پہونچی؟ اس نقل مکانی کی وجہ کیا تھی؟ اور براعظم انٹارکٹکا کا جو علاقہ ذوالقرنین کی آمد کے وقت برف سے خالی تھا وہاں اس قدر حیران کن برف کی چادریں کیسے وجود میں آگئیں۔

سفر ثالث : بین السدین یعنی جنوبی امریکہ

سد ذوالقرنین کی حقیقت کیا ہے۔ ذوالقرنین نے سد بنائی تھی یا ردم۔ وہ کہاں پر واقع ہے؟ یاجوج وماجوج کون ہیں، وہ انسان ہیں یا کوئی دیگر مخلوق؟ زمینی مخلوق ہے یا خلائی، اس وقت وہ کہاں ہیں، کب اور کہاں سے نکلیں گے۔

ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۹۲﴾ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِن دُونِهِمَا قَوْمًا لَّا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا ﴿۹۳﴾ قَالُوا يَا ذَا الْقَرْنَيْنِ إِنَّ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلَىٰ أَن تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿۹۴﴾

دور جدید وقدیم کے تقریباً سبھی مفسرین اور مترجمین نے مذکورہ آیت کا جو ترجمہ بیان کیا ہے وہ کچھ اس طرح ہے۔

ترجمہ: اور جب وہ دو پہاڑوں کے درمیان پہونچا تو انکے پاس اس نے ایک قوم کو

پایا جو کوئی بات سمجھ نہیں پاتی تھی ، انہوں نے کہا کہ اے ذوالقرنین یاجوج اور ماجوج ہمارے ملک میں فساد پھیلاتے ہیں تو کیا ہم تم کو کوئی محصول مقرر کردیں کہ تم ہمارے اوران کے درمیان کوئی روک بنادو۔ ذوالقرنین نے جواب دیا کہ جو کچھ میرے رب نے مجھے دیا ہے وہ بہت ہے، تم محنت سے میری مدد کرو، میں تمہارے اوران کے درمیان ایک دیوار بنادونگا۔

زمانہ قدیم سے لیکر آج تک کے تقریباً تمام مفسرین ومترجمین مذکورہ ذیل چند باتوں پر متفق نظر آتے ہیں۔

۱۔ذوالقرنین کا تیسرا سفر دو پہاڑوں کے درمیان تھا۔

۲۔ان دو پہاڑوں کے پاس ایک قوم سے ملاقات ہوئی ، وہ قوم کوئی بات سمجھ نہیں پاتی تھی ،یعنی ان سے بات کرنے میں ذوالقرنین کو بڑی دقت پیش آتی تھی کیونکہ وہ بالکل پس ماندہ یا جنگلی قسم کی قوم تھی ۔ چنانچہ ذوالقرنین نے اس قوم سے کسی ترجمان کے ذریعہ بات کی۔

۳۔اس قوم نے محصول کے بدلے یاجوج وماجوج اوران کے درمیان کوئی روک بنادینے کا مطالبہ کیا تو ذوالقرنین نے کہا کہ میرے پاس خدا کا دیا بہت ہے، مجھے تمہارے محصول یا معاوضہ کی ضرورت نہیں ،بس تم لوگ صرف افرادی طاقت سے میرا تعاون کرو۔

۳۔اس قوم کے مطالبہ پر ذوالقرنین نے دونوں پہاڑوں کے درمیان لوہے کی چادریں پاٹ کر اسے لکڑی اور کوئلہ سے دہکایا، حتی کہ جب وہ آگ کی طرح لال

بن گیا تو اس پر پگھلا تانبہ ڈالکر ایک مضبوط دیوار بنادی۔

۴۔ یاجوج و ماجوج اس دیوار کو توڑتے پھوڑتے اور چاٹتے رہتے ہیں تا کہ وہ وہاں سے نکل سکیں؛ لیکن اسے توڑ کر نکلنے میں کامیابی نہیں مل رہی، حتی کہ قیامت کے قریب جب اللہ چاہیگا تو وہ اس دیوار کو توڑ کر مکڑی کی طرح زمین پر پھیل جائینگے، تباہی و بربادی کی آندھی بن کر ہر چیز کو روندتے ہوئے بیت المقدس کے پہاڑ تک پہونچ جائینگے۔

۵۔ متأخرین میں سے بعض نے سدین کے متعلق اضافہ کرتے ہوئے لکھا کہ ان سے مراد بحر خزر اور بحر اسود کے درمیان واقع ''کاکیشیا'' کا وہ پہاڑی درہ ہے جو آزربیجان اور آرمینیا کی سرحد پر واقع ہے اور جسے کوہ قفقاز کہا جاتا ہے۔

۶۔ اسی طرح تاریخی طور پر یہ بھی نقل کیا جاتا ہے کہ خلیفہ واثق باللہ نے اپنے زمانہ میں ایک لشکر محمد ابن موسیٰ خوارزمی کی قیادت میں اس دیوار کی تلاش کے لئے روانہ کیا تھا جو دو سال کی تلاش کے بعد اسے پالینے میں کامیاب ہو کر واپس آیا، اس کی اطلاع کے مطابق یہ دیوار لوہے اور تانبے سے بنی ہے، اس میں نہایت مضبوط عظیم الشان دروازہ بھی ہے، جس پر منوں وزنی تالے بھی پڑے ہوئے ہیں۔

۷۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یاجوج و ماجوج کا ملک قطب شمالی کی سمت ایک ایسے مقام پر ہے جہاں دو بہت اونچے پہاڑ ہیں، دوسرے پہاڑوں کی طرح ان پر چڑھنے کا کوئی راستہ نہیں اور دونوں پہاڑ سمندر کے کنارے پر ہیں، صرف جنوب کی طرف تھوڑا سا راستہ ہے وہاں ذوالقرنین نے اللہ کے حکم سے لوہے کی

بہت بڑی دیوار بنادی ہے، یہ دیوار ۶۰ گز چوڑی اور پہاڑوں کے برابر بلند ہے، یاجوج وماجوج ان پہاڑوں اور آہنی دیوار کے اندر محصور ہیں۔

لیکن مذکورہ باتوں میں کس قدر صداقت ہے، نیز ان آیات کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ ایسے سوالات کو بالدلائل سمجھنے سے پہلے ترجمہ پر نظر فرمائیں۔

یہاں تک کہ جب (ذوالقرنین) ان دونوں بندشوں کے درمیان پہونچے تو انہیں مذکورہ دونوں قوموں سے مختلف ایک ایسی قوم ملی جو کوئی بھی کائناتی روش کو سمجھ نہیں سکتی تھی۔ انہوں نے کہا کہ اے ذوالقرنین یاجوج اور ماجوج زمین میں بگاڑ پیدا کرتے رہتے ہیں، تو کیا ہم تمہارے لئے زمینی پیداوار کا ایک حصہ مقرر کر دیں اس شرط پر کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی روک بنادیں۔ ذوالقرنین نے کہا کہ میرے پروردگار نے جن چیزوں میں مجھے قدرت بخشی ہے، اس میں بہت کچھ بہتر ہے، تو تم لوگ صرف محنت وطاقت سے میرا تعاون کرو، میں تمہارے اور ان کے درمیان ردم (یعنی دوطرفہ روک) بنادیتا ہوں۔

السَّدَّيْنِ

اب اجزاء آیت کی تحلیل پر غور کرتے ہیں۔

حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِن دُونِهِمَا قَوْمًا لَّا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا

﴿۹۳﴾

السدین: سد کا تثنیہ ہے۔ سد یسد سدا باب سمع سے۔

سد الاناء: برتن ڈھانپنا۔ سد الثلمۃ: سوراخ یا شگاف بند کرنا۔ سد الباب:

دروازہ بند کرنا۔سد الطریق: راستہ روکنا، سد القناۃ: نہر وغیرہ پر ڈیم بنانا۔

السد و السد بفتح السین و ضمھا جمع سدود و اسداد : دو چیزوں کے درمیان آڑ، پہاڑ، پشتہ، بند۔

الغرض سد کا معنی ہوتا ہے، برتن، راستہ، سوراخ اور منفذ کو بند کرنا۔ کسی کے لئے مانع بننا (چاہے یہ مانع بننا آمد و رفت سے متعلق ہو، چاہے دخول و خروج سے یا پھر آر پار دیکھنے سے)۔

سد سکندری، سد ذوالقرنین اور دیوار یاجوج ماجوج جیسے الفاظ اتنی کثرت سے بولے گئے ہیں کہ لفظ سد بولتے ہی ہمارے ذہنوں میں صرف دیوار کا تصور ہی ابھر کر سامنے آتا ہے، حالانکہ جس طرح لفظ سماء ہر اوپر والی چیز کے لئے بولا جاتا ہے اسی طرح لفظ سد کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جو کسی چیز کو اس طرح ڈھانپ دے یا اسکے آڑے آجائے کہ وہ دوسری طرف جا نہ سکے یا دیکھ نہ سکے۔ الغرض سد کے مفہوم میں صرف دیوار کا معنی نہیں پایا جاتا بلکہ ڈھانپ کر مانع بن جانے یا ڈھانپ کر محفوظ کر دینے کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے: سد الباب، سد الاناء، سد الطریق۔

''السدین'' سے مراد کیا ہے؟

''السَّدَّیْن'' کی لغوی تحقیق کے بعد یہاں ایک اہم سوال یہ ہے کہ ''السَّدَّیْن'' معرف باللام کیوں ہے؟

اگر السَّدَّیْن سے مراد دو پہاڑ لیے جائیں تو سوال یہ ہوتا ہے کہ جب ما قبل

میں پہاڑ کا کوئی تذکرہ نہیں تو پھر اسے معرفہ لانے کی وجہ کیا ہے؟۔۔۔۔ السدین کو نہ اسم جنس مانا جاسکتا ہے، نہ الف لام زائدہ ہوسکتا ہے، الف لام عہد خارجی بھی نہیں مان سکتے کیونکہ ماقبل میں پہاڑ کا کوئی تذکرہ نہیں، عہد ذہنی یا حضوری بھی نہیں ہے کیونکہ مخاطب اسے جانتا نہیں، تو پھر یہ اسم معرف باللام کیوں ہے؟۔۔۔۔۔کیا قرآن نے خواہ مخواہ ہی سدین کو معرف باللام بنا دیا ہے یا نحویوں کا استقراء غلط ہے یا پھر مفسرین سے کہیں چک ہو رہی ہے!

سیاق کلام واضح طور پر یہ بات ماننے کے لئے مجبور کرتا ہے کہ سدین کا کسی نہ کسی طرح ماقبل میں تذکرہ ضرور ہونا چاہیے! کیونکہ اس کے ذریعہ مقام ثالث کی ٹھیک اسی طرح تعیین کی جارہی ہے جس طرح مغرب الشّمس اور مطلع الشّمس کی تعیین کی گئی تھی۔

ماقبل میں ''مغرب الشّمس'' اور ''مطلع الشّمس'' دو مقام کا تذکرہ ہوا ہے، کیا یہ ہوسکتا ہے کہ وجع الظاہر موضع المضمر کے قاعدے کے مطابق ان دو مقاموں کو کسی ایسی صفت کی بنا پر ''سدین'' سے تعبیر کیا گیا ہو جس میں ''سد'' کا معنی پایا جاتا ہو؟

ہاں دونوں مقام پر اگر کوئی ایسی چیز پائی جاتی ہے جس پر ''سد'' کا معنی چسپاں کیا جاسکتا ہے تو ایسی واحد چیز ہے ہزاروں کلومیٹر لمبی چوڑی برف کی تہہ۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جب ذوالقرنین ان دونوں علاقوں میں وارد ہوئے تھے اس وقت تو یہ دونوں علاقے اس قسم کی برف سے خالی تھے تو پھر برف کی ان

چادروں کو ''سدین'' سمجھتے ہوئے انہیں معرف باللام کیسے لایا جا سکتا ہے؟

ہاں ہاں برف کی یہ دو چادریں ہی ''سدین'' ہیں، لیکن یہ ''وضع الظاہر موضع المضمر'' کے قبیل سے ہونے کی وجہ سے معرف باللام نہیں بلکہ اس لئے معرف باللام ہے کہ ماسبق میں ان کا ذکر ہوا ہے۔ ارے جناب کیسے!

ہاں ان کا ذکر ہوا ہے اور صرف ان کا ذکر ہی نہیں بلکہ زمینی سائنس کے سب سے بڑے معموں میں سے ایک سمجھی جانے والی برف کی یہ چادریں کیوں بنی ہیں یا بنائی گئی ہیں، بلکہ کس نے بنائی ہیں، اس کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ ہے نا انتہائی حیران کن دعوی!

ایسی تمام تفصیلات آگے چل کر ابھی صرف یہ مانتے ہوئے آگے چلتے ہیں کہ ''سدین'' سے مراد ان دو منطقوں پر موجود برف کی یہ دو چادریں ہی ہیں۔

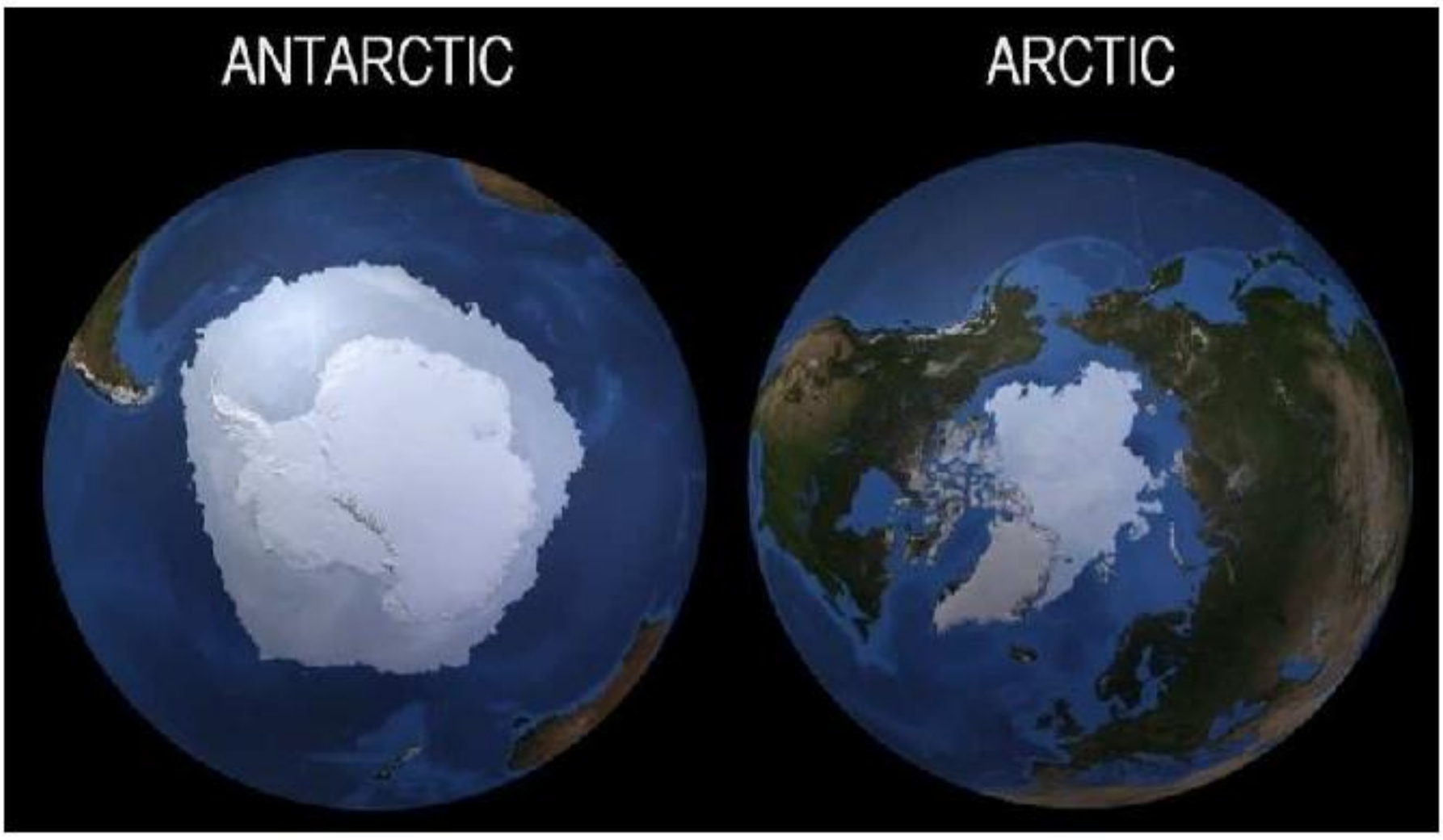

''موضع بین السدین'' یعنی مقام ثالث کہاں ہے؟

حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِن دُونِهِمَا قَوْمًا لَّا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا ﴿۹۳﴾

ترجمہ: یہاں تک کہ جب وہ ان دونوں بندش کے درمیان پہونچا تو اسے مذکورہ دونوں قوموں سے مختلف ایک ایسی قوم ملی جو (تذکیر سے متعلق) کوئی بات سمجھنے کو تیار نہیں تھی۔

''سدین'' سے قطبی برف مراد لینے کی صورت میں ''بین السدین'' سے مراد وہ علاقہ ہوگا جو خط استواء کے آس پاس واقع ہے۔۔۔۔ خط استواء انڈونیشیا، مالدیپ، کیری باتی کے جزائر اور افریقہ اور جنوبی امریکہ جیسے ممالک سے ہوکر گذرتا ہے۔۔۔۔تو کیا ان ممالک اور جزائر میں بسنے والے تمام لوگ اس قوم میں شامل ہیں جنہیں ''بین السدین'' رہنے والی قوم کہا گیا ہے۔

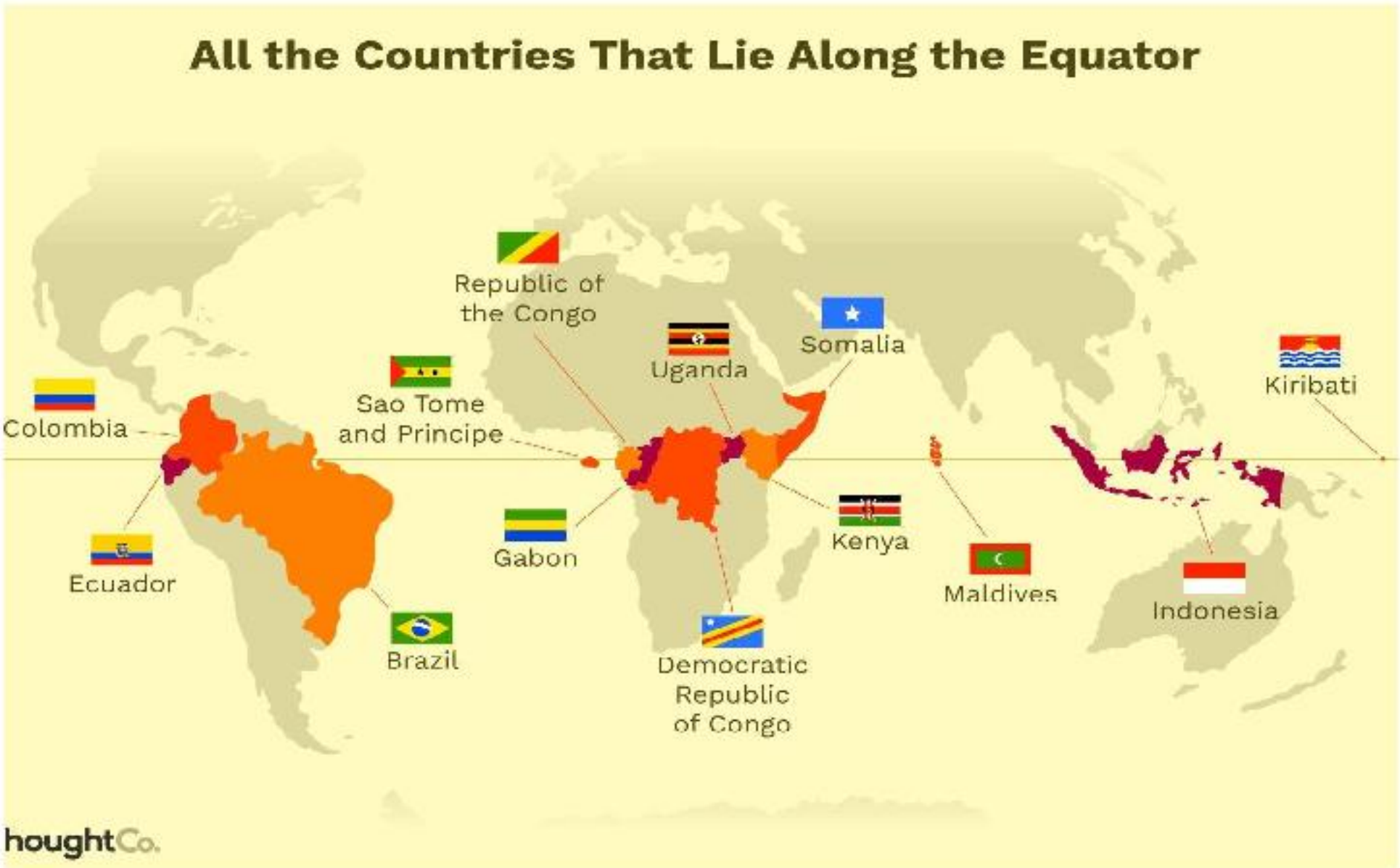

سدین سے قطبی برف مراد لینے کی صورت میں بظاہر یہی ہونا چاہیے کہ ''قَوْمًا لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا'' سے مراد وہ تمام لوگ ہوں جو خط استواء کے آس پاس بستے ہیں؛ لیکن ان دونوں منطقوں میں انٹارکٹکا تو سارا کا سارا زبردست قسم کی برف سے ڈھنکا ہوا ہے لیکن منطقۂ شمالی میں صرف گرین لینڈ کا

علاقہ ہی ایسا ہے جس پر موجود برف پر فی الواقع ''سد'' کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ حسن اتفاق کہ سائنسداں انٹارکٹکا اور گرین لینڈ پر موجود برف کی ان چادروں کو آئس کیپ یعنی برفانی ڈھکن سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

چنانچہ ''السدین'' سے گرین لینڈ اور انٹارکٹکا پر موجود ہزاروں مربع کلومیٹر پر پھیلی برف کی چادریں مراد لینے کے بعد یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ ''بَيْنَ السَّدَّيْنِ'' والا علاقہ وہی ہے جو جنوبی امریکہ میں واقع دریائے ایمیزون کے آس پاس موجود ہے؛ کیونکہ ان دونوں علاقوں کے رخ اور ڈھلاؤ کو دیکھتے ہوئے اگر ان کے درمیان ایک سیدھی لکیر کھینچی جائے تو وہ جنوبی امریکہ میں واقع برازیل وغیرہ ممالک سے ہو کر گذرتی ہے۔

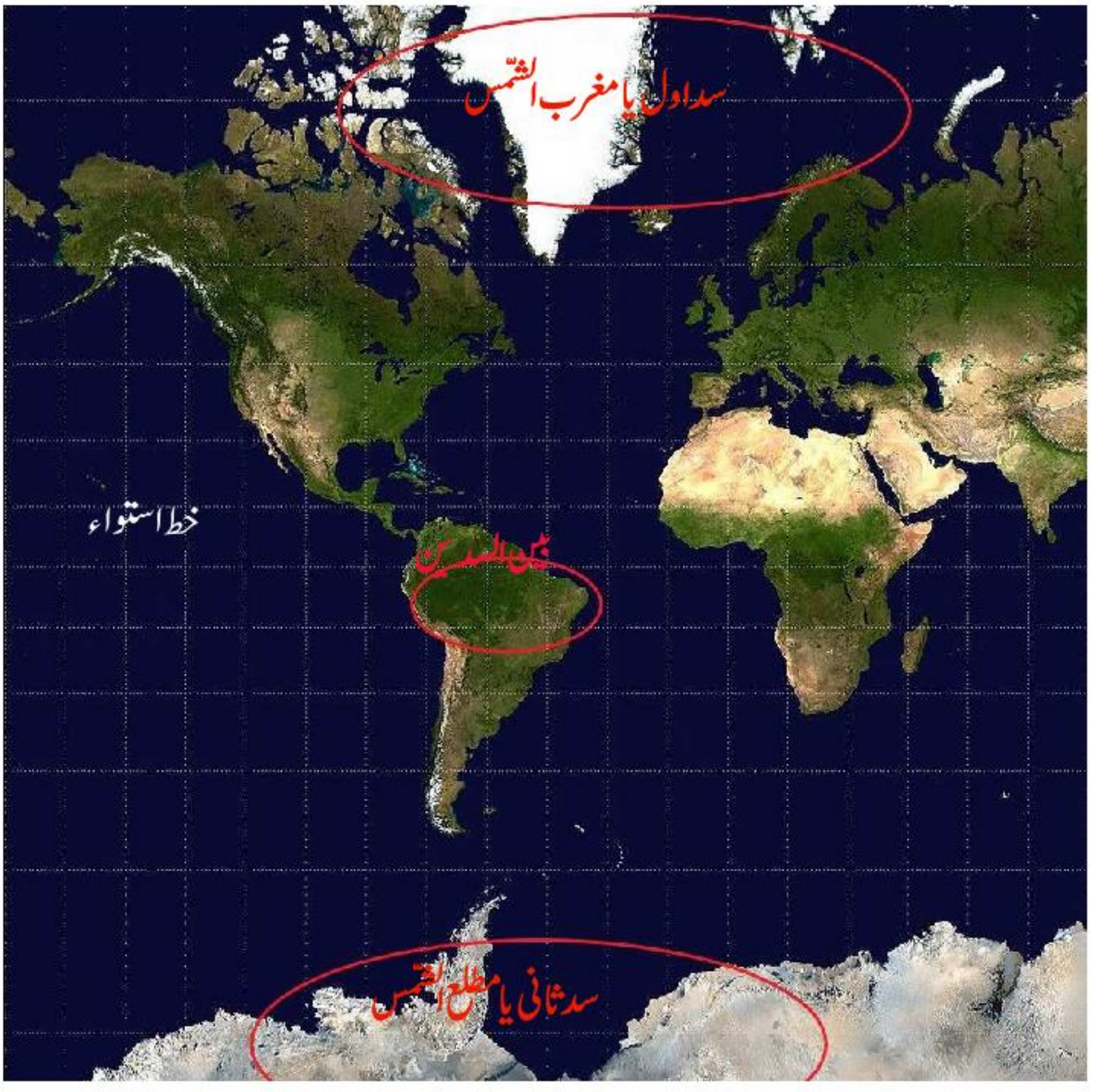

من دونہما :

''من دون'' لفظ دون پر حرف جر ''من'' لگانے سے بنا ہے۔ لفظ ''دون'' بہت سارے معنوں میں مستعمل ہے جیسے قبل، بعد، فوق، خلف، غیر، سوا۔ لیکن ''من دون'' لفظ ''دون'' سے مختلف معنوں میں مستعمل ہے۔

ماقبل میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ''من دون'' کا بنیادی مفہوم لاتعلقی اور انقطاع پر دلالت کرتا ہے۔

چنانچہ یہ کبھی ''بغیر اور سوا'' کا معنی دیکر انقطاع کو ظاہر کرتا ہے، جیسے مِنْ دون وَعْی، اور مِنْ دون انتباہ.

''قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا'' کیا تم اللہ کے سوا کسی ایسے کی پرستش کرتے ہو جو نہ نقصان کا مالک ہے اور نہ نفع کا۔

کبھی بچنے، بچانے کے مفہوم کے ذریعہ انقطاع کا معنی پیدا ہوتا ہے، جیسے فَاتَّخَذَتْ مِن دُونِهِمْ حِجَابًا فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿۱۷ مریم﴾

یہی معنی مقام اول کی آیت لَمْ نَجْعَل لَّهُم مِّن دُونِهَا سِتْرًا میں مذکور ''مِنْ دُونِهَا'' میں مراد ہے۔

کبھی انقطاع کا یہ معنی ''کسی سے مختلف ہونے'' کا مفہوم پیدا کر کے بھی لیا جاتا ہے۔ جیسے

وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُونَ وَوَجَدَ مِن

دُونِهِمُ امْرَأَتَيْنِ تَذُودَانِ ۖ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ۖ قَالَتَا لَا نَسْقِي حَتَّىٰ يُصْدِرَ الرِّعَاءُ ۖ وَأَبُونَا شَيْخٌ كَبِيرٌ ﴿۲۳ القصص﴾

وَمِن دُونِهِمَا جَنَّتَانِ ﴿۶۲ الرحمن﴾

موضوع بحث ''مِنْ دُونِهِمَا'' میں یہ لفظ کس معنی میں استعمال کیا گیا ہے اسے سمجھنے سے پہلے اس میں لگی ضمیر کا مرجع جان لیتے ہیں۔

''مِنْ دُونِهِمَا'' کی ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ السدین ہے یا قومین؟

''مِنْ دُونِهِمَا'' میں ضمیر کا مرجع ''السَّدَّيْنِ'' کو قرار دیکر اکثر مترجمین نے اس کا معنی ''پرے'' یعنی پیچھے کا کیا ہے جبکہ بعض نے ''پہاڑوں کے پاس'' کیا ہے۔ لیکن دونوں معنی درست نہیں، کلام عرب میں ایک بھی مثال ایسی پیش نہیں کی جاسکتی جس میں ''من دون'' کو خلف یا عند کے معنی میں استعمال کیا گیا ہو۔

اگر ''من دون'' کا معنی ''اندر کی طرف'' کیا جائے تب بھی ضمیر کا مرجع ''السَّدَّيْنِ'' کسی طرح نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ اس وقت معنی کی تکرار لازم آتی ہے، ''بین'' کا معنی بھی ''بیچ میں'' اور ''من دونھما'' کا معنی بھی ہے ''دونوں کے بیچ میں''۔ (جب ذوالقرنین ان دونوں بندشوں کے درمیان پہونچے تو ان دونوں کے بیچ میں ایک قوم سے ملے)۔ لہٰذا اس تکرار سے بچتے ہوئے لازماً ضمیر کا مرجع ماقبل میں ملاقات شدہ دونوں قوموں کو ماننا ہوگا۔

رہی بات ضمیر کے مرجع کے قریب ہونے کی تو قاعدے کی رو سے ضمیر کا مرجع قریب تر کو ماننا یا مرجع کو دوبارہ ذکر کرنا تبھی ضروری ہے جب التباس کا خطرہ

ہو لیکن یہاں کسی قسم کا التباس ہی نہیں کیونکہ السدین کو مرجع قرار دینے کی صورت میں لفظی و معنوی غلطی درپیش آتی ہے، لامحالہ ''مِنْ دُونِهِمَا'' کی ضمیر کا مرجع مذکورہ دونوں قوموں کو قرار دینا ہوگا۔

جب ضمیر کا مرجع مذکورہ دونوں قومیں ہیں تو اب ''مِنْ دُونِهِمَا'' کا معنی کیا ہوگا؟

اب معنی ہوگا ''ان دونوں قوموں سے مختلف''، یعنی ایک قوم سے مغرب الشّمس میں ملاقات ہوئی اور دوسری سے مطلع الشّمس میں۔ بین السدین رہنے والی یہ قوم ان دونوں قوموں سے مختلف تھی۔ ان دونوں قوموں سے یہ قوم کس بات میں مختلف تھی اسے قرآن نے ''قَوْمًا لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا'' سے واضح کیا ہے۔

حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِن دُونِهِمَا قَوْمًا لَّا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا ﴿۹۳﴾

یہاں تک کہ جب وہ ان دونوں بندشوں کے درمیان پہونچا تو اسے مذکورہ دونوں قوموں سے مختلف ایک ایسی قوم ملی جو (تذکیر سے متعلق) کوئی بات سمجھنے کو تیار نہیں تھی۔

تعمیر ردم

قَالُوا يَا ذَا الْقَرْنَيْنِ إِنَّ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلَىٰ أَن تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿۹۴﴾ قَالَ مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ

فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿۹۵﴾ آتُونِي زُبَرَ الْحَدِيدِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا
سَاوَىٰ بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انفُخُوا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَعَلَهُ نَارًا قَالَ آتُونِي أُفْرِغْ عَلَيْهِ
قِطْرًا ﴿۹۶﴾ فَمَا اسْطَاعُوا أَن يَظْهَرُوهُ وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا ﴿۹۷﴾

ترجمہ: ان لوگوں نے کہا کہ اے ذوالقرنین یاجوج اور ماجوج زمین میں بگاڑ پیدا کرتے رہتے ہیں، کیا ہم آپ کے لئے حاصل ہونے والی زمینی پیداوار کا ایک حصہ مقرر کر دیں اس شرط پر کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی روک بنادیں۔ (یعنی اگر آپ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی مستقل روک بنادیتے ہیں تو نتیجتاً حاصل ہونے والی زمینی پیداوار کا ایک متعین حصہ ہم آپ کو دینے کو تیار ہیں) ۔ ذو القرنین نے کہا کہ میرے پروردگار نے جن چیزوں میں مجھے قدرت دی ہے اس میں (سد سے) بہتر چیز بھی ہے، لہٰذا تم لوگ افرادی طاقت سے میرا تعاون کرو، تو میں تمہارے اور ان کے درمیان دوطرفہ روک بنادونگا۔ آؤ مجھے لوہے کے مضبوط تختے مہیا کرو۔ یہاں تک کہ جب اس نے دونوں مقناطیس کے درمیان لوہے کے تختے ایک دوسرے کے مساوی نصب کر دئے تو کہا کہ اب انہیں تحریک دو، یہاں تک کہ جب اس نے لوہے کو برقی بار والا بنا کر آگ بنادیا تو کہا کہ اب مجھے سیال تانبہ لادو تاکہ میں اسے پلیٹوں کے اوپر تک بھر دوں۔ بس (ایسا کرنے کے بعد) یاجوج و ماجوج کے لئے اس ردم پر چڑھ نکلنا بالکل محال ہوگیا اور (حتی کہ) انکے لئے اس ردم کی دائیں بائیں جانب سے (زمین کی طرف) پہونچ پانا بھی ممکن نہ رہا۔

مفسرین کے بقول: یاجوج وماجوج نہایت خطرناک، ہلاکت خیز اور کھیتی، باڑی کی تباہی کے علاوہ انسانوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دینے والے فسادی انسان تھے، ان سے حفاظت کے لئے جب اس قوم نے کوئی دیوار بنانے کا مطالبہ کیا تو ذوالقرنین نے دو پہاڑوں کے بیچ لوہے کے تختے لگا کر اسے دھنکوایا اور جب لوہا آگ کی طرح گرم اور سرخ بن گیا تو اس پر پگھلا تانبہ ڈال کر اسے دیوار کی شکل دے دی، وہ دیوار کچھ اس قدر چکنی اور مضبوط بن گئی کہ اسکے بعد یاجوج اور ماجوج نہ اس دیوار پر چڑھ سکتے ہیں اور نہ ہی اس میں کوئی سوراخ بنا کر نکل سکتے ہیں۔

مفسرین کی اس توضیح کے پیش نظر لوگ تاریخ کے تمام ادوار میں دنیا کے مختلف علاقوں میں ایسی کسی دیوہیکل دیوار کی تلاش میں لگے نظر آتے رہے جو لوہے اور تانبہ سے بنی ہو، لیکن آج تک اس کا کہیں بھی پتہ نہیں چلا۔ بالآخر کوئی دیوار چین کو سد سکندری ثابت کر رہا ہے، کوئی کہتا ہے کہ ارمینیا اور آذربیجان میں واقع کوہ قاف نامی پہاڑی سلسلہ ہی سد ذوالقرنین ہے تو کوئی اسکی جگہ ترکمانستان میں بتلاتا ہے، کسی کا کہنا ہے کہ یہ دیوار شمالی علاقے میں واقع ہے، تو کوئی کسی دیگر پہاڑی سلسلہ کو دیوار یاجوج وماجوج ثابت کرنے پر دلائل دے رہا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

قال الرازیّ : الأظهر أن موضع السّدين فی ناحية الشمال . وقيل : جبلان بين أرمينية وأذربيجان . وقيل : هذا المكان فی منقطع أرض

لیکن فی الواقع ایسی کسی دیوار یا پہاڑوں کا کہیں بھی کوئی اتہ پتہ نہیں، اگر کہیں ایسی کسی دیوار کی بتکلف نشاندہی کرنے کی کوشش کی بھی جاتی ہے تو پھر وہاں نہ سد ذوالقرنین کا مطالبہ کرنے والی قوم کا پتہ ہے اور نہ ہی اس کے پیچھے یاجوج اور ماجوج کا کوئی وجود۔

تو پھر سد ذوالقرنین ہے کیا ؟

سورۂ کہف میں ذکر کردہ تین واقعات یعنی واقعۂ اصحاب کہف، قصۂ موسیٰ وخضر علیہما السلام اور روداد ذوالقرنین اپنی نوعیت کے لحاظ سے مافوق العادت اور غیر معمولی حیثیت کے حامل ہیں۔

لیکن یاد رہے کہ جن واقعات کو مافوق العادت، مافوق الفطرت اور غیر معمولی گردانا جاتا ہے وہ درحقیقت انسانی علم کی کمی اور حواس کی گرفت سے باہر ہونے کا نتیجہ ہے ورنہ جس خدا نے اس محسوس مادی دنیا کو معلوم اسباب کے تحت رواں دواں رکھا ہے اسی خدا نے ان غیر معمولی واقعات کے لئے بھی کچھ اصول و قواعد وضع کئے ہیں، وہ دنیا بھی انہیں کے تحت چلتی ہے؛ لیکن ہم انسان اپنے حواس کی محدود صلاحیت کی وجہ سے انہیں مافوق الفطرت کا نام دے دیتے ہیں۔

الغرض اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کو بھی خضر علیہ السلام کی طرح اپنی نوعیت کی غیر معمولی طاقت وصلاحیت سے نوازا تھا، روئے زمین کے مختلف علاقوں کے سفر کے دوران جہاں انہوں نے اپنے اقتدار کا سکہ جما کر اللہ کا پیغام بھی پہونچایا

وہیں لوگوں کو تکوینی امور سے متعلق اگر کوئی غیر معمولی مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ اسے بھی اپنی خداداد صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے حل فرما دیتے۔

چنانچہ جب وہ براعظم جنوبی امریکہ میں واقع دریائے ایمیزون کے آس پاس پہونچے تو وہاں رہنے والوں نے ذوالقرنین سے یاجوج وماجوج کی شکایت کرتے ہوئے ان کے درمیان کوئی ''سد'' بنادینے کا مطالبہ کیا تاکہ وہ ان تک نہ پہونچ سکے تو ذوالقرنین نے اپنی خداداد دوراندیشی کے پیش نظر ''سد'' کے بجائے ان کے اور یاجوج وماجوج کے درمیان ایک ایسی ''ردم'' بنادی ۔

اب یہ ''ردم'' کیا ہے، کہاں پر واقع ہے اور یاجوج وماجوج سے کس طرح تحفظ فراہم کرتی ہے، اسے سمجھنے سے پہلے ''یاجوج وماجوج'' کو سمجھ لیتے ہیں۔

یاجوج وماجوج کون ہیں؟

یہاں ایک اہم سوال ہے کہ آخر بین السدین رہنے والی قوم نے یاجوج و ماجوج کو قتل کردینے کے بجائے ان کے اور یاجوج وماجوج کے درمیان سد بنانے کا مطالبہ کیوں کیا؟

یاجوج وماجوج وہاں کی آبادی کے لئے برباد کن اثرات کے حامل تھے اس میں دورائی نہیں لیکن وہ کوئی فسادی انسان یا کوئی چھوٹی موٹی مخلوق نہیں تھے کہ انہیں قتل کرکے ان سے نجات حاصل کرلی جاتی ۔ اگر یاجوج وماجوج واقعتاً فسادی انسان ہوتے تو ذوالقرنین انہیں قتل کرکے ختم بھی کرسکتے تھے جیسا کہ مقام

اول (مغرب الشّمس کے علاقے) میں ذوالقرنین نے کہا تھا: اما من ظلم فسوف نعذبه ؛لیکن یہ مخلوق کچھ اس طرح خطرناک تھی یا انہیں گرفت میں لانا ممکن نہیں تھا کہ سد کا مطالبہ کرنے والی قوم بھی جانتی تھی کہ انہیں بجز سد کے روکا نہیں جا سکتا تھا، اسی طرح ذوالقرنین کی جانب سے انہیں ختم کرنے کے بجائے ردم بنانے کی تجویز پیش کرنے سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یاجوج و ماجوج کوئی غیر انسانی یا ایسی مخلوق ہونی چاہیے جس پر قابو پانا مشکل ہوگا۔

یاجوج و ماجوج اپنی خطرناکی اور کثرت کے ساتھ جس جگہ سے آیا کرتے تھے وہ جائے ورود یا خروج بھی غیر معمولی طور پر بہت بڑی تھی، یہی وجہ ہے کہ ذوالقرنین نے فرمایا تھا کہ میں سد کے بجائے ردم بنادینے کو تیار ہوں، البتہ افرادی قوت درکار ہوگی، تبھی اتنا عظیم الشان کام پایۂ تکمیل کو پہونچ سکتا ہے۔ اگر کام صرف اتنا آسان ہوتا جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ لوہے کے تختے لاکر دو پہاڑوں کے بیچ رکھے گئے، انہیں دھونکا گیا، جب لوہا آگ بن گیا تو اس پر پگھلا تانبہ ڈالکر ٹھوس دیوار بنادی گئی، تو ایسا کرنے میں بھلا ذوالقرنین کا کمال کیا ہے! یہ سب کام تو اسی قوم نے انجام دئے ہیں، اس میں ذوالقرنین کی مدد لینی کی ضرورت ہی کیا تھی؟ جبکہ ایک طرف اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں: انا مکنالہ فی الارض۔ کہ بلاشبہ ہم نے اسے زمین میں اقتدار بخشا تھا تو دوسری جانب خود ذوالقرنین کا یہ بیان بھی قابل توجہ ہے کہ ما مکنی ربی فیہ خیر۔ یعنی جن چیزوں میں مجھے قدرت و اختیار حاصل ہے اس کے مطابق میں تم لوگوں کی سوچ سے بھی زیادہ بہتر چیز بنا کر

دے سکتا ہوں۔لہٰذا اگر دو پہاڑوں کے بیچ لوہے اور تانبے کی دیوار بنا دینے کا معنی مراد لیا جائے تو ایسی صورت میں آیت والے دعوے کا مصداق ہی ثابت نہیں ہوتا ؛لہذا تعمیر ردم کا کام یقیناً کوئی نہایت غیر معمولی کام تھا۔

یاجوج وماجوج کون ہیں؟

اب سوال یہ ہے کہ یاجوج و ماجوج آخر ایسی کونسی مخلوق تھی کہ اس کی خطرناکی سے بچنے کے لئے اتنی زبردست قسم کی ردم تعمیر کی گئی ، بلکہ اللہ تعالیٰ نے قرب قیامت کی نشانیوں میں خروج یاجوج و ماجوج کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے؟

اس سوال کا جواب سمجھنے کا مدار یاجوج ماجوج کی حقیقت سمجھنے پر منحصر ہے کیونکہ قرآن کے مطابق یہی وہ مخلوق ہے جس کے تباہ کن اثرات سے اہل زمین کو محفوظ رکھنے کے لئے یہ عظیم الشان ردم تعمیر کی گئی ہے۔

جس طرح سد ذوالقرنین کے متعلق ذات بھانت کے اقوال ہر زمانے میں پیش کئے جاتے رہے اسی طرح یاجوج ماجوج کی حقیقت کے متعلق بھی عجیب و غریب قسم کی چہ میگوئیاں ہمیشہ بحث ومباحثہ کا موضوع رہی ہیں۔

اکثر و بیشتر علماء مؤرخین اور مفسرین کی رای کے مطابق یاجوج و ماجوج دو پہاڑوں کے بیچ لوہے اور تانبہ سے بنی کسی مضبوط دیوار کے پیچھے محصور انسانی نسل سے تعلق رکھنے والی ایک فسادی قوم ہے۔بعض کا کہنا ہے کہ یاجوج ان میں مذکر کو کہا جاتا ہے جبکہ ماجوج مؤنث کو۔ان کے قدوقامت کے متعلق کسی کا کہنا ہے کہ

وہ بالشت جتنے بونے ہیں تو کوئی کہتا ہے کہ وہ بہت زیادہ لمبے ہیں، جو ایک کان کو بچھا کر سوتے ہیں تو دوسرے کو اوڑھ لیتے ہیں۔

وَقِیلَ یَأْجُوجُ اسْمٌ لِلذُّکْرَانِ وَمَأْجُوجُ اسْمٌ لِلْإِنَاثِ۔۔۔ المصباح المنیر۔

بمطابق اسرائیلیات یاجوج و ماجوج یافث ابن نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں، اسی کی پیروی کرتے ہوئے تقریباً سبھی مؤرخین، مفسرین اور علماء اسلام نے بھی انہیں سفاک، ہلاکت خیز اور فسادی انسان کے روپ میں ہی بیان کیا ہے؛ لیکن جب دور حاضر کے مفسرین و مؤرخین نے دیکھا کہ روئے زمین پر ایسی کوئی مخلوق نظر نہیں آتی جس پر یاجوج و ماجوج کا نام چسپاں کیا جا سکے تو کوئی تاتاری قوم کو یاجوج و ماجوج بتانے لگا، کوئی چینیوں کو تو کوئی یہودیوں کو یاجوج و ماجوج ثابت کرنے پر طرح طرح کے دلائل دیتا نظر آیا۔

یاجوج و ماجوج کے متعلق مبنی بر دلائل مکمل تفصیل جاننے سے قبل ان کے بارے میں تاریخ اور روایات کا حوالہ دیتے ہوئے مؤرخین و مفسرین نے جو تعارف پیش کیا ہے اس پر ایک نظر کرتے چلیں۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹھے تھے سام، حام اور یافث۔ سام سے عرب نسل ہے، حام سے حبشی نسل اور یافث کی نسل سے دو قبیلے تھے جن میں سے ایک کا نام یاجوج اور دوسرے کا ماجوج ہے۔

یہ اولاد آدم ہی ہیں، انسانوں سے ماوراء کوئی مخلوق نہیں۔

یاجوج ماجوج نزول حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور خاتمۂ فتنۂ دجال کے بعد خروج

کرینگے۔

یاجوج و ماجوج کا مقابلہ کوئی بھی نہ کر سکے گا، حتیٰ کہ حضرت عیسی علیہ السلام بھی نہیں۔

ان کی تعداد امسلمانوں سے ننانوے فیصد زیادہ ہے۔

یہ سب بلا امتیاز جہنمی ہونگے۔

یاجوج و ماجوج آج بھی موجود ہیں اور قرب قیامت اپنے مقررہ وقت پر اللہ کے حکم سے اہل دنیا پر نکل کر وحشت، فتنہ، فساد اور ہلاکت و بربادی کا باعث بنینگے۔

یہ اپنے گرد بنی دیوار کو روزانہ چاٹتے رہتے ہیں اور جھلی برابر پتلی باقی رہنے پر پھر اگلی صبح کے لئے چھوڑ دیتے ہیں کہ کل باقی کو ختم کر لینگے؛ لیکن اگلی صبح پھر جب اسے گرانے کے لئے آتے ہیں تو بحکم الٰہی وہ پھر اتنی ہی موٹی پاتے ہیں اور یہ عمل اس وقت تک جاری رہیگا جب تک کہ اپنے وقت موعود پر مشیت ایزدی سے ان شاء اللہ کہیں گے تب اگلی صبح وہ دیوار اتنی ہی پتلی پائینگے جتنی چھوڑ کر گئے تھے تو باقی بچی دیوار کو گرا کر باہر نکل آئینگے اور وہ دنیا والوں پر جھپٹ پڑینگے۔

یہ دیوار سے باہر آ کر دنیا کا تمام پانی یکلخت ختم کر دینگے، تمام سبزہ آن واحد میں کھا جائینگے، انسانوں، حیوانوں اور چرند و پرند کا بے پناہ خون بہائینگے کہ کسی کو کہیں پناہ نہیں ملیگی، پھر وہ آسمان کی طرف تیر برسائینگے جو حکم الٰہی سے خون آلود ہو کر واپس آ گرینگے تو یہ خوشی سے کہینگے کہ ہم نے دنیا والوں کو بھی تباہ کر دیا اور آسمان والوں پر بھی غلبہ حاصل کر لیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پھر دعا فرمائینگے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے یاجوج و ماجوج کی گردنوں میں کیڑے پیدا ہوجائینگے اور وہ تمام ہلاک ہوجائینگے۔

انکی ہلاکت کے بعد دنیا پر صرف مسلمان ہی باقی رہینگے، پھر یہ مسلمان کفر و شرک، بد اعمالیوں میں مبتلا ہوجائینگے تو اللہ تعالیٰ ان میں سے نیک لوگوں کو اٹھا لینگے اور برے لوگوں پر قیامت قائم کرینگے۔ الخ

لیکن ان مذکورہ باتوں میں کس قدر سچائی ہے اسے دلائل کی بنیاد پر جانچنا ضروری ہے۔ کیا یاجوج و ماجوج واقعتاً انسان ہیں یا کوئی دیگر مخلوق، کیا وہ کسی شریعت کے پابند ہیں یا پھر غیر مکلف مخلوق، کیا وہ کوئی فسادی مخلوق ہے یا اللہ کا عذاب، وہ سطح زمین پر آباد ہیں یا کہیں اور؟ اس طرح کے کئی سوالات ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں اس بارے میں حتمی دلائل ہماری کیا رہنمائی کرتے ہیں۔

یأجوج و مأجوج کی وجہ تسمیہ

لفظ یأجوج و مأجوج کے معنی، مادے، وزن اور انکی اصلیت کے متعلق آج تک کوئی حتمی بات نہیں کی جاسکی، لہٰذا انکی وجہ تسمیہ کے متعلق بھی کوئی فیصلہ نہیں ہوسکا کہ اس مخلوق کو آخر یأجوج و مأجوج کیوں کہا جاتا ہے۔

کسی نے یأجوج و مأجوج کو عربی الاصل ماننے کے بجائے عجمی الفاظ قرار دیتے ہوئے (Gog Magog) سامی زبان میں انکی اصل بتلانے کی کوشش کی ہے۔

کوئی یأجوج و مأجوج کے الف کو زائد مانتے ہوئے یجج اور مجج سے فاعول

کے وزن پر یاجوج و ماجوج بتلاتا ہے۔

کوئی انکے أج الماء اور مجت النار سے مشتق ہونے کا قائل ہے۔

جولوگ یأجوج و مأجوج کے ہمزہ کو اصلی گردانتے ہیں وہ اسے ''أج الماء'' سے مشتق مانتے ہیں۔اور تانیث وعلمیت کی بنا پر غیر منصرف۔

ويَفْعُول يَأْجُوج فيمن همز فأما مأْجُوج فيمن همز فمفعول من أجَّ ومن لم يهمز ففَاعُول من مَجّ أو فَعْلول من ماج وأبدل من الواو ألفاً أو من مأج فترك الهمز ۔ المزهر فی علوم اللغة

(واليَأْجُوجُ) باللاّم مُشتقٌّ (من) أَجَّ (يَئِجُّ ها كذا وها كذا) إِذا هَرْوَلَ وَعَدَا.

(ويَأْجُوجُ ومَأْجُوجُ): قَبِيلتانِ من خَلْقِ الله تعالى، وجاءَ فی الحديث: (أَن الخَلْقَ عَشَرَةُ أَجزاءٍ، تسعةٌ منها يَأْجُوجُ ومَأْجُوجُ) وهما اسْمَان أَعْجَمِيَّان، جاءَت القراءَةُ فيهما بهَمْزٍ وغير هَمْز، و (مَنْ لا يَهْمِزُهُمَا) و (يجعل الأَلِفَيْنِ زَائِدَتَيْن) يقول: إِنّهُما (من يَجَجَ ومَجَجَ)، وهما غير مصروفين، قال رُؤْبَةُ:

لَوْ أَن يَأْجُوج ومَأْجُوجَ مَعَا وعادَ عَادٍ واسْتَجَاشُوا تُبَّعَا

ومن هَمَزَهُمَا قال: إِنّهما من أَجَّتِ النَّارُ، ومن الماءِ الأُجَاجِ، وهو الشّديدُ المُلُوحَةِ المُحْرِقُ من مُلُوحَتهِ، ويكون التَّقديرُ فی يَأْجُوجَ يَفْعُول، وفی مَأْجُوجَ مَفْعُول، كأَنَّه من أَجيج النّارِ.

قالوا: ويجوز أَن يكون يَاجُوج فاعولا، و كذالك ماجُوج، وهذا لو كان

الاسمان عَرَبِيَّيْن لكان هذا اشتقاقَهما فأَمّا الأَعْجَمِيّةُ فلا تُشْتَقُّ من العَرَبيّة.

(وقَرَأَ) أَبو العَجَّاجِ (رُؤْبَةُ) بنُ العَجّاجِ (: آجُوجَ ومَاجُوجَ) بقلب الياءِ همزاً. تاج العروس

يأجوج ومأجوج کا حقیقی معنی

يأجوج و مأجوج دونوں عربی لفظ ہیں، اول یفعول کے وزن پر صفت مشبہ جبکہ دوسرا مفعول کے وزن پر اسم مفعول۔ اور ''مرکب امتزاجی'' ہونے کی بنا پر غیر منصرف۔

آیئے الفاظ کا حقیقی معنی و مفہوم سمجھنے سے پہلے انکی صرفی تحلیل پر غور کر لیں۔

أج، يؤج، اجا و اجيجا و اجة (باب نصر ينصر) آگ بھڑکنا ، دہکنا، روشن ہونا۔

أجت النار : آگ بھڑکنا۔

أج الشيئ : چمکنا وجگمگانا۔

أج النهار : دن کا انتہائی گرم ہونا۔

أجج النار : آگ بھڑکانا، دہکانا۔

أج الماء : پانی کا گرم وکھارا ہونا۔

أج الامر : مشتبہ ہوجانا۔

الأَجُّ : السُّرْعَةُ ، أَجَّ الظليم يؤج أجّاً، أى عدا وله حفيف فى عَدْوه كحفيف اللهب،. قال الشاعر: تؤج كما أَجَّ الظليمُ المُنَفَّرُ ۔

الأجة : گرمی کی تیزی وشدت ۔ اشتدت أجة المصيف (گرمی کی شدت) شدة الحر وتوهُّجه ،سمعت أجة القوم : حفيف مشيهم واضطرابهم.

أجيج : أجيج النار : تَلَهُّب النار ۔

أجوج : مصباح أجوج ،روشن چراغ۔ المُضِیءُ النَّيِّر (أَغَرُّ كمصباح اليهودِ أَجوجُ)

أجّاج : دہکتا، بھڑکتا،شعلہ زن۔

أجيج الماء : پانی کی آواز۔

ماءٌ أُجاجٌ : بہت کھارا اور کڑوا پانی (الأُجاج: ما يلْذَع الفم بمرارته أَو مُلوحته.)

تأجيج العداوة : دشمنی بھڑکانا۔

تأجيج الرأى العام : رائے عامہ کو ورغلانا۔

یاجوج و ماجوج کے حقیقی معنی ومفہوم کو سمجھنے کے لئے پہلے أج، يؤج کے حقیقی معنی کو سمجھ لیتے ہیں۔

أجّ سے بنے مشتقات کے مذکورہ بالا الگ الگ استعمال میں یہ بات ہم اصولی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ بعض میں أجّ اپنے حقیقی معنی میں مستعمل ہوگا اور بعض میں مجازی۔ چنانچہ أج، يؤج کا زیادہ تر استعمال آگ، چراغ یا سورج سے پیدا ہونے والی ایسی تیز روشنی کے لئے ہوا ہے جس میں شدت کی حرارت بھی ہو۔ لہٰذا

أجّ کو ''حرارت والی تیز روشنی'' کے لئے موضوع لہ مان کر بقیہ استعمالات کو مجاز سمجھا جائیگا۔

مذکورہ لغوی قیاس کی بنیاد پر دوسرے کسی بھی معنی و مفہوم کے بجائے فی الحال ہم ''یاجوج و ماجوج'' کے معنی میں ''حرارت والی تیز روشنی'' کے مفہوم کو اولیت دیتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ چنانچہ ہم ''یاجوج و ماجوج'' کا معنی کرینگے ''ایسا وجود جو شدید حرارت پر مشتمل تیز روشنی کو خارج کرتا ہو''۔ ۔۔۔۔اب آگے چل کر دیکھتے ہیں کہ یہ خیال کس قدر درست ثابت ہوتا ہے۔

کسی بھی لفظ کو موضوع لہ کے بجائے مجازاً کسی دوسری جگہ استعمال کرنے کے لئے موضوع لہ معنی کی خصوصیات کا اس میں پایا جانا ضروری ہے، چنانچہ أجّ جس تیز روشنی کے لئے وضع کیا گیا ہے اس کی بنیادی خاصیت ''حرارت کے ساتھ شدت انتشار'' ہے۔ مبنی بر حرارت شدید انتشار یہ ایک ایسی خاصیت ہے جو دنیا کی کسی بھی چیز کے مقابل صرف تیز روشنی میں ہی اپنے کمال کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے ۔شدت انتشار کی حامل چیز کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ ملحوظ شکل میں نمایاں ہوتی ہے؛ لہٰذا جہاں کہیں شدت انتشار کی حامل ایسی صفت کو بتلانا مقصود ہو جو ملحوظ شکل میں نمایاں ہو تو وہاں مجازاً ''أجّ'' کا استعمال کیا جائیگا۔ چنانچہ تأجیج العداوۃ : دشمنی بھڑکانا۔تأجیج الرأی العام : رائے عامہ کو ورغلانا۔جیسی مثالوں میں اسے ہم دیکھ سکتے ہیں۔یعنی دوستوں میں دشمنی اور لوگوں میں آراء کا ایسا شدید انتشار و اختلاف کے باہر کے لوگ بھی اسے محسوس کر سکیں تو ایسے انتشار و

اختلاف کو بتلانے کے لئے أجّ کا استعمال کیا جائیگا۔

أجيج الماء: پانی گرم ہوکر ہوا میں تیزی کے ساتھ منتشر ہوتے وقت جو آواز کرتا ہے اسے أجيج الماء کہا جاتا ہے۔

أج الظليم المنفر: محض گھوڑے کی تیز رفتاری کے لئے ''أج'' استعمال نہیں ہوگا بلکہ تیزی سے بھاگتا گھوڑا جب کسی وجہ سے بدک کر ہنہناتے ہوئے ادھر ادھر بھاگنے لگے تو ایسی صورت میں ''أج'' کے استعمال کا صحیح موقع ہے۔ گویا کسی چیز نے گھوڑے کو بھڑکا دیا جس کی وجہ سے اس کی رفتار پراگندہ ہوگئی۔

سمعت أجيج القوم: دور دراز سے تیزی کے ساتھ آنے والے گھوڑ سواروں کے گھوڑوں کی ٹاپ اور سواروں کی گفتگو کے ایک دوسرے سے ٹکرانے اور گڈمڈ ہونے پر جو ملا جلا شور اور انتشار پیدا ہوتا ہے اسے أجيج القوم کہا جاتا ہے۔

أجّ الامر: معاملہ مشتبہ ہوگیا۔ یعنی شدت اختلاف وانتشار کی وجہ سے کوئی فیصلہ نہ کیا جاسکے۔

أجة: اشتدت أجة المصيف: موسم گرماں میں عرب جیسے صحرائی علاقوں میں تیز چلنے والی ہوائیں جب ریت اور پتھر کے ٹیلوں سے ٹکرا کر گرم لہروں اور لپٹ میں بدل جاتی ہیں تو آواز کے ساتھ منتشر ہوکر یا وقفہ وقفہ سے چلنے والی گرمی کی ایسی لو اور لہر کو ''اجة المصيف'' کہا جاتا ہے۔ مثلاً وقال ذُو الرُّمَّة: حَتى إِذا مَعْمَعَانُ الصَّيْفِ هَبَّ لَهُ... بِأَجَّةٍ نَشَّ عَنْها المَاءُ والرُّطبُ۔

الغرض أج يؤج کے حقیقی معنی میں ''حرارت والی ایسی تیز روشنی جو دور تک

نظر آتی ہو'' کے مفہوم کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔اسی لئے ہر روشن وتاباں چیز کے لئے الأجوج کا لفظ استعمال نہیں ہوگا بلکہ شدت حرارت کے ساتھ تیز روشنی دینے والی چیز کے لئے ہی یہ لفظ استعمال کیا جائیگا۔

اسی طرح الأجّاج ہر قسم کے شعلے کے لئے نہیں بولا جائیگا بلکہ شدت کے ساتھ بھڑکنے والی ایسی آگ جس کی روشنی دور تک جاتی ہو اس کے لئے ہی استعمال ہوگا۔

الحاصل ''أج'' کے معنی میں حرارت والی تیز روشنی کو اولیت حاصل ہے؛ لہٰذا روشن چیزوں کے علاوہ بقیہ چیزوں کے لئے ''أج'' کا استعمال مجازی ہوگا۔

اب مذکورہ مثالوں میں ''أج'' کا قدر مشترک معنی تو سمجھ میں آ گیا، لیکن أج الماء (پانی کھارا ہوگیا) یا اجاج (: کھارا پانی) میں یہ قدر مشترک معنی نہیں نظر آتا، اس کی وجہ کیا ہے؟

قرآن کریم میں تین مقام پر لفظ ''أُجَاجٌ'' وارد ہوا ہے۔

وَهُوَ الَّذِى مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ ﴿۵۳﴾ الفرقان

وَمَا يَسْتَوِى الْبَحْرَانِ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهُ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ ﴿۱۲﴾ فاطر

أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِى تَشْرَبُونَ ﴿۶۸﴾ أَأَنْتُمْ أَنْزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ

الْمُنْزِلُونَ ﴿۶۹﴾ لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ﴿۷۰﴾ ﴿ الواقعة﴾

مذکورہ آیتوں میں واقع لفظ ''اُجاج'' کا معنی بیان کرتے ہوئے اہل معاجم ولغت اور مفسرین نے بیک زبان جولکھا ہے وہ ہے: شدید المرارۃ (یعنی پانی کا نہایت کڑوا ہونا)۔ شدید الملوحۃ (یعنی پانی کا نہایت کھاری ہونا)۔ یا شدید الملوحۃ و المرارۃ کڑوا اور کھاری دونوں صفت کا ایک ساتھ حامل ہونا۔ یا پھر بقولے ''شدید الحرارۃ''۔ ملاحظہ فرمائیں۔

(و) یقال: (ماءٌ أُجَاجٌ) بالضّمّ، أَی (مِلْحٌ)، وقیل: (مُرٌّ)، وقیل: شَدِیدُ المَرارَةِ، وقیلَ: الأُجاجُ: الشَّدِیدُ الحَرارَةِ و کذالك الجَمْعُ، قال اللہ عزّ وجلّ: {وَهٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ} (سورة الفرقان، الآیة: ۵۳) وهو الشّدِیدُ المُلُوحَةِ والمَرَارَةِ، مثل ماءِ البحر، وفی حدیث علیّ (عَذْبُها أُجَاجٌ). وهو الماءُ المِلْحُ الشدیدُ المُلُوحَةِ۔ تاج العروس و لسان العرب۔

بظاہر حقیقی معنی اور کھارے پن کے بیچ دور کا بھی رشتہ نظر نہیں آرہا ہے؛ لیکن ہمارے بتلائے حقیقی معنی ''حرارت والی تیز روشنی'' اور حرارت وملوحت والے اجاج کے معنی میں بہت ہی گہرا رشتہ ہے۔

روئے زمین پر دو قسم کا پانی پایا جاتا ہے۔ ایک کھارا اور دوسرا میٹھا۔ میٹھا پانی عام طور پر دریا، جھیل، تالاب اور چشموں کی صورت میں پایا جاتا ہے جبکہ کھارا

پانی سمندروں میں ۔۔۔۔۔سورج کی تیز دھوپ جب سمندر پر گرتی ہے تو وہ نمک کو چھانٹ کر میٹھے پانی کو فضا میں اٹھاتے ہوئے بادل بنا کر بارش کی شکل برسا دیتی ہے۔جبکہ پیچھے رہجانے والے نمک کی وجہ سے سمندر کا پانی مزید کھارا بنتا جاتا ہے۔ بلکہ سورج کی گرمی کی وجہ سے وہ نسبتاً گرم بھی ہوجاتا ہے۔

اس بات سے قطع نظر کہ سمندر کا پانی کھارا کیوں ہوتا ہے، سائنسی طور پر یہ بات محقق ہوچکی ہے کہ سورج کی گرمی کے ذریعہ بادل بننے کے عمل کی وجہ سے سطح سمندر کا پانی مزید کھارا اور نسبتاً گرم ہوتا ہے اور یہی بات اجاج کے لغوی معنی کے ذریعہ معلوم ہوتی ہے۔

قرآن نے یہی بات أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ﴿٦٨﴾ أَأَنْتُمْ أَنْزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُونَ ﴿٦٩﴾ لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ﴿٧٠﴾ ﴿الواقعة﴾ کے ذریعہ بتلائی ہے۔

الغرض ہر وہ مرطوب چیز (چاہے وہ پانی ہو یا کوئی اور چیز) جسے تیز روشنی نے اپنی گرمی سے خشک کردیا ہو تو ایسی ہر چیز کے لئے بھی اجاج کا استعمال درست ہوگا۔

چنانچہ جس طرح سورج کی روشنی کی وجہ سے سمندر کا میٹھا پانی بھاپ بن کر بادل میں بدلتا جاتا ہے تو پیچھے کا پانی مزید کھارا ہوتا جاتا ہے۔اسی طرح ''هجير أجاج'' ایسی گھاس کو کہا جاتا ہے جسے سورج کی تپش نے خشک کردیا ہو۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ أج یؤج میں موجود قدر مشترک جو معنی یاجوج و ماجوج کے لئے بیان کیا گیا ہے اس معنی کو اجاج کا مفہوم بھی مؤکد کرتا ہے۔

مانا کہ أج کے حقیقی معنی میں ''حرارت والی تیز روشنی'' کا مفہوم بنیادی اہمیت کا حامل ہے؛ لیکن اب سوال یہ ہے کہ ''یفعول اور مفعول'' دو الگ الگ وزن میں اس لفظ کو استعمال کر کے کیا بتلانا مقصود ہے؟

آیئے پہلے یاجوج وماجوج کی صرفی تحلیل پر مزید غور کر لیتے ہیں۔

یأجوج کا وزن یعنی ''یفعول'' بھی اس کے معنی کی صحیح رہنمائی کرنے میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔ ''یفعول'' کے وزن کے متعلق ہمیں کتب صرف میں کوئی تذکرہ نہیں ملا کہ آخر یہ وزن کس طرح مشتق ہوتا ہے اور اسکی کیا خاصیت ہے۔ وزن ''یفعول'' کی خاصیت کی جانچ پڑتال کے لئے معاجم ولغات میں نظر دوڑائی جائے تو ہمیں مذکورہ ذیل الفاظ نظر آتے ہیں۔

یأموم: کبوتر کا چوزہ۔

یعسوب: شہد کی مکھیوں کی رانی، ایک چھوٹا پرندہ، قوم کا سردار۔

یعفور: ہرن۔

یأفوخ: نومولود بچے کے سر کا وہ حصہ جو مسلسل حرکت کرتا ہے۔

یأفوف: بزدل، بے عقل، تیتر کا بچہ، کڑوا کھانا، تیز رفتار۔

یربوع: ایک قسم کا چھوٹا چوہا (چوہے کے مانند ایک جانور جس کی اگلی ٹانگیں چھوٹی ،پچھلی بڑی اور دم لمبی ہوتی ہے)

یحمور: چھوٹی دم والا بارہ سنگھا، گاؤخر۔

ینبوت: تیزی سے یا بار بار اگنے والی نبات۔

یھفوف: بزدل، چٹیل زمین۔

ینبوع: پانی کا چشمہ۔

یعبوب: تیز رفتار لمبا گھوڑا، تیز رو نہر۔

یحموم: سیاہ چیز، کبوتر کی ایک قسم جس کا پیٹ، گردن، سر اور سینہ سیاہ ہوتا ہے، چونچ اور پیر چھوٹے ہوتے ہیں۔

یعقوب: نرچکور۔

یَسْرُوع: دُوَیبَّة تکون فی الرمل

یَمْخور: عنق طویل

یَعْمور: ضَرب من الطیر

یھْمور: الماء الکثیر (تیزی سے گرنے والا)

ظبی یَنْفور: شدید النفرة والقفز

یَنْخوب: جبان

أرض یَخْضور: کثیرة الخضرة (تیزی سے اگنے والی)

ثوب یَعْلول: إذا عُلَّ بالصّبْغ مرة بعد أخری

طریق یَنْکوب: (نیچے کی طرف جاتا راستہ)

یَرْمُوق: ضعیف البصر (جسکی آنکھیں پھڑ پھڑاتی رہتی ہوں)

یفعول کے وزن پر واقع ان مذکورہ الفاظ کے اصلی معانی پر غور کیا جائے تو

چند باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔

۱۔ پہلی خاص بات جو یفعول کے وزن میں پر نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ یفعول کے وزن پر واقع تمام الفاظ فعل لازم سے بنے ہیں، ان میں ایک بھی ایسا اسم نہیں جو فعل متعدی سے بنا ہو۔

۲۔ یفعول کا وزن صفت کے لئے مستعمل ہے۔ جیسے یعسوب، یربوع، الیحموم، الیخضور، الیرقوع۔

۳۔ اگر یفعول کے وزن پر آنے والے ان الفاظ کے معانی کو بغور دیکھا جائے تو اس کے معنی میں جو چیز اضافی طور پر نظر آتی ہے، وہ ہے: ''کسی چیز کا غیر معمولی طور پر مسلسل تیز حرکت میں ہونا''۔

جیسے یھفوف: تیز دل، بزدل۔ یأفوخ: نومولود بچے کے سر کا وہ حصہ جو مسلسل حرکت کرتا ہے۔ یأفوف: بزدل، بے عقل، تیتر کا بچہ، تیز رفتار۔ طریق یَنْکوب: نیچے کی طرف جاتا راستہ۔ یعبوب: تیز رفتار لمبا گھوڑا، تیز رو نہر۔ ینبوع: پانی کا تیزی سے بہنے والا چشمہ۔ یعسوب: شہد کی مکھیوں کی رانی، قوم کا سردار (جو اپنی قوم کی خدمت کے تئیں بہت متحرک ہوتے ہیں)۔ یحموم: کبوتر کی ایک قسم۔ تیزی سے گذرتا سایہ۔ وغیرہ وغیرہ

دل، شہد کی مکھی، قوم کا سردار، چشمہ، گھوڑا، بچہ کا دماغ۔ یہ سب بذات خود متحرک ہی ہوتے ہیں لیکن جب ان میں اضافی اور غیر معمولی حرکت نمایاں کرنی ہو تو ''یفعول'' کے وزن کا استعمال کرتے ہوئے۔ یافوخ، یعبوب، یعسوب اور ینبوع

جیسے کلمات استعمال کئے جائینگے۔

۵۔ مذکورہ الفاظ پر غور کرنے سے ''یفعول'' کے وزن میں ''غیر معمولی حرکت'' کے معنی کے علاوہ بلندی یا بلندی سے پستی کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔

اب اگر ''أج'' سے حقیقی معنی ''حرارت والی تیز روشنی'' کے ساتھ یفعول کے وزن میں پایا جانے والا بلندی سے پستی کی طرف تیزی حرکت کا معنی ملا جائے تو معنی بنتا ہے ''ایسی تیز روشنی والا وجود جو بلندی سے زمین کی طرف غیر معمولی تیزی کے ساتھ آتا ہو''۔

تو کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ''یاجوج و ماجوج'' شدید روشنی کی حامل کوئی ایسی خلائی مخلوق ہے جو غیر معمولی رفتار کے ساتھ زمین کی طرف آکر اپنی حرارت اور روشنی سے تباہی مچایا کرتی تھی۔۔۔۔؟ دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے؟

لفظ یأجوج کی صرفی تحلیل واضح ہونے کے بعد سوال یہ ہے کہ جب أج یؤج فعل لازم ہے جیسا کہ ماقبل میں یفعول کی بحث میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے تو مأجوج مفعول کیونکر لایا گیا ہے، حالانکہ فعل لازم سے مفعول بنانے کے لئے اس کے بعد جار مجرور کا ہونا ضروری ہے؟۔۔۔۔۔۔ہاں بیشک یہاں بھی جار مجرور تھا؛ لیکن جب کسی قسم کا اشتباہ نہ ہو یا متعدی بحرف جار بصورت اسم استعمال ہو تو ایسی صورت میں جار مجرور کا حذف کرنا بھی درست ہے۔ جیسے حساب مَغْلُوط فیه کی بجائے حساب مَغْلُوط بولا جائے۔

هذا أمر مَنْدُوب إليه کی بجائے هذا أمر مَنْدُوب بولا جائے۔

من المتعَيَّن علیه حدوث السلام کی بجائے من المتعَيَّن حدوث السلام بولا جائے۔

طریق مُشْتَرَك فیه کی بجائے طریق مُشْتَرَك بولا جائے۔

ٹھیک اسی طرح یأجوج و مأجوج بھی اصل میں یأجوج و مأجوج به ہے، بصورت ''اسم واحد'' استعمال ہونے کی وجہ سے جار مجرور کو حذف کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ صیغہ کی لفظی و معنوی خصوصیت بھی بتلاتی ہے کہ یہاں پر ''به'' جار و مجرور محذوف ہونا چاہیے۔

مفعول بہ کا مطلب ہوتا ہے ''جس کے ذریعہ فعل واقع ہو''۔ تو ماجوج بہ کا معنی ہوگا ''ایسی چیز جس کے ساتھ یا اس کے ذریعہ تیز روشنی اور حرارت کا اخراج عمل میں آئے۔

تو کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ یاجوج و ماجوج دو قوم یا دو قبیلوں کے الگ الگ نام یا مذکر و مؤنث کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ یہ دونوں کسی ایک وجود سے الگ شدہ ایسے حصے ہیں جن میں سے ایک کے دوسرے سے ملنے پر تیز حرارت اور روشنی کا اخراج ہوتا ہے۔ جو حرارت و روشنی کا اخراج کرے اسے یاجوج اور جس کے ذریعہ یہ عمل وجود میں آئے اسے ماجوج بہ کہتے ہیں۔

یاجوج و ماجوج کے غیر منصرف ہونے کی وجہ؟

بعض حضرات نے یاجوج و ماجوج کو تانیث و علمیت کی بنا پر غیر منصرف گردانا ہے جبکہ دیگر حضرات نے اس کی وجہ عجمہ و علمیت کو قرار دیا ہے۔

وهما اسْمَان أَعْجَمِيَّان، جاءَت القراءَةُ فيهما بهَمْزٍ وغير هَمْز، و (مَنْ لا يَهْمِزُهُمَا) و (يجعل الأَلِفَيْنِ زَائِدَتَيْن) يقول: إِنَّهُما (من*! يَجَجَ *!ومَجَجَ)، وهما غير مصروفين. ------- ومن هَمَزَهُمَا قال: إِنَّهما من أَجَّتِ النَّارُ، ومن الماءِ الأُجَاجِ، وهو الشَّديدُ المُلُوحَةِ المُحْرِقُ من مُلُوحَتهِ، ويكون التَّقديرُ فى يَأْجُوجَ يَفْعُول، وفى مَأْجُوجَ مَفْعُول، كأَنَّه من أَجيج النَّارِ. قالوا: ويجوز أَن يكون يَاجُوج فاعولا، وكذالك ماجُوج، وهذا لو كان الاسمان عَرَبِيَّيْن لكان هذا اشتقاقَهما فأَمّا الأَعْجَمِيّةُ فلا تُشْتَقُّ من العَرَبيّة. تاج العروس ولسان العرب

إن يأجوج ومأجوج (قبيلتان من ولد يافث بن نوح وقيل يأجوج من الترك ومأجوج من الجيل وهما اسمان اعجميان بدليل منع الصرف وقيل عربيان من أج الظليم إذا أسرع واصلهما الهمز كما قرأ عاصم ومنع صرفهما للتعريف والتأنيث ۔ تفسير البيضاوى و تفسير مظهرى و تفسير ابى السعود

اگر یاجوج اور ماجوج دو الگ قبیلوں کے نام ہوتے یا دو الگ الگ صنف سے تعلق رکھنے والے ہوتے تو ایسی صورت میں ''إِنَّ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ'' جمع کے ساتھ استعمال ہونے کی بجائے ''مُفْسِدَانِ فِي الْأَرْضِ'' تثنیہ کے ساتھ استعمال ہونا چاہیے تھا۔

ہم لغوی وصرفی تحلیل کے ذریعہ دیکھ چکے ہیں کہ یہ الفاظ نہ عجمی ہیں اور نہ مؤنث اور نہ ہی ان کلمات کو کسی بھی طرح علم مانا جاسکتا ہے بلکہ یہ دونوں اسم بغیر

کسی نحوی ترکیب کے ایک اسم کے طور پر استعمال ہونے کی وجہ سے مرکب امتزاجی ہے۔اور مرکب امتزاجی ہونے کی وجہ سے ہی یہ غیر منصرف ہیں۔ یاجوج وماجوج اگر ترکیب نحوی کے ساتھ استعمال ہوتے تو ایسی صورت میں ساتھ میں جار مجرور بھی ہوتا۔

آخران دواسموں کومرکب امتزاجی کے طور پراستعمال کرنے کا مفاد کیا ہے ۔اگرغور کیا جائے تو یہ مرکب امتزاجی بہت سارے رازوں سے پردہ اٹھاتا نظر آتا ہے۔

ماقبل کی لغوی تحقیق سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یاجوج کے بنیادی معنی میں تیز روشنی اور حرارت کا مفہوم شامل ہے۔دوسری جانب 'یفعول' کے وزن نے اس میں تیز رفتاری اور بلندی کا معنی بھی شامل کردیا۔لہٰذا اب یاجوج کا معنی ہوگا ''تیز روشنی کا حامل ایسا وجود جو خلا سے تیز رفتاری کے ساتھ زمین پر آیا کرتا ہو ۔اور 'ماجوج بہ' کا مطلب ہوگا ''وہ چیز جس کے ذریعہ یاجوج زمین پر آکر روشنی کے ساتھ حرارت کا اخراج کرتے ہوں''۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس معنی کی تائید '' ینسلون ''اور ''فجمعناھم جمعا '' کے لفظوں سے بھی ہوتی ہے۔

گویا خلا سے آنے والی مخلوق کی پوری داستان ، ان کے طریقۂ واردات وغیرہ کو بیان کرنے والے چار الفاظ '' یاجوج و ماجوج بہ '' میں سے جار مجرور کو حذف کردینے پر یہ مرکب مرکب امتزاجی بنکر علم وصفی کے درجہ میں آجاتا ہے۔اوراسی وجہ سے یہ غیر منصرف لایا گیا ہے۔

یاجوج وماجوج کی ہیئت وحقیقت

یاجوج و ماجوج کے اصلی روپ ،قد وقامت اور شکل وصورت کے متعلق کوئی حتمی بات ابھی نہیں کی جاسکتی البتہ دلائل کی بنیاد پر اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ یاجوج و ماجوج ایک ایسی خلائی مخلوق ہے جو اپنے آپ کو مادی وجود کے سب سے چھوٹے اجزاء الیکٹرون اور پروٹوں جیسے ذرات میں بدلکر زمین پر آیا کرتے تھے ۔کیونکہ یاجوج و ماجوج کے وزن ،ترکیب اور غیر منصرف استعمال کے ذریعہ اس کے مخصوص معانی کی جانب توجہ مبذول کروائی جارہی ہے،اوراس میں پایا جانے والا تیز رفتاری کے علاوہ دونوں کے ملاپ کی صورت میں تیز روشنی اور شدت حرارت کے اخراج کا معنی اپنے کمال کے ساتھ الیکٹرون اور پروٹون جیسے باردار ذرات میں ہی پایا جاتا ہے۔۔۔۔۔اس کی مزید تفصیل کیا ہوسکتی ہے،اس کے لئے ہمیں ردم کے معنی پر غور کرنا ہوگا۔

یاجوج وماجوج کا فساد کیا تھا؟

قَالُوا يَاذَا الْقَرْنَيْنِ إِنَّ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلَى أَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿۹۴﴾

بین السدین رہنے والی قوم نے آخر کس چیز کو فساد سے تعبیر کیا تھا؟ چونکہ فساد کے معنی میں قتل کے علاوہ کاشت کو تباہ کرنے جیسی باتیں بھی شامل ہیں۔۔۔کیا یاجوج وماجوج لوگوں کے قتل کے علاوہ کاشت کو بھی تباہ کردیا کرتے تھے۔

اس سوال کا جواب ہمیں ''خرج'' سے ملتا ہے کہ افساد کا تعلق کاشت اور

فصلوں کی تباہی سے تھا۔

خرج اور خراج کے معنی پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ''خراج'' کا تعلق ماضی سے ہے جبکہ ''خرج'' کا تعلق مستقبل میں ہونے والی پیداوار سے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس قوم نے ذوالقرنین سے کہا تھا کہ یاجوج و ماجوج کی وجہ سے ہماری فصلیں تباہ ہوجاتی ہیں یا پیدا ہی نہیں ہوتیں، اگر آپ کسی سد کے ذریعہ انہیں روک دیں تو ہم اچھی طرح کاشت کر پائینگے، نتیجتاً حاصل ہونے والی پیداوار کا ایک حصہ ہم آپ کو مستقل طور پر دیا کرینگے۔

اس طرح یاجوج و ماجوج میں بتلائے گئے حقیقی معنی کی ایک بار پھر تائید ہوتی نظر آرہی ہے کہ حرارت والی تیز روشنی کے حامل یاجوج و ماجوج اپنے اثر سے فصلیں خشک کر دیتے تھے۔ یا تو فصلیں اگتی ہی نہیں تھیں یا اگنے کے بعد ان کے اثر سے خشک ہوجایا کرتی تھیں۔

ایک سوال

یہاں کسی کو یہ سوال ہوسکتا ہے کہ جب 'یاجوج و ماجوج' انسان نہیں بلکہ کوئی اور مخلوق ہے تو ان کے لئے ضمیر ذوی العقول استعمال کرتے ہوئے انہیں مفسدون فی الأرض کیوں کہا گیا ہے ؟

اولاً تو ضمیر ذوی العقول کے لیے انسان کا ہونا ضروری نہیں بلکہ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ یاجوج و ماجوج کسی سماء یعنی سیارے پر رہنے والی کوئی مکلف مخلوق ہو جیسا کہ قرآن بار بار سماوی مخلوق کا تذکرہ کرتا ہے۔ لہٰذا انہیں ضمیر ذوی العقول

سے تعبیر کرنا عین قیاس ہے۔

جہاں تک سوال ہے انہیں مفسدون فی الأرض سے تعبیر کرنے کا تو بلاشبہ یاجوج و ماجوج انسانوں کے لئے نقصاندہ مخلوق ضرور ہے؛ لیکن ان پر فی الحال مفسد ہونے کا حکم نہیں لگایا جاسکتا چونکہ قرآن میں یا جوج و ماجوج کو ''مفسدون فی الأرض'' جو کہا گیا ہے وہ دراصل حکایتاً عن القوم ہے۔ یعنی بین السدین رہنے والی قوم نے اپنے خیال سے انہیں مفسدون فی الأرض کہا تھا، اللہ تعالیٰ نے نہیں۔ یاجوج و ماجوج کا خروج درحقیقت انسانوں کے لئے عذاب ہے اور عذاب کو افساد سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔

تعمیر ردم کہاں اور کیسے؟

سد اور ردم میں بنیادی فرق

سد کے متعلق ماقبل میں وضاحت ہوچکی ہے کہ سد ہر اس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو برتن، راستہ، سوراخ اور منفذ کو بند کردے، یا کسی کے لئے مانع بن جائے (چاہے یہ مانع بننا آمد ورفت سے متعلق ہو، چاہے دخول وخروج سے یا پھر آر پار دیکھنے سے)۔ سد الاناء: برتن ڈھانپنا۔ سد الثلمة: سوراخ یا شگاف بند کرنا۔ سد الباب: دروازہ بند کرنا۔ سد الطریق: راستہ روکنا۔ سد القناة: نہر وغیرہ پر ڈیم بنانا۔

جبکہ ردم کے معنی میں ما جُعِلَ بعضُه علی بَعْضٍ کے مفہوم کو بنیادی

اہمیت حاصل ہے۔ مثلاً ردم الثوب: کپڑے کو اوپر تلے پیوند لگانا۔ ردم الباب: اندر باہر دونوں دروازے بند کرنا۔ ردم السحاب: بادلوں کا تہ بتہ ہونا۔ ردمت الحمی: بخار کا باری باری آتے رہنا۔ ثوب مردم و مرتدم: اوپر تلے پیوند لگا کپڑا۔ تردم القوم الارض: زمین کی پیداوار کو بار بار کاٹنا۔ ردم الشجر: درخت کا سوکھنے کے بعد دوبارہ ہرا بھرا ہو جانا۔

ر د م : رَدَمَ البَابَ والثُّلْمَةَ ونَحْوَهُما يَرْدِمُهما رَدْماً : سَدَّهُ ، وقِيلَ : الرَّدْمُ أكثُر من السَّدِّ ؛ لأنّ الرَّدْمَ : ما جُعِلَ بعضُه على بَعْضٍ ، والاسمُ الرَّدْمُ ، وجمعُه رُدُومٌ . والرَّدْمُ : السَّدُّ الذى بَيْنَنا وبَيْنَ يَأْجُوجَ ومَأْجُوجَ. وفى التنزيل : (أَجْعَلُ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْماً) (الكهف : ۹۵). والرَّدْمُ : ما يَسْقُطُ من الجِدارِ إذا انْهَدَمَ . وكُلُّ ما لُفِّقَ بعضُه ببعضٍ فقَدْ رُدِمَ . وثَوْبٌ مُرَدَّمٌ ، ومُرْتَدَمٌ ، ومُتَرَدَّمٌ : خَلَقٌ مُرَقَّعٌ ، قالَ : (هَلْ غادَرَ الشُّعَراءُ مِنْ مُتَرَدَّمِ) أى : من كَلامٍ يُلْصَقُ بعضُه بَبعْض ويُلَفَّقُ ، أَى : قد سُبِقُونَا إلى القَوْلِ ، فلم يَدَعُوا مَقالاً لقائِلٍ . وتَرَدَّمَتِ النَّاقَةُ : عَطَفَتْ على وَلَدِها . وتَرَدَّمَ القَوْمُ الأرْضَ : أَكَلُوا مَرْتَعِها مَرَّةً بعدَ مَرَّةٍ . وأَرْدَمَتْ عليه الحُمَّى ، وهى مُرْدِمٌ : دامَتْ . وأَرْدَمَ عليه المَرَضُ : لَزِمَه . المحكم و المحيط الاعظم

سد اور ردم میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ردم تہہ بتہ یا اوپر تلے ہو کر بنتی ہے جبکہ سد یک طرفہ آڑ ہوتی ہے۔۔۔۔ کسی شگاف، مخرج اور منفذ کو کسی ایک طرف سے بند کرنے پر 'سد' کا استعمال ہوگا؛ لیکن جب کسی شگاف یا سوراخ کو دونوں

طرف سے بند کر دیا جائے تو اس وقت ''ردم'' استعمال کیا جائیگا۔۔۔ردم الثوب: اوپر نیچے دونوں طرف سے پیوند لگانا۔ جب ''ردم'' کا استعمال ''سد'' کی طرح کسی چیز کو روکنے کے معنی میں ہوگا تو اس وقت اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی چیز کو دو طرفہ یا تہہ بتہہ روک کے ذریعہ اس طرح مقید کر دیا جائے کہ وہ اندر باہر یا اوپر نیچے کسی طرف سے بھی نکل نہ سکے۔

سد اور ردم کے درمیان فرق کی اس وضاحت کے بعد یہ بات سمجھنی آسان ہوجاتی ہے کہ دو پہاڑوں کے درمیان لوہے کو گرم سرخ کر کے اس پر پگھلا تانبہ ڈالنے سے دیوار کی طرح جو شکل وجود میں آئے اس پر سد کا اطلاق تو ہوسکتا ہے؛ لیکن ردم کا نہیں، لہٰذا ردم کوئی ایسی چیز ہے جس سے کسی منفذ، شگاف یا راستہ کو دو طرفہ یا تہہ بتہہ روک کے ذریعہ اس طرح بند کر دیا گیا ہے کہ اس کی وجہ سے یاجوج و ماجوج وہاں آکر اس میں اس طرح پھنس جاتے ہیں کہ وہاں سے کسی بھی طرف نکل نہیں سکتے۔۔۔۔۔چلو دیکھتے ہیں کہ ذوالقرنین نے یہ ردم کس طرح اور کہاں بنائی ہے؟

تعمیر ردم

آتُونِي زُبَرَ الْحَدِيدِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا سَاوَىٰ بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انفُخُوا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَعَلَهُ نَارًا قَالَ آتُونِي أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ﴿٩٦﴾ فَمَا اسْطَاعُوا أَن يَظْهَرُوهُ وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا ﴿٩٧﴾

زُبَرَ الْحَدِيدِ:

''زُبَر'' زبرۃ کی جمع ہے۔لوہے اور پتھر جیسی مضبوط اور ٹھوس چیز سے بنے لمبے چوڑے تختوں کے لئے بولا جاتا ہے۔زبرۃ کے معنی میں مضبوطی اور لمبائی، چوڑائی کا معنی پایا جاتا ہے۔جیسے الزبیر : چوڑے سینے والا طاقتور مرد۔ الازبر : چوڑے کندھوں والا مرد۔

زُبَرَ الْحَدِیدِ کا معنی ہوگا : لوہے کے لمبے چوڑے اور مضبوط تختے (Iron Plates)۔

سَاوَی بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ :

سَاوَی: یساوی مساواۃ (فعل لازم) کسی کے ہم پلہ ہونا، برابری کرنا، ایک دوسرے کے متوازی ہونا، ہموار ہونا۔ ساوی فلان قرنہ، ساوی بہ فی العلم۔

''ساوی''، فعل لازم ہے؛ لیکن اس کے بعد ظرف واقع ہونے کی وجہ سے وہ فعل متعدی کا معنی دے گا: ساوی زبر الحدید بین الصدفین (اس نے لوہے کی پلیٹیں ایک دوسرے کے مساوی نصب کردی)

اس طرح ساوی، یساوی نے اس بات کی مزید وضاحت کردی کہ ''زبر الحدید'' سے مراد لوہے کے ایسے چورسے ہیں جو لمبائی چوڑائی میں ایک جیسے ہوں۔

الصَّدَفَیْن:

الصُّدُوفُ: المَیْلُ عن الشیء

وأَصْدَفَنی عنه کذا و کذا أَأَمالَنی

ابن سیدہ: صَدَفَ عنه یَصْدِفُ صَدْفاً وصُدُوفاً: عَدَلَ وأَصْدَفَه عنه: عَدَل به، وصَدَفَ عنی أَی أَعْرَضَ

أَبو عبید: صَدَفَ ونکَبَ إذا عَدلَ؛ وقیل فی قول الأَعشی ولقد ساءها البیاض فَلَطَّت بِحِجابٍ، من بَیْنِنا، مَصْدُوف أَی بمعنی مَسْتُور ویقال: امرأَة صَدُوفٌ للتی تَعْرِضُ وجهها علیك ثم تَصْدِفُ

والصَّدَفُ: عَوَجٌ فی الیدین، وقیل: مَیَلٌ فی الحافر إلی الجان الوحْشِیّ، وقیل: هو أَن یَمِیل خُفُّ البعیر من الید أَو الرجل إلی الجان الوحشی، وقیل: الصَّدَفُ مَیل فی القدم؛ قال الأَصمعی: لا أَدری أَعن یمن أَو شمال، وقیل: هو إقْبالُ إحدی الرُّکْبَتین علی الأُخری، وقیل: هو ف الخیل خاصّة إقْبالُ إحداهما علی الأُخری، وقد صَدِفَ صَدَفاً، فإن مال إلی الجانب الإنسیّ، فهو القَفَدُ، وقد قَفِدَ قَفَداً، وقیل: الصَّدَف تَدانی

العُجايَتَين وتباعُدُ الحافرين فى التِواءٍ من الرُّسْغَينِ وهو من عيوب الخيل التى تكون خِلْقةً، وقد صَدِفَ صَدَفاً، وهو أَصْدَفُ الجوهرى: فرس أَصْدَفُ بَيِّنُ الصَّدَفِ إذا كان مُتَدانىَ الفَخْذى مُتَباعِد الحافرين فى التواء من الرسغين۔ لسان العرب

الصدف: لغت کی کتابوں میں ''صدف'' کے بہت سارے معانی لکھے ہوئے ہیں: سیپ، ہر بلند چیز جیسے دیوار، پہاڑ وغیرہ، گوشہ، سمندر کی موجیں، صدفا الجبل : پہاڑ کے دو متقابل کنارے ۔

آیئے اس کے اصل معنی کو دیکھتے ہیں۔

صدف یصدف صدفا و صدوفا ، صدف عنه : ہٹنا، باز رہنا، پھر جانا، اعراض کرنا۔ صدف فلانا عن الشیئ صدفا : روکنا، باز رکھنا، ہٹانا، پھیرنا۔

تصدف له : رکاوٹ بننا، آڑے آنا۔

تصادفا : اچانک آمنے سامنے آجانا۔ (یعنی چلتے ہوئے دو لوگوں کا اس طرح آمنے سامنے ہوجانا کہ راہ موڑ لینے کی ضرورت پیش آجائے)

المصدوف: ممنوع۔ یعنی جس کے پاس آئے شخص کو لوٹا دیا جائے۔

الغرض صدف کے اصل معنی میں ایک بات بنیادی اہمیت رکھتی ہے، وہ ہے ''کسی چیز سے راستہ موڑ لینا یا راستہ مڑ جانا''۔

الحاصل فعل متعدی ہونے کی صورت میں ''صدف'' کا معنی ہوگا ''دو چیزوں میں سے ایک کا دوسرے کو راستہ موڑ کر کر واپس کر دینا۔۔۔اور فعل لازم

کا معنی کرنے کی صورت میں اس کا معنی ہوگا ''دو چیزوں میں سے ایک کا دوسرے سے راستہ موڑ لینا۔

اس فعلی معنی کے علاوہ ''صدف'' کا اطلاق ایسی دو چیزوں پر بھی ہوتا ہے جو کمانی یا گول کٹوری کی شکل میں ہوں۔ مثلاً ٹیڑھے ہاتھ، ٹیڑھے پاؤں، دونوں کانوں کا خلا، دونوں رانوں میں گٹکا جوڑنے کی کٹوری نما گول گڑھے جیسی جگہ، موتی کی چھیپ۔

یاد رہے کہ کسی ایک ٹیڑھی چیز کے لئے صدف کا استعمال نہیں ہوگا بلکہ جب ایک جنس کی دو کمانی یا کٹوری نما چیزیں آمنے سامنے ہوں تبھی ان پر بصورت تثنیہ ''صدفین'' کا اطلاق کیا جائیگا۔

لیکن صدف کے فعلی معنی موڑنے یا مڑ جانے میں اور دو ٹیڑھی چیزوں پر تثنیہ کی صورت میں ''صدفین'' کے استعمال کے درمیان کیا تعلق ہے؟

دراصل جس طرح صادف مصدوف عنہ سے ملاصق نہیں ہوتا اور قبول کئے بغیر یا ملے بغیر مڑ جاتا ہے اسی طرح ایسی کمانی یا کٹوری نما دو چیزوں پر بھی صدفین بولا جاتا ہے جو اپنے ٹیڑھے پن کی وجہ سے یا درمیان میں کسی حائل کی وجہ سے آپس میں ملنے نہ پائیں۔

تو کیا زیر بحث آیت میں بھی ''الصدفین'' سے ایسی ہی کمانی یا کٹوری نما دو چیزیں مراد ہیں جو اپنے ٹیڑھے پن کی وجہ سے آپس میں ملنے نہ پائیں؟

اس سوال کے جواب سے پہلے یہ دیکھ لیتے ہیں کہ الصدفین معرف باللام

کیوں ہے؟

ماقبل میں عہد ذہنی یا خارجی کسی طرح صدفین کا کوئی تذکرہ نہیں تو پھر ''الصدفین'' معرف باللام کیوں ہے ؟

کبھی کسی چیز کا ماقبل میں عہد ذہنی یا خارجی کسی طرح کوئی ذکر نہیں ہوتا لیکن پھر بھی اسے معرف باللام لایا جاتا ہے، اس کی وجہ اس کی مخصوص صفت میں مزید تاکید اور مبالغہ کی طرف توجہ دلانی مقصود ہوتی ہے۔ جیسے قاتله الرجل: اس کا مقابلہ ایک بہادر مرد نے کیا۔ الطلاق مرتان: میاں بیوی کے درمیان مخصوص قسم کی جدائی۔

جس طرح اول الذکر مثال میں ''الرجل'' سے المرأۃ کا مقابل بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ اس میں موجود بہادری کو بتلانا ہے۔ اسی طرح ''الطلاق'' سے لغوی جدائی یا عرفی طلاق مراد نہیں بلکہ میاں بیوی کے درمیان ایک مخصوص طریقہ پر ہونے والی مخصوص درجہ کی جدائی مراد ہے، اسی طرح ''الصدفین'' تثنیہ کے ذریعہ محض اس کی ظاہری ہیئت میں ٹیڑھ ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے ملاصق نہ ہونے کو

بیان نہیں کیا جارہا بلکہ اس تعریف باللام کے ذریعہ اسکے صفتی معنی (یعنی کسی کو اپنے قریب نہ آنے دینا یا راستہ موڑ دینا یا دھکا دینا) میں مخصوص قسم کی اضافی خاصیت کی جانب اشارہ کیا جارہا ہے۔

اب بصورت تثنیہ ''صدفین'' کو معرف باللام بیان کر کے اس کے صفتی معنی کی اضافی خاصیت بتلانے کا مطلب یہ ہوگا کہ ''الصدفین'' سے مراد کوئی ایسی دو چیزیں ہیں جو اپنی طبیعی خصوصیت کی بنا پر ایک دوسرے سے ملنے نہ پائیں بلکہ ایک دوسرے کو دور دھکیل دے۔

مادی چیزوں میں اس وصف کی حامل اگر کوئی چیز ہے تو وہ ہے مقناطیس۔ چنانچہ ہر مقناطیس دو قطبہ ہوتا ہے۔ ایک طرف قطب شمالی ہوتا ہے تو دوسری جانب قطب جنوبی۔ جب دو مقناطیس کو مخالف قطب سے ملایا جائے تو وہ آپس میں چپک جاتے ہیں؛ لیکن جب ایک جیسے قطب کی طرف سے ملانے کی کوشش کی جائے تو وہ آپس میں چپکنے کی بجائے ایک دوسرے کو دھکا دیتے ہوئے مڑ جاتے ہیں۔

الغرض زیر بحث آیت میں ''الصدفین'' مراد دو مقناطیس ہیں۔۔۔ اب مقناطیسی معنی میں اضافی خاصیت دو ایک جیسے قطب کو آمنے سامنے رکھ حاصل کی جارہی ہے یا الطلاق مرتان کی طرح ان کا وہ مخصوص معنی مراد ہے جو ان کے بیچ ''زبر الحدید'' یعنی لوہے کی پلیٹوں کو رکھنے کی صورت میں ظاہر ہو۔۔۔ بالفاظ دیگر یہاں صدفین یعنی مقناطیس کا کام کیا ہے؟ کیا دو مقناطیس کا آپس میں تعامل مراد ہے یا لوہے کی پلیٹوں کے ساتھ کسی ردعمل کو بتلانا مقصود ہے یا ان کا عمل کسی اور چیز

پر ظاہر ہو رہا ہے۔۔۔۔بہر صورت یہاں الف لام تعریف کے ذریعہ صدفین میں موجود مقناطیسی معنی میں اضافی خاصیت مراد ہے، چاہے وہ ''صدفین'' کی مخصوص شکل وصورت کے ذریعہ حاصل ہو یا ان کی کثافت وغیرہ کے ذریعہ۔

ساوی زبر الحدید بین الصدفین : لوہے کی پلیٹیں دو مقناطیس کے درمیان ایک دوسرے کے مساوی نصب کر دی۔

یہاں ذرا توجہ چاہونگا :'' لوہے کے تختے دو مقناطیس کے درمیان برابر کر دئے گئے'' یہ ترجمہ نہیں ہوگا، بلکہ درست ترجمہ اس طرح ہوگا: لوہے کی پلیٹیں دو مقناطیس کے درمیان ایک دوسرے کے متوازی نصب کی گئیں۔

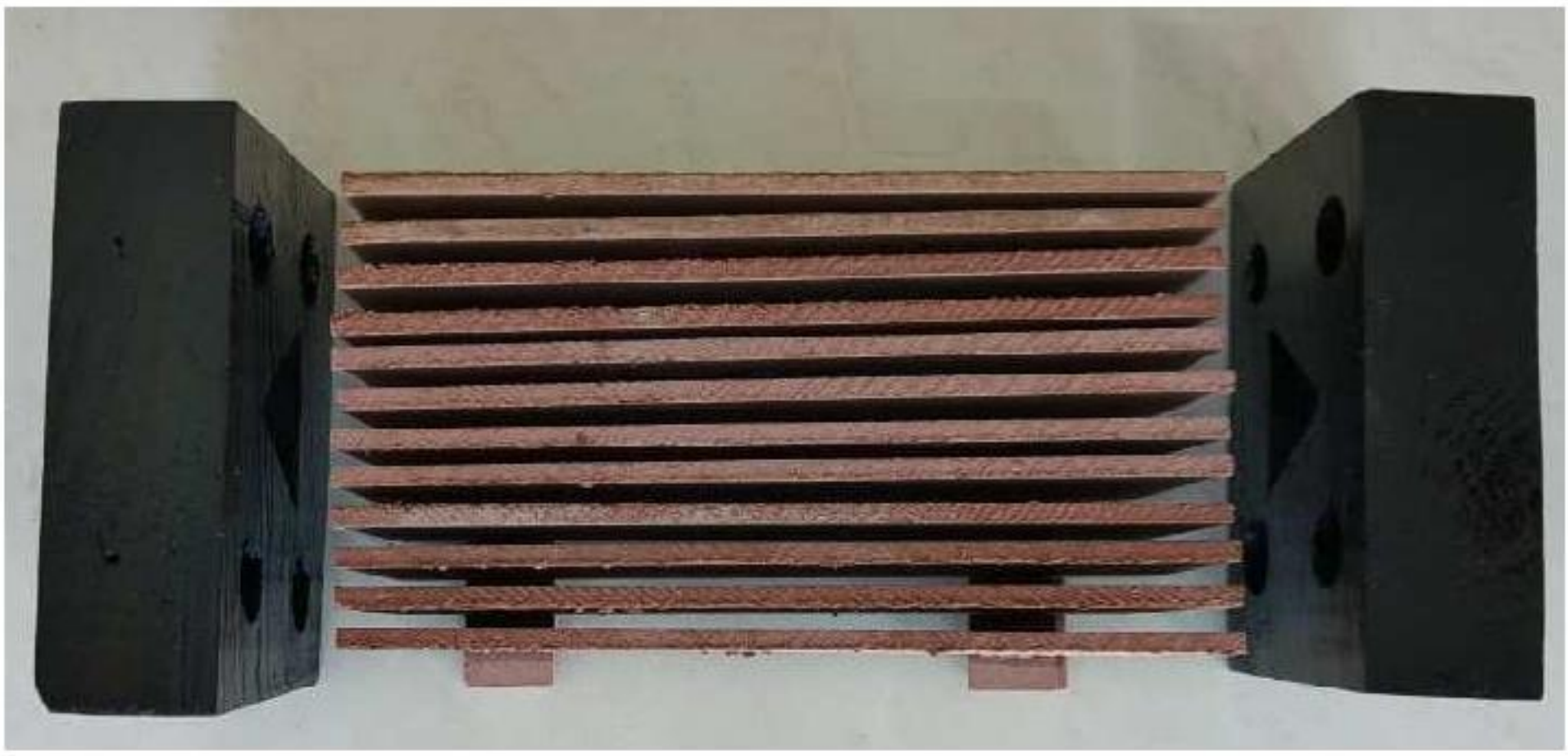

انْفُخُوا :

سبھی مفسرین نے اگلے لفظ ''جَعَلَهُ نَارًا'' کے پیش نظر ''انْفُخُوا'' کو ''انفخوا فی النار'' یعنی آگ دھونکنے کے معنی میں بیان کیا ہے۔لیکن کیا واقعتاً اس سے مراد آگ دھونکنا ہی ہے یا کچھ اور؟ آیئے پہلے ''نفخ'' کا صحیح مفہوم سمجھ لیتے ہیں۔

نفخ ینفخ نفخا (نصر ینصر) نفخ بفمه : منہ سے پھونک مارنا، نفخ فی

البوق: سنکھ بجانا، نفخ فی النار (بالمنفاخ) دھونکنی سے آگ بھڑکانا۔

نفخ کے معنی میں ''ہوا پھونکنے یا بھرنے'' کا معنی پایا جاتا ہے۔

نفخ کبھی بغیر صلہ کے براہ راست مفعول بہ پر داخل ہوتا ہے تو کبھی ''حرف جار فی'' کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ جب براہ راست مفعول بہ پر داخل ہو تو ''ہوا بھر کر کسی چیز کو اپنے حجم سے بڑا کرنے'' کا معنی دیتا ہے۔ جیسے

نفَخ الشّیءَ: ملأہ بالھواء

نفَخ الشّیءَ: کبّرہ، غذّاہ وأشعلہ

نفَخ الطّعامُ الشّخصَ: أنتج فی جوفہ غازاتٍ ملأت أحشاءَہ

نفَخ شدقَیہ/نفَخ نفسَہ: تغطرس، تعظّم وتکبّر

النَّفَخُ : وَرَمٌ یکون فی أَرساغ الدّابّة، فإذا مَشَتْ انفشَّ، النَّفَخُ داءٌ یُصیب الخُصْیَتین تَرِمان منہ۔

لیکن جب ''نفخ''، ''فی'' کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو اس وقت وہ ''کسی جامد، سست یا بے جان چیز کو ایسے کام کے لئے متحرک کر دینے سے استعارہ ہوتا ہے جس کی اس میں طبیعی صلاحیت موجود ہو۔ جیسے

نفَخ فی الشَّیءِ: ھیّجہ، حرّکہ۔

نَفَخَ فی النَّارَ: جعلھا مُشْتَعِلاً مُلْتَھِباً.

نفَخ ھواءً فی رئتی غریق: بعث فیھما الھواءَ لیفیق

نفَخ فی البوق: بعث فیہ ریحًا بقوّة لیُحدث صوتًا

نفَخ فیہ من الرُّوح: أوجد فیہ الحیاة

أَنِّي أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ... ﴿۴۹ آل عمران﴾

فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ ﴿۲۹ الحجر﴾

وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِن رُّوحِنَا وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا آيَةً لِّلْعَالَمِينَ ﴿۹۱ الأنبياء﴾

مذکورہ تمام مثالوں کو دیکھیں ! ان تمام میں نفخ کا مطلب ہے : ان چیزوں میں پوشیدہ طبیعی صلاحیتوں کو تحریک دیکر کام میں لگا دینا۔

بجھتی جارہی آگ کو دوبارہ مشتعل کرنا۔

خاموش سنکھ کو بجتا کرنا۔

رحم مادر میں روح پھونکنے کا مطلب یہی ہوگا کہ اس کی طبیعی صلاحیت کو تحریک دیکر اس میں بچے کی پرورش شروع کرنا۔

انسانی جسم میں روح پھونکنے کا مطلب ہوگا ایک جامد مگر زندگی کے قابل ڈھانچے میں زندگی پیدا کرنا۔

نفخ کا یہی معنی مذکورہ ذیل کہاوتوں میں بھی بطور استعارہ استعمال کیا گیا ہے:

لا تنفخ فی رماد: لا تنصح جاهلاً أو أحمق۔ یعنی جس میں اچھائی قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہیں اسے نصیحت کرنے کا کیا مطلب۔

ینفخ فی قربة مقطوعة: یعالج أمرًا لا طائلَ منه۔ یعنی ایسی جگہ کوشش نہیں کرنی چاہیے جس میں مطلوبہ نتیجہ پیدا کرنے کی اہلیت ہی نہ ہو۔

الغرض ''نفخ فی الشئ'' کسی بھی مفرد یا مرکب میں موجود طبیعی صلاحیت کو تحریک دینے کا نام ہے۔

تو اب سوال یہ ہے کہ ''الصدفین اور اور زبر الحدید'' کو ایک ترتیب سے رکھ کر ان میں عمل نفخ کے ذریعہ کونسی طبیعی قوت کو متحرک کرنے کی بات کہی جارہی ہے، اور اس تحریک کے نتیجہ میں کونسا ردعمل ظاہر ہوتا ہے؟ ۔۔۔۔اسی کو اگلے جملہ میں ''جَعَلَهُ نَارًا'' سے بیان کیا جارہا ہے۔

جَعَلَهُ نَارًا :

عرب وعجم کے تمام مفسرین نے بیک زبان ''انفخوا'' کو ''انفخوا النار'' کے مفہوم میں بیان کرتے ہوئے بالاتفاق ''جَعَلَهُ نَارًا'' کا ترجمہ کیا ہے وہ کچھ اس طرح ہے کہ جب پہاڑوں کی دونوں چوٹیوں تک لوہے کی چادریں پاٹ دی گئیں تو اس پر لکڑی اور کوئلہ دہکایا گیا حتی کہ جب لوہا آگ کی طرح سرخ ہوگیا تو اس پر پگھلا تانبہ ڈالکر اس قدر سخت اور چکنی دیوار بنادی گئی کہ یاجوج وماجوج کے لئے ان پر چڑھنا یا اس میں نقب لگانا ناممکن ہوگیا۔

لیکن سیاق کلام واضح طور پر بتلاتا ہے کہ ''انفخوا'' کا مفعول بہ ''الصدفین اور زبر الحدید'' ہے۔لہٰذا ''النار'' وغیرہ کسی دیگر چیز کو مقدر ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

نیز ''ساوی'' اور ''افرغ علیہ قطرا'' کے الفاظ بتلا رہے ہیں کہ لوہے کی پلیٹوں کو پاٹا نہیں گیا تھا بلکہ کسی قدر فاصلہ سے ایک دوسرے کے مساوی نصب کیا

گیا تھا، اگر اس قسم کی ٹھوس دیوار بنانی ہی مقصود ہوتی تو لوہے کی ایک جیسی پلیٹوں کو صدفین کے درمیان ایک دوسرے کے مساوی نصب کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی!

لہٰذا اب سوال یہ ہے کہ لوہے کے نار بننے کا مطلب کیا ہے؟

''نار'' یا ''النار'' کا لفظ قرآن میں ۱۴۵ مرتبہ آیا ہے جبکہ اس کے دیگر مشتقات نور اور منیر کو ملایا جائے تو اس کی تعداد ۱۹۴ بنتی ہے۔

''نار'' کا لفظ بولتے ہی لکڑی، کوئلہ یا گیس کے جلنے سے اٹھتے شعلے ہماری نظروں کے سامنے آجاتے ہیں؛ لیکن ''نار'' کا ترجمہ محض آگ اور فائر (Fire) سے کرنا ایک بڑی غلط فہمی ہے، بلکہ جس طرح لکڑی اور کوئلہ وغیرہ سے حرارت و روشنی کے ساتھ نکلنے والی مرئی آگ کے کے لیے ''نار'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اسی طرح ایسے ایٹمی یا نیم ایٹمی مادے پر بھی نار کا اطلاق کیا گیا ہے جس سے خارج ہونے والی غیر مرئی توانائی کسی چیز کو جلانے کا سبب بن سکتی ہو۔ مثلاً

فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ﴿۲۶۶ البقرۃ﴾

إِعْصَار : تیز ہوا، بگولہ۔ موسم گرماں کی شدت میں تیز گرمی کی حامل جو ہوائیں کاشت کو جھلسا کر جلا دیتی ہیں، ایسی ہوا کو قرآن نے ''إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ'' سے تعبیر کیا ہے۔۔۔ ملاحظہ فرمائیں! اعصار میں موجود ''نار'' آگ کے شعلوں کی طرح مرئی نہیں ہوتی، بلکہ سورج کی شعاعوں کی وجہ سے پیدا شدہ ایسی حرارت کو نار کہا گیا ہے جو کاشت کو جھلسا دیتی ہو۔

اسی طرح نار جہنم سے بھی اسی قسم کی آگ مراد لی جاتی ہے جس سے شعلے اور لپٹیں نکلتی ہوں؛ لیکن حیرت کی بات ہے کہ قرآن میں عذاب جہنم کو بیان کرنے والی ایک بھی جگہ ایسی نہیں جہاں نار کا لفظ جلانے والی کسی مرئی آگ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہو۔ آپ غور کرینگے تو پتہ چلیگا کہ جہاں کہیں ''نار'' کا لفظ آیا ہے، وہاں ایسی حرارت ہی مراد ہے جو جلانے کے بجائے زیادہ سے زیادہ جھلسانے کا کام کرتی ہے۔

.... قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا ۚ لَّوْ كَانُوا يَفْقَهُونَ ﴿۸۱ التوبة﴾

الغرض جس طرح مرئی آگ کو نار کہا جاتا ہے اسی طرح قرآن نے ان نیم ایٹمی اور ایٹمی ذرات کو بھی نار کہا ہے جن میں حرکت کی وجہ سے اس قدر تپش پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ دوسری چیزوں کو جلانے کا سبب بن سکے۔

سالماتی سطح پر پیدا ہونے والی مرئی آگ کی مثال

الَّذِي جَعَلَ لَكُم مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنتُم مِّنْهُ تُوقِدُونَ ﴿۸۰ یس﴾

أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ﴿۷۱ الواقعة﴾

إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِأَهْلِهِ إِنِّي آنَسْتُ نَارًا سَآتِيكُم مِّنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ آتِيكُم بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ ﴿۷ النمل﴾

جوہری سطح پر پیدا ہونی والی حرارت کی مثال

قَالَ مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ ۖ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ ﴿۱۲ الأعراف﴾

وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ مِن نَّارِ السَّمُومِ ﴿۲۷ الحجر﴾

وَخَلَقَ الْجَانَّ مِن مَّارِجٍ مِّن نَّارٍ ﴿۱۵ الرحمن﴾

جنات کی تخلیق واضح کرتی ان آیات سے عام طور پر لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ جنات کی تخلیق اس آگ کی لپٹ سے عمل میں آئی ہے جس کا ہم لکڑی وغیرہ جلا کر مشاہدہ کرتے ہیں۔لیکن مؤخر الذکر دو آیتوں میں نار کی صفت ''مارج'' اور السموم'' سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ یہاں نار سے مراد کیمیائی توانائی نہیں بلکہ جوہری توانائی ہے۔

وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَارِ السَّمُومِ ﴿۲۷ الحجر﴾

سمت الریح : ہوا کا جھلسا دینا۔ السموم : جسم کے اندر گھس جانے والی شدید گرمی۔سم الابرۃ ونحوہ: سوئی وغیرہ کا سوراخ بنانا۔سم الثقب : سوراخ میں گھسنا۔سم الامر: کسی معاملہ کی گہرائی میں جانا۔

وقد سمه، أي: دخل فيه، ومنه: السامة (في اللسان: والسامة: الخاصة، يقال: كيف السامة والعامة؟) للخاصة الذين يقال لهم: الدخلل (انظر: البصائر)، الذين يتداخلون في بواطن الأمر۔

السامة : مرکزی حیثیت کے حامل خاص لوگ جن کے ہاتھ میں اہم معاملات کا اختیار ہوتا ہے۔

السموم : یہ صفت مشبہ کا صیغہ ہے، جس کا معنی ہوگا انتہائی مرکز میں رہنے والا۔ النار السموم یعنی ایسی توانائی جس کا مقام بالکل درمیان میں ہو، اسی کو جوہری توانائی کہتے ہیں۔

وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَارِجٍ مِنْ نَارٍ ﴿۱۵ الرحمن﴾

المارج : مرج الخاتم فی أصبعی انگوٹھی انگلی میں اتر گئی ۔المرج : چراگاہ میں بے روک یا بے نگراں چرنے والے اونٹ ۔المرّاج: جھوٹا یعنی ایسا شخص جو کسی کے بارے میں آزادانہ کچھ بھی بولتا رہے۔رجل مارج: آزاد آدمی جس پر کوئی لگام نہ ہو۔

مذکورہ مثالوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل ''مرج'' کا معنی بھی کسی چیز کے مرکز تک رسائی کا ہے۔چنانچہ مارج من نار کا مطلب ہوگا ایسی توانائی جس کا مقام کسی چیز کے مرکز میں ہو۔اسی کو جوہری توانائی کہتے ہیں۔

ایٹمی سطح پر پیدا شدہ ''نار'' کے لیے جس طرح ''اعصار'' اور ''تخلیق جن'' کی مثالیں موجود ہیں اسی طرح نار کا لفظ ''کائناتی اشعاع'' کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے۔اس پر سورہ رحمٰن کی مذکورہ ذیل آیتیں اور سورۂ سبا کی آیت نمبر ۱۲ بھی دلالت کرتی ہے۔

يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالإِنسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَن تَنفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ فَانفُذُوا لا تَنفُذُونَ إِلاَّ بِسُلْطَانٍ ﴿۳۳﴾ فَبِأَيِّ آلاء رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿۳۴﴾ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّن نَّارٍ وَنُحَاسٌ فَلا تَنتَصِرَانِ ﴿۳۵۱﴾﴿الرحمن﴾

اے گروہ جن وانس اگر تم اجرام سماوی اور زمین کی منظم دنیا کو چھید کر پار ہو سکتے ہو تو نکل دیکھو، چھید کر نہیں نکل پاؤ گے مگر (اسی منظم دنیا) کے انتظام کے سہارے۔

۔۔۔تم پر آگ کی شعائیں اور بھڑکاؤ جوہر کی اس طرح بوچھار کی جائے گی کہ تم مدد بھی نہیں مانگ پاؤ گے۔

الشواظ : شواظ: لهب من نار لا دخان له. و قيل: اللهب الأخضر المنقطع من النار. و قيل: الدخان الذى لا لهب فيه. و قيل: الدخان الذى يخرج من اللهب. و الشواظ فى الأصل: اللهب و حر النار و حر الشمس.

بغیر دھوئیں کا شعلہ، آگ یا دھوپ کی گرمی۔

آپ غور کر سکتے ہیں کہ اہل معاجم نے صدیوں پہلے غیر سائنسی دور میں ''شواظ من نار'' کا جو معنی بیان کرنے کی کوشش کی ہے وہ ٹھیک وہی چیز ہے جسے موجودہ اصطلاح میں ہم حرارت وتوانائی کے ساتھ تیز شعاؤں کا اخراج یا تابکاری کہتے ہیں۔اسی طرح انہوں نے نحاس کے بھی کچھ اس طرح مختلف معانی بیان کئے ہیں: بے شعلہ دھواں، تانبا، آگ، لوہے وغیرہ کو کوٹتے وقت جھڑنے والی چنگاری، طبیعت، ہر چیز کی اصل، جوہر۔نحاس کے ان معانی میں موجود قدر مشترک معنی پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ''نحاس'' کوئی ایسا جوہر ہے جو چنگاری کا کام کرتا ہے۔

اہل معاجم نے شواظ کا معنی ''بے دود شعلہ'' اور نحاس کا ''بے شعلہ دھواں'' کر کے حیرت انگیز طور پر ان کی خاصیت آشکارا کر دی ہے۔اب سائنسی اصول کے مطابق اس طرح دو چیزیں ملنے پر کس قسم کی توانائی کا اخراج عمل میں آتا ہے اسے سمجھنے کے لئے ''نحاس'' اور ''شواظ من نار'' کے ساتھ ''یرسل اور

فلا تنتصران ''کو ملا کر دیکھتے ہیں۔

یرسل (چھوڑنا، بوچھار کرنا) کے لفظ پر غور فرمائیں، کیا اس آگ کو چھوڑا جا سکتا ہے جسے ہم جلاتے ہیں! ہرگز نہیں؛ کیونکہ اس قسم کی آگ جلانے کے لئے آکسیجن درکار ہے، اور خلا میں نظام شمسی سے باہر جس جگہ انسان کے جانے کی قرآن بات کر رہا ہے وہاں آکسیجن موجود ہی نہیں تو وہاں ایسی آگ چھوڑنے کا سوال ہی نہیں، بلکہ ہماری فضا جہاں آکسیجن موجود ہے اس میں بھی ایسی آگ پھینکنے پر ارسال کا لفظ استعمال نہیں ہوگا، لہٰذا پتہ چلا کہ شواظ من نار سے مراد وہ آگ نہیں ہوسکتی جسے ہم جلاتے ہیں بلکہ اس کا صحیح مصداق وہ تیزی سے نکلنے والی حرارت وتوانائی ہے جو کسی مادے سے نکلتی ہیں۔ چنانچہ یُرْسَلُ عَلَیْکُمَا شُوَاظٌ مِّن نَّارٍ وَنُحَاسٌ میں ''شواظ من نار'' یعنی کسی مادے سے خارج شدہ حرارت و توانائی اور ''نحاس'' یعنی ''آگ بھڑکاؤ جوہر'' کو ایک ساتھ چھوڑنے کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان کے ساتھ ان دونوں کے جوہری تعامل کے نتیجہ میں کچھ ایسے نتائج پیدا ہونگے کہ جیسے ایٹم بم پھٹنے کے بعد انسان آہ تک نہیں کر پاتا۔

یرسل ۔۔۔فلا تنتصران: تابکاری کی یہ بوچھار اس قدر شدید ہوتی ہے کہ جن وانس کو دیکھتے ہی دیکھتے اس طرح پگھلا دیتی ہے یا پاش پاش کر دیتی ہے کہ کسی سے مدد لینے کا موقع بھی نہیں ملتا۔

الحاصل قرآن نے ''نار'' کو بار بار نکرہ بیان کرنے کے علاوہ اس پر ''من'' تبعیض بھی داخل کیا ہے، اسی طرح نار کو الگ الگ طرح کی صفات سے بھی متصف

کیا ہے، جس کا واضح مطلب ہے کہ ''نار میں بہت تنوع ہے، اور وہ مختلف قسم کی ہوسکتی ہے۔

''نار'' مصدر ہے، یہ حاصل مصدر کا معنی بھی دیتا ہے اور اسم فاعل کا بھی ۔ چنانچہ قرآن میں نار حاصل مصدر کے معنی میں بھی مستعمل ہے اور اسم فاعل کے معنی میں بھی۔ یعنی آگ یا آگ کے منبع پر بھی قرآن نے ''نار'' کا اطلاق کیا ہے۔

ماقبل کی وضاحت سے اتنی بات معلوم ہو چکی ہے کہ نار کا اطلاق ہر اس چیز پر کیا جائیگا جس میں جلانے یا جھلسانے کا معنی پایا جاتا ہو ۔۔۔۔اس میں مرئی لو اور لپٹ کا ہونا ضروری نہیں۔ اور جب کسی چیز میں یہ کیفیت ہوگی تو لازما اس میں حرارت کا وجود بھی ہوگا۔

البتہ نور وضیاء یعنی روشنی کا ''نار'' کے ساتھ کیا تعلق ہے، نار کے مفہوم میں کیا اس کا بالفعل ہونا ضروری ہے یا بالقوۃ ہونا کافی ہے، یہ سب الگ بحث ہے۔

اب ہم دیکھ چکے ہیں کہ نار کا یہ مفہوم سالماتی سطح پر بھی مستعمل ہے اور ایٹمی سطح پر بھی۔ ایٹمی سطح پر نار کا وجود فیوزن اور فیزن کی صورت میں بھی ہوتا ہے جیسا کہ سورج اور کائناتی اشعاع کی مثالوں میں ہم نے دیکھ لیا۔

نار اور برقی توانائی

مذکورہ بالا نار کی اقسام کے علاوہ نار کی ایک قسم الیکٹریکل انرجی (برقی توانائی) کی صورت میں بھی ہے۔

برقی توانائی الیکٹرون کی حرکت سے پیدا ہوتی ہے۔۔۔۔ ہر مادہ ایٹم سے

بنا ہے۔ ہر ایٹم الیکٹرون، پروٹون اور نیوٹرون پر مشتمل ہوتا ہے۔ پروٹوں اور نیوٹرون ایٹم کے مرکز میں ہوتے ہیں، الیکٹرون اس مرکز کے گرد اسی طرح حرکت کرتے ہیں جیسے چاند زمین کے گرد۔۔۔ کچھ مادے خاص کر لوہا، تانبہ اور چاندی جیسے دھاتی مادوں کے ایٹم میں الیکٹرون زیادہ مضبوطی کے ساتھ جڑے نہیں ہوتے، چنانچہ جب ایسے مادوں پر مقناطیسی میدان کو حرکت دی جائے تو ان کے الیکٹرون ایک ایٹم سے دوسرے ایٹم کی طرف حرکت کرنے لگتے ہیں۔ ۔۔۔جب یہ الیکٹرون اس مادے میں حرکت کرتے ہیں تو ان میں الیکٹرک کرنٹ پیدا ہوجاتا ہے۔

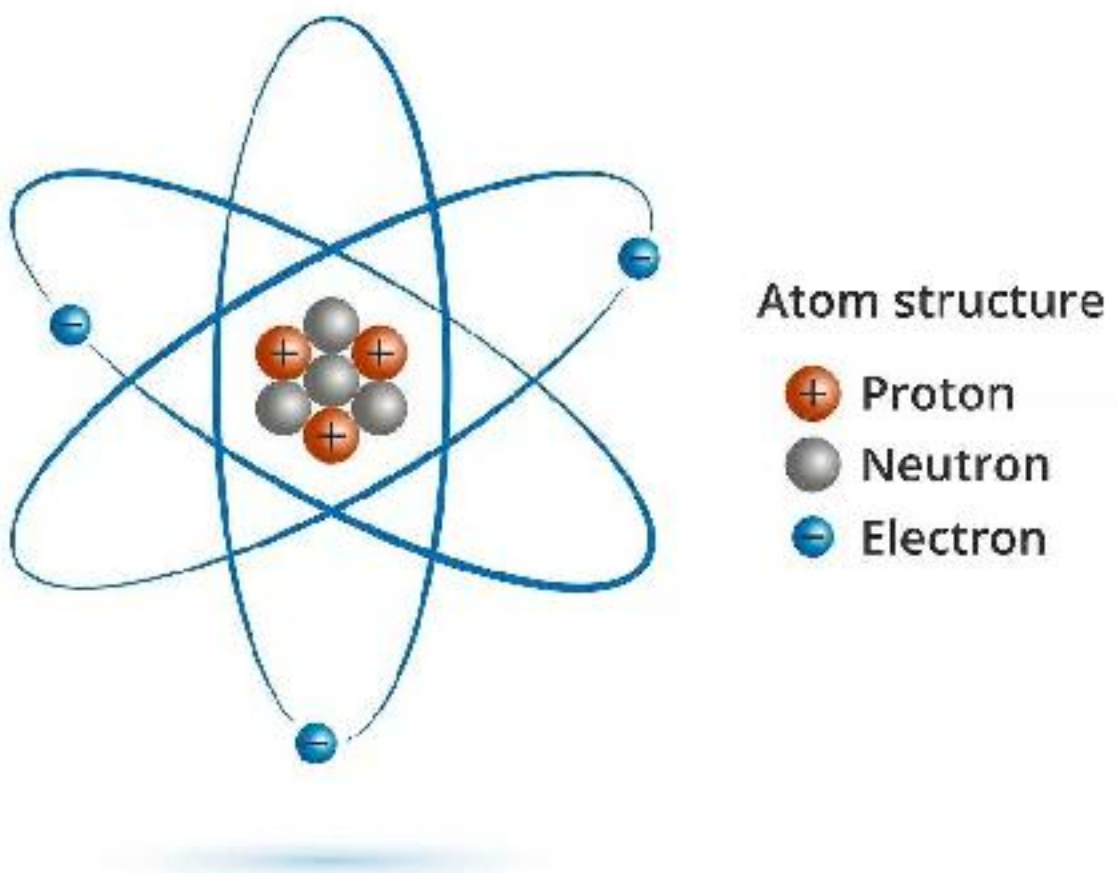

اس طرح پیدا شدہ کرنٹ کی تیز رفتاری کی وجہ سے کبھی لوہے اور تانبے جیسے دھاتی مادے گرم ہو کر سرخ ہوجاتے ہیں۔

سورۂ کہف کی زیر بحث آیت (حَتَّىٰ إِذَا جَعَلَهُ نَارًا) میں ''نار'' سے اسی برقی توانائی سے پیدا ہونے والی صفت احراق مراد ہے۔

الغرض قرآن نے لکڑی، کوئلہ کے علاوہ سورج کی شعاع، کائناتی اشعاع، جوہری توانائی اور برقی توانائی جیسی مختلف توانائیوں سے پیدا ہونے والی حرارت

اورصفت احراق پر ''نار'' کا اطلاق کیا ہے۔اب دیکھتے ہیں کہ زیر بحث آیت میں ''نار'' سے برقی توانائی سے پیدا ہونے والی حرارت وتپش کیسے مراد ہے۔

نارالحدید

اب سوال یہ ہے کہ صدفین اورزبرالحدید کے درمیان عمل نفخ کے ذریعہ کس قسم کی توانائی پیدا کی گئی ہے؟

زیر بحث مقام میں ''نار'' سے مراد اگر وہ آگ ہوتی جس کا ہم کوئلے یا لکڑی وغیرہ جلانے پر مشاہدہ کرتے ہیں تو اس کے لئے ''أوقد''، ''أوری النار'' یا ''اصطلی'' جیسا کوئی لفظ استعمال کیا جاتا جبکہ یہاں اس قسم کے کسی لفظ کے بجائے ''جعل'' استعمال کیا گیا ہے۔

جعل، یجعل، جعلاً : یہ فعل خلق، صنع، وضع، عین، صیر جیسے کئی معنی کے لئے مستعمل ہے۔سیاق وسباق سے اسکے صحیح مصداق کی تعیین کی جاتی ہے۔ ''جَعَلَهُ نَارًا'' میں بلاشبہ ''صیر'' کا معنی لیا جائیگا۔۔۔۔۔''صیرورت'' کا معنی ہے کسی چیز کی ہیئت یا حالت میں تغیر پیدا کردینا۔ لہٰذا ''جَعَلَهُ نَارًا'' کا مطلب ہوگا کہ عمل نفخ کے ذریعہ لوہے کی پلیٹوں میں کوئی جوہری تغیر پیدا کیا گیا ہے۔

ماقبل میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ''نفخ'' کسی مفرد یا مرکب چیز میں موجود طبیعی صلاحیت کو متحرک کرنے کا نام ہے۔اب صدفین یعنی دو مقناطیس کے درمیان لوہے کی پلیٹوں کو مخصوص ترتیب سے رکھ کر سائنسی بنیادوں پر اگر کوئی چیز وجود میں

لائی جاسکتی ہے تو وہ ہے ''برقی رو'' یعنی الیکٹرک کرنٹ۔ چنانچہ مقناطیس اور لوہے کی پلیٹوں کے درمیان عمل نفخ کے ذریعہ جو تعامل ہوگا اسے دور جدید کی سائنسی اصطلاح میں الیکٹرومیگنیٹک انڈکشن (برق مقناطیسی امالہ) کہا جاتا ہے۔

کسی بھی مقناطیس کے گرد مقناطیسی اثر کا حامل ایک علاقہ ہوتا ہے جسے مقناطیسی میدان کہا جاتا ہے۔ یہ مقناطیسی میدان غیر مرئی خطوط سے بنا ہوتا ہے۔ یہ خطوط شمال سے نکل کر جنوب کی طرف جاتے ہیں اور وہاں سے دوبارہ شمال کی طرف مڑ جاتے ہیں۔

سائنسی اصول کے تحت جب U شکل کے مقناطیس میں یا کسی دو مقناطیسی میدان میں تانبہ، لوہا، چاندی اور سونے جیسے کسی موصل کو حرکت دی جاتی ہے یا کسی کوئل کے گرد خود مقناطیس کو حرکت دی جائے تو ان میں کرنٹ پیدا ہو جاتا ہے۔

برقی مقناطیسی امالہ کا یہی وہ اصول ہے جس کی بنیاد پر آج موٹر سائیکل، الیکٹرک کاریں ، پنکھے، جنریٹر اور ٹرانسفرمر جیسی موٹر سے چلنے والی بے شمار چیزیں کام کرتی ہیں۔

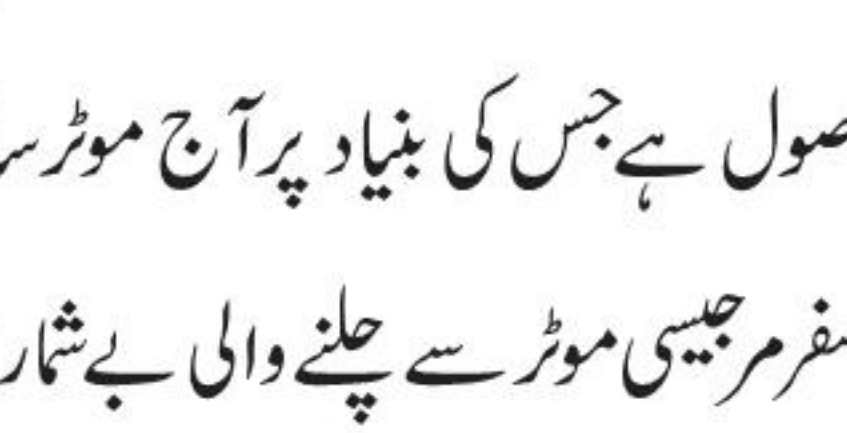

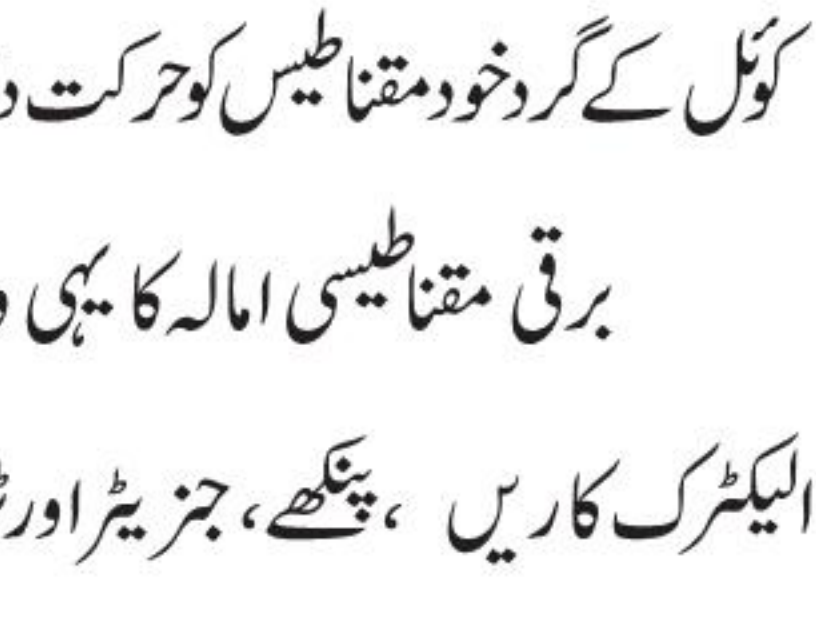

اس اصول کی دریافت کا سہرا مائیکل فیراڈے کے نام ہے جس نے

۱۸۳۱ء میں تجربات کے بعد ثابت کیا تھا کہ جب مقناطیسی میدان کو کسی موصل پر حرکت دی جاتی ہے تو اس میں بجلی پیدا ہو جاتی ہے۔

موصل (Condector): سونا، چاندی، تانبے اور لوہے کی طرح کسی بھی ایسی چیز کو کہتے ہیں جس میں سے بجلی آسانی سے گذر سکے۔

موصل میں پیدا ہونے والے کرنٹ کی مقدار کا انحصار حرکت کی رفتار، موصل اور مقناطیس کی کثافت و نوعیت اور زاویۂ حرکت پر ہوتا ہے۔

اس طرح امالہ کے ذریعہ پیدا ہونے والے کرنٹ کو امالی برقی رو (induced current) کہا جاتا ہے۔

چنانچہ دو مقناطیس کے درمیان لوہے کی پلیٹوں کو ایک دوسرے کے محاذی نصب کرنے کے بعد کسی مخصوص ترکیب سے مقناطیسی میدان میں لوہے کی پلیٹوں کو حرکت دینے سے یا مقناطیس کو پلیٹوں کے گرد حرکت دینے سے یا کسی تیسرے طریقہ کے ذریعہ پلیٹوں کے اندر بجلی پیدا ہو گئی۔

اگر موصل کوئل کے بجائے پلیٹ کی طرح چوکور اور سخت قسم کا ہو تو ایسی صورت میں اس میں جو کرنٹ پیدا ہوگا اسے ایڈی کرنٹ (Eddy Current) کہا جاتا ہے۔ ایڈی کرنٹ بھنور کی شکل میں حرکت کرنے والے کرنٹ کو کہتے ہیں۔ اس کرنٹ کے بنیادی اثرات میں سے ایک یہ ہے کہ یہ موصل میں حرارت پیدا کر دیتا ہے۔۔۔۔۔۔ ایڈی کرنٹ کے اسی اثر کا استعمال کرتے ہوئے انڈکشن چولہوں پر کھانا بنایا جاتا ہے اور بھٹیوں میں لوہا پگھلایا جاتا ہے۔

الحاصل دو مقناطیس اور لوہے کی پلیٹوں کے درمیان برقناطیسی امالہ کے ذریعہ پیدا شدہ ایڈی کرنٹ کی وجہ سے پیدا ہونے والی حرارت اور جلانے کی صفت کو ہی قرآن نے ''جَعَلَهُ نَارًا'' سے تعبیر کیا گیا ہے ۔

أُفْرِغْ عَلَيْهِ :

فرغ، یفرغ، فراغا ، فروغا و فرغا ۔ فرغ الظرف : برتن کا خالی ہونا ، فرغ عن الامر : کام سے فارغ ہونا (کام کو پورا کرنا) فرغ علیه الماء : پانی انڈیلنا، افرغ الذهب و نحوه : سانچے کو پگھلے سونے وغیرہ سے بھر دینا۔

آتونی افرغ علیه قطراً : مجھے مخصوص قسم کا سیال لا دو تا کہ (دو مقناطیس کے درمیان میں ایک دوسرے کے مساوی نصب کی گئی لوہے کی پلیٹوں کے) درمیان اور ان کے اوپر تک بھر دوں ۔یعنی نیچے سے اوپر تک بھر دوں۔

ذرا ''جَعَلَهُ نَارًا'' کے اگلے پچھلے جملوں پر غور فرمائیں ! ''سَاوَى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ'' لوہے کی پلیٹیں اس طرح آمنے سامنے نصب کی گئی تھیں کہ درمیان میں قدرے خلا رہے۔اب ''جَعَلَهُ نَارًا'' کے بعد کے جملہ پر غور کریں۔''آتُونِي أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا'' مجھے مخصوص قسم کا سیال لا دو تا کہ میں پلیٹوں کے اوپر تک بھر دوں۔۔۔ملاحظہ فرمائیں! یہاں ''صب'' کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا بلکہ ''افرغ'' استعمال ہوا ہے، ان دونوں جملوں کا مطلب یہ ہوا کہ پلیٹوں کے درمیان ''خلا ''موجود تھا، اگر کوئی ٹھوس قسم کی دیوار بنانی مقصود ہوتی تو نہ لوہے کی ایک جیسی سائز کی پلیٹیں بنانے کی ضرورت تھی ، نہ انہیں صدفین یعنی مقناطیس کے درمیان

ایک دوسرے کے مساوی نصب کرنے کی ضرورت تھی اور نہ ہی یہ کہنا درست ہوتا کہ ''سیال لاؤ تا کہ نیچے سے اوپر تک بھر دوں!۔

یہاں ''افرغ'' کے علاوہ ''علیہ'' کے لفظ پر بھی غور فرمائیں! ''افرغ'' کے ذریعہ پتہ چلتا ہے کہ پلیٹوں کے درمیان خلا تھا جبکہ ''علیہ'' کا مطلب یہ ہے کہ خلا پلیٹوں کے اوپر بھی تھا۔

پتہ چلا کہ لوہے کی پلیٹوں کو نار یعنی آگ بنانے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ پگھلے تانبے سے ملا کر کانسی کی طرح کوئی مضبوط دیوار بنائی جائے بلکہ اس کا مقصد ان میں سے کسی مخصوص قسم کی توانائی کا اخراج تھا۔

الغرض ہم یہ بات دیکھ چکے ہیں کہ ردم کی شکل بیٹری نما ہے۔۔۔ چنانچہ جب اس میں موجود لوہے کی پلیٹوں میں ایڈی کرنٹ پیدا ہونے سے وہ گرم ہو گئیں تو اس صندوق کو مخصوص قسم کے سیال سے بھر دیا گیا۔

سوال یہ ہے کہ ایڈی کرنٹ سے گرم ہو جانے والی پلیٹوں کو اوپر تک سیال سے بھر دینے کا مقصد کیا تھا؟ کیا اس کی وجہ ٹرانسفرمر میں ڈالے جانے

والے تیل کی طرح حرارت سے بچاؤ اور انسیولیٹ فراہم کرنا تھا یا اس کا مقصد کچھ اور تھا؟۔آیئے پہلے ''قطر'' کو سمجھ لیتے ہیں۔

قِطْرًا:

القِطْرُ: مفسرین نے ''قطر'' کے مختلف معانی بیان کئے ہیں، عام طور پر اس سے پگھلا ہوا تانبہ مراد لیا گیا ہے۔

القِطْرُ: النُّحَاسُ الذَّائِبُ. و القِطْرُ الحديدُ الذَّائب. المعجم الوسيط

پگھلا لوہا، پگھلا تانبہ، پگھلا پیتل۔

اس کا صحیح معنی کیا ہے؟

قطَرَ يَقْطُر ، قَطْرًا وقُطُورًا وقَطَرانًا ، فهو قاطِر ، والمفعول مقطور - للمتعدِّى

قطَر الماءُ ونحوُه: سال قطْرُهُ قَطْرَةً قَطْرَةً

قطَر الدواءَ فى عينيه: أساله

قطَر السَّائقُ العربةَ: ضمَّها إلى غيرها وساقهما معًا

قَطَرَ الإبلَ: قرَّب بعضَها إلى بعض فى سياقٍ واحد

يقال قطَرَ البعيرَ إلى غيره: ضَمَّه إليه وساقهما مساقاً واحداً

قَطَرَ الثوبَ: خاطَهُ

قَطَرَ الصمْغُ من الشجَرِ قَطراً: خرج

قطَّرَ يُقطِّر ، تقطيرًا ، فهو مُقطِّر ، والمفعول مُقطَّر

قَطَّرَ الدَّوَاءَ فِي الأُذُنِ: أَنْزَلَ مِنْهُ قَطْرَةً فِيهَا

قَطَّرَ الزَّهرَ : سَيَّلَهُ قَطرَةً قَطرَةً

قَطَّرَ السَّائِلَ : أَغلاهُ حَتَّى تَبَخَّرَ ثُمَّ سَالَ بُخَارُهُ بِالتَّبرِيدِ قَطرَةً قَطرَةً

قَطَّرَ العَرَبَاتِ : قَرَّبَ بَعضَهَا مِنْ بَعضٍ عَلَى نَسَقٍ وَاحِدٍ

قَطَّرَ الإِبلَ وغيرَها : قَطَرَها

قُطِّرَ اللصوصُ فى المِقْطَرة: سُلِكُوا فيها

قَطر : (اسم) الجمع : قِطَارٌ

القَطْرُ : المطرُ

القَطْرُ من الماء والدَّمع وغيرهما من السوائل: ما قَطَر والجمع : قِطَارٌ

القطر : بفتح القاف وسكون الطاء ، مفردها قطرة: كل ما نزل من السوائل على شكل نقاط.

قُطر : (اسم) الجمع : أقطارٌ

القُطْرُ : ناحية، جِهَة، جانب

ومنه قيل القُطْر : لجملة من البلاد والنواحى تتميَّز باسم خاصّ

القُطْرُ من الإنسان: شِقُّهُ وجانبُه

جمَعَ فلانٌ قُطْرَيْه: تكبَّرَ متغَضِّباً

تقاطرَ يتقاطَر ، تقاطُرًا ، فهو مُتقاطِر

تَقاطَرَ الماءُ : سالَ قَطرَةً قَطرَةً

تَقَاطَرَ القَوْمُ : جاءوا وَتَتَابَعُوا أَفْواجاً أَفْواجاً

تَقَاطَرَ كُتُبُ فلان: تتابعت

قَطَرَ عَدُوَّهُ : صَرَعَهُ صَرعَةً شَدِيدَةً

قَطَرَ فِي الأَرْضِ قُطُوراً : ذَهَبَ

لاَ أَدْرِي مَنْ قَطَرَ بِهِ : مَنْ مَطَرَ بِهِ، مَنْ جَاءَ بِهِ

مَا قَطَرَكَ عَلَيْنَا : مَا صَبَّكَ عَلَيْنَا

قطر کا بنیادی معنی

مذکورہ بالا الفاظ پر غور کرنے کے بعد ''قطر'' کا جو بنیادی معنی ابھر کر سامنے آتا ہے، اس میں دو مفہوم بنیادی اہمیت کے حامل ہیں :

ایک : یہ کسی بھی ایسی سیال اور متحرک چیز کے لئے بولا جاتا ہے جس کے اجزاء باہم اس قدر ملے ہوئے ہوں کہ انہیں الگ الگ تصور کرنا بظاہر دشوار ہو۔

دوم : حرکت کا مفہوم بھی اس میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ یعنی ان اجزاء میں ایک دوسرے کے دباؤ کی وجہ سے پیدا ہونے والی ایسی حرکت کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے جو ایک دوسرے کو آگے پیچھے چلنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے ہر جزء کی حرکت حیات دوسرے پر منحصر ہوتی ہے۔

اس لئے اب ''قطر' کا معنی ہوگا ''کسی بھی سیال یا متحرک چیز کے اجزاء کا کسی بیرونی اثر کی وجہ سے ایک لائن میں متحرک رہنا''۔ چاہے وہ بارش کے قطرے ہوں، ریل کے ڈبے ہوں، اونٹوں کی قطار ہو یا لوگوں کا پے در پے اور آگے پیچھے کسی جگہ جانا ہو۔

''قطر'' کا لفظ سیال اور جامد دونوں کے لئے مستعمل ہے؛ لیکن مذکورہ بالا معنی اپنی اس خصوصیت کے ساتھ صرف سیال چیزوں میں ہی پایا جاتا ہے، یہی

وجہ ہے کہ یہ لفظ عام طور پر سیال چیزوں کے لیے ہی مستعمل ہے ؛ لہٰذا سیال چیزوں کے لئے اس کا استعمال حقیقی ہوگا جبکہ جامد چیزوں کے لئے مجاز۔ مثلاً اقطار العالم العربی، میں عربی ممالک کو اقطار سے تعبیر کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ بظاہر بھلے یہ ممالک اپنے رقبے کے اعتبار سے چھوٹے بڑے ہوں لیکن حقیقت میں یہ سب ایک جیسے ،ہم پلہ اور اپنی اقدار و روایات میں باہم ایک دوسرے سے اس قدر پیوستہ اور زندگی کی رفتار میں ایک دوسرے پر ایسے منحصر ہیں کہ انہیں الگ الگ تصور نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح ''مَا قَطَرَكَ عَلَيْنَا : مَا صَبَّكَ عَلَيْنَا ''مجازاً کسی ایسی مصیبت کے لیے بولا جاتا ہے جو کسی سے اس طرح چپک کر زندگی کا حصہ بن چکی ہو کہ اس کے بغیر جینا متصور نہ ہو۔ یعنی یہ مصیبت گویا ہمارا ایسا جزو لاینفک ہے کہ ایک دوسرے کی حیات ہر ایک پر منحصر ہو چکی ہے۔

الغرض ''قطر'' کسی چیز کے اجزاء میں بے ترتیبی اور بدنظمی کے بجائے اجزاء میں ایک دوسرے سے پیوستگی کے علاوہ اپنی حرکت میں انتظام و ارتباط کو ظاہر کرتا ہے۔ ہم دوسرے الفاظ میں اس طرح بھی بیان کر سکتے ہیں کہ ''کسی اثر کی وجہ سے سیال چیز کے اجزاء کا ایک دوسرے کے پیچھے اس طرح تانا باندھنا کہ وہ خط راہ سے ادھر ادھر یا فرار نہ ہونے پائیں۔ مثلاً بے ترتیب اونٹوں کو کسی رسی کے ذریعہ ایک قطار میں چلانا۔ یا ریل کے ڈبوں کو کسی پٹری پر ایک دوسرے سے جوڑ کر چلانا۔

''قطر''، فعل متعدی کا مصدر اسم فاعل کے معنی میں ہونے کی وجہ سے اس کا معنی ہوگا: ایسا سیال جو کسی چیز کے بے ترتیب اجزاء کو ایک خط پر اکٹھا اور چسپاں کر کے اس طرح چلائے کہ وہ فرار اور ادھر ادھر نہ ہونے پائیں۔

قرآن میں ''أَقْطَار'' دو جگہ ، ''قطران'' ایک جگہ جبکہ ''قطر'' کا لفظ دو مقام پر وارد ہے:

يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَن تَنفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ فَانفُذُوا ۚ لَا تَنفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطَانٍ ﴿۳۳ الرحمن﴾

آیت میں ارض وسماوات سے زمین، سیارات اور چاند وسورج سمیت نظام شمسی مراد ہے۔

جن وانس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا جا رہا ہے کہ نظام شمسی کے ان اجزاء پر غور کریں، یہ سب افادیت اور امداد باہمی کے اصول کے تحت ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں کہ ہر جزء اپنے وجود اور سرگرمی کے لئے دوسرے کا محتاج ہے، اپنی حیات اور سرگرمی میں بشمول جن وانس نظام شمسی کے اجزاء کی بے بسی کے ساتھ اس میں موجود ہم آہنگی کسی قادر مطلق خلاق علیم کے وجود کی غماز ہے۔۔۔۔ اگر تمہیں اس بات کا انکار ہے کہ یہ دنیا بغیر کسی خالق کے وجود میں آ گئی ہے، یا تم اپنے وجود کو اس ارتباط وانتظام سے مستثنی سمجھتے ہو تو تم اپنے بل بوتے پر اس منظم دنیا سے نکل دکھاؤ، تم ایسا ہرگز نہیں کر پاؤ گے؛ کیونکہ تمہارے پاس ایسی قدرت نہیں، اگر تم نکل سکتے ہو تو صرف اور صرف انہیں وسائل وذرائع اور تدابیر کو اختیار

کر کے نکل سکتے ہو جو اس نظام شمسی کو چلانے کے لئے رب کائنات نے ودیعت کر رکھے ہیں اور جہاں کہیں جاؤ گے وہاں بھی اسی طرح کا نظم ونسق اور اصول و قوانین والی دنیا ملیگی جو اسی پروردگار کی سلطنت کی غماز ہوگی جس نے نظام شمسی کو وجود بخشا ہے۔

غرض ''اقطار'' کا معنی محض ناحیۃ اور جانب نہیں بلکہ کسی چیز کے اجزاء میں ایک ایسے انتظام و ارتباط کو بھی بتلاتا ہے جو ایک دوسرے کی حیات کے لیے ضروری ہے۔

الحاصل

''قطر'' کے لغوی معنی کے پیش نظر اب سوال یہ ہے کہ وہ کونسی بے ترتیب چیز ہے جس کے اجزاء کو اس سیال نے ایک لائن میں اس طرح متحرک کر رکھا ہے کہ وہ ادھر ادھر یا فرار نہ ہونے پائیں؟

ہم دیکھ چکے ہیں کہ لوہے کی چوکور یا مستطیل پلیٹ میں برقناطیسی امالہ کی وجہ سے جو کرنٹ پیدا ہوتا ہے وہ بھنور کی شکل میں بہتا ہے، اسی بھنور کی شکل میں بہتے کرنٹ کو سیدھی لائن میں بہانے کا کام'' مخصوص قسم کے سیال'' سے لیا گیا۔ ۔۔۔اوپر نیچے لہر کی شکل میں اور بھنور کی طرح گول دائرے میں حرکت کرتے کرنٹ کو ایک قطار میں حرکت پذیر کروانے کی وجہ سے اس سیال کو'' قطر'' کہا گیا ہے۔

لیکن اس طرح ایڈی کرنٹ کو ایک لائن میں چلا کر کیا مقصد حاصل کیا

جارہا ہے؟ اس سوال کو حل کرنے سے پہلے ایک بار اس بات پر مزید غور کر لیتے ہیں کہ کیا ''قطر'' کا وہ معنی درست ہے جو ہم نے اوپر سمجھا ہے۔

''قطر'' قرآن میں دو جگہ وارد ہوا ہے: ایک زیر بحث آیت میں اور دوسرا قصۂ سلیمان علیہ السلام میں۔

وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ وَأَسَلْنَا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ وَمِنَ الْجِنِّ مَن يَعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَمَن يَزِغْ مِنْهُمْ عَنْ أَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيرِ ﴿۱۲ سبإ﴾

تفسیر طبری میں سلیمان علیہ السلام کی سواری کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ قَالَ ابْنُ زَيْدٍ، فِي قَوْلِهِ: {وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ} قَالَ: كَانَ لَهُ مَرْكَبٌ مِنْ خَشَبٍ، وَكَانَ فِيهِ أَلْفُ رُكْنٍ، فِي كُلِّ رُكْنٍ أَلْفُ بَيْتٍ تَرْكَبُ فِيهِ الْجِنُّ وَالإِنْسُ، تَحْتَ كُلِّ رُكْنٍ أَلْفُ شَيْطَانَ، يَرْفَعُونَ ذَلِكَ الْمَرْكَبَ هُمْ وَالْعِصَارُ؛ فَإِذَا ارْتَفَعَ أَتَتِ الرِّيحُ رَخَاءً، فَسَارَتْ بِهِ، وَسَارُوا مَعَهُ ..... اس تفسیر کے مطابق لکڑی سے بنی یہ ہوائی سواری لاکھوں کمروں پر مشتمل تھی، جسے شیاطین کے علاوہ ہوا کی مدد سے اڑایا جاتا تھا۔ ..... دور حاضر کے بعض نامور مفسرین نے ''تسخیر ریح'' سے بادبانی کشتیاں مراد لیتے ہوئے یہ بات بتلائی ہے کہ سلیمان علیہ السلام کو بحری جہاز رانی میں خاص قدرت دی گئی تھی ..... جبکہ دور جدید کے بعض اہل علم نے بہت عمدہ بات پیش کی ہے کہ تسخیر ریح کا مطلب یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام کو ہوائی

جہاز کی سہولت فراہم کی گئی تھی۔۔۔۔لیکن یہ حضرات دلائل کی روشنی میں اس خیال کی مزید وضاحت نہیں کر پائے ہیں کہ اس کا طریقۂ کار کیا تھا۔آیئے دیکھتے ہیں کہ کن دلائل کی روشنی میں یہ دعویٰ درست ہے کہ سلیمان علیہ السلام ہوائی جہازوں کے ذریعہ سفر اور نقل وحمل کیا کرتے تھے۔

ا۔مذکورہ بالا آیت میں تسمیۃ الشئ بسببہ القائم بہ کی رو سے ریح سے مراد وہ سواری ہے جو ہوا کے زور سے چلا کرتی ہو۔اسی کو ہوائی سواری یا ہوائی جہاز کہا جائیگا۔اب ہوا کے زور سے بادبانی کشتیاں بھی چلا کرتی ہیں؛لیکن اس کے باوجود وہ ''تسخیر ریح'' کے زمرے میں شمار نہیں ہونگی بلکہ ان کا شمار ''تسخیر بحر'' کے دائرے میں ہوگا کیونکہ ان کا ''سبب قائم'' پانی ہے نہ کہ ہوا۔

۲۔غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سواری مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے کرلیا کرتی تھی۔

۳۔ وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ عَاصِفَةً تَجْرِي بِأَمْرِهِ إِلَى الأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عَالِمِينَ ﴿۸۱ الانبیاء﴾ اور سلیمان کے لئے ہم نے ہوا کو اس طور پر مسخر کردیا تھا کہ وہ بھاری بھرکم سواری کو اٹھالے جانے والی بن کر ان کے حکم سے ایسی زمین کی طرف چلا کرتی تھی جس میں ہم نے برکت رکھی تھی اور ہم ہر چیز کو جاننے والے ہیں ۔

عصف یعصف کا معنی ہے ''کسی چیز کو دور دراز اٹھالے جانا یا دور دراز اٹھا پھینکنا''۔جیسے عصفت الحرب بالقوم : جنگ نے لوگوں کے قدم اکھاڑ پھینکے یعنی

لوگوں کو ہلاک کر دیا۔

عصف الدھر بھم: زمانے نے ان کو اکھاڑ پھینکا یعنی ان کو ہلاک کر دیا۔

عصف الزرع: کھیتی کو تیار ہونے سے پہلے کاٹ پھینکنا۔

عصفت الریح اور ریح عاصف کا ترجمہ ہوگا ایسی تیز ہوا جو گھر اور درخت جیسی کسی بھی چیز کو زمین سے اٹھا کر دور پھینک دے۔قرآن کے مختلف مقامات پر اس مفہوم میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتَّىٰ إِذَا كُنتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَئِنْ أَنجَيْتَنَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴿۲۲ یونس﴾

مَّثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ لَّا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلَىٰ شَيْءٍ ذَٰلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ ﴿۱۸ ابراھیم﴾

الرِّيحَ عَاصِفَةً: ملاحظہ فرمائیں! سورۂ یونس اور سورۂ ابراہیم میں عذاب کا تذکرہ کرتے ہوئے ''رِيحٌ عَاصِفٌ'' اور ''يَوْمٍ عَاصِفٍ'' موصوف صفت کے طور پر مذکور ہیں، جبکہ سورۂ سبا میں ''الرِّيحَ عَاصِفَةً'' موصوف صفت نہیں ہے بلکہ ''عَاصِفَةً'' ''الرِّيح'' کی تمیز ہے۔یعنی ''عَاصِفَةً'' کے ذریعہ ''تسخیر ریح'' کے اجمال کو دور کرتے ہوئے اس کی کیفیت کو بتلایا جا رہا ہے؛ لہٰذا اس کا ترجمہ اس طرح کرنا درست نہیں ہوگا کہ سلیمان کے لئے ''تیز چلنے والی ہوا'' مسخر کی گئی

تھی، بلکہ ''عَاصِفَةً'' ''الرِّيحَ'' کی تمیز ہونے کی بنا پر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سلیمان علیہ السلام کو ہوا پر اس طرح کا کنٹرول حاصل تھا کہ وہ اسے 'عاصفہ' بنا کر اڑان بھرا کرتے تھے۔ یعنی الریح کو عاصفہ بنانا سلیمان علیہ السلام کے کنٹرول سے ہوتا تھا۔ گویا ''ہوا'' بذات خود پہلے سے'' اٹھالے جانے '' کی صفت سے متصف نہیں ہوتی تھی بلکہ سلیمان علیہ السلام کے عمل اور کاریگری کے نتیجہ میں اس میں یہ صفت پیدا ہوجایا کرتی تھی کہ وہ بھاری بھرکم سواری کو دور دراز کے مقامات تک اٹھالے جاتی تھی۔

چنانچہ یہی وہ ریح عاصفہ ہے جس کی بنیاد پر آج کل ہوائی جہاز اڑا کرتے ہیں ۔ ہوائی جہاز جس (Thrust Force) یعنی آگے دھکا دینے والی اور (Lift Force) یعنی اوپر اٹھانے والی طاقت کی وجہ سے اڑتے ہیں وہ طاقت ریح عاصفہ کی وجہ سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ اب اس (Thrust Force) کا سبب بننے والی ریح عاصفہ بغیر مشینی عمل کے وجود میں نہیں آسکتی۔ اور مشین کے لئے (Fule) یعنی ایندھن کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی ایندھن کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے آیت کے اگلے حصہ میں فرمایا ''وَأَسَلْنَا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ''۔

ترجمہ: ہم نے ان کے لئے قطر کا چشمہ بہایا تھا۔

فی الحال قطر کا حتمی معنی کیا ہے اس سے قطع نظر اس آیت کے سیاق وسباق سے اتنی بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ ''قطر'' کوئی ایسی سیال چیز ہے جس سے جیٹ یا اس جیسے انجن کو تحریک دے کر تھرسٹ فورس پیدا کرنے والی ہوا تشکیل دی جاتی

تھی۔

۴۔ قرآن میں تین مقام پر سلیمان علیہ السلام کے لئے تسخیر ریح کا تذکرہ موجود ہے۔سورہ انبیاء میں ''الرِّیحَ'' کو ''عَاصِفَةً'' سے متصف کر کے یہ بات بتلائی گئی ہے کہ سواری کیسے اڑا کرتی تھی۔

سورہ سباء میں غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ سے سواری کی تیز رفتاری کا بیان ہے کہ وہ کتنا فاصلہ طے کر لیتی تھی۔

جبکہ سورہ ص میں ہے: فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ ﴿۳۶ ص﴾ اس آیت میں الریح کو ''رخاء'' سے متصف کر کے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ سواری نہایت آرام دہ تھی۔

''عاصفة'' کا معنی ہے ''اٹھالے جانے والی'' اور ''رخاء'' کا معنی ہے ''پرسکون بنانے والی''۔اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ دونوں فعل متعدی سے مشتق ہیں، دونوں کا فاعل الریح ہے لیکن مفعول بہ الگ الگ، عاصفۃ کا مفعول بہ سواری ہے اور رخاء کا سوار۔یعنی عاصفۃ ہونے کی وجہ سے وہ ٹھرسٹ فورس اور لفٹ فورس پیدا کر کے ٹنوں وزنی جہازوں کو اڑا لے جاتی تھی، لیکن ساتھ ہی وہ اپنے سوار کے لئے رخاء یعنی پرسکون بھی تھی۔۔۔دراصل عاصفۃ کے معنی سے قاری کو وہم ہوسکتا تھا کہ اتنی شدید ہوا جس میں مکانوں اور درختوں کو اکھاڑ پھینکنے کی طاقت ہو، جب وہ ٹنوں وزنی سواری کو اٹھالے جائیگی تو اس میں سوار کیا ہوگا!، یہ وہم ''رخاء'' سے دور ہوجاتا ہے کہ نہیں وہ سواری نہایت آرام دہ تھی۔جیسا کہ ہم دور حاضر میں ہوائی

جہازوں میں مشاہدہ کررہے ہیں۔

۵۔ نیز ''حَيْثُ أَصَابَ '' سے جہاں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان کی ہوائی سواری کسی بھی موسم میں، کسی بھی قسم کے حالات میں اور کسی بھی سمت میں ہر وقت اڑان بھرنے کے قابل تھی وہیں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ان کی سواری میں جو قطر یعنی ایندھن استعمال ہوتا تھا وہ اتنا زیادہ طاقتور تھا کہ اگر روئے زمین پہ کہیں بھی چکر لگا کر واپس آئیں تب بھی اس کے عمل کے ختم ہونے کا خطرہ نہیں تھا۔

یہاں ایک بار پھر یہ بات دوہراتے چلیں کہ قرآن کا یہ مخصوص انداز ہے کہ وہ کسی دعوے کا اجمالی تذکرہ کرنے کے بعد حرف واو کے ساتھ ایک جملہ ذکر کر کے اس اجمال کی وضاحت بھی کر دیتا ہے۔ چنانچہ تسخیر ریح کے تذکرہ کے بعد قطر کا چشمہ بہانے کا یہ مطلب کسی طرح سلیمان علیہ السلام کی شایان شان نہیں بیٹھتا کہ وہ تانبے کے برتن بنایا کرتے تھے بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ ''وَأَسَلْنَا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ '' درحقیقت ماقبل کی وضاحت ہے کہ ریح کی تسخیر کس طرح عمل میں آتی تھی۔

الغرض مذکورہ بالا بحث سے اتنی بات تو بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ ''قطر'' ایک ایسا سیال ایندھن تھا جو کم از کم پٹرول اور ڈیزل کی طرح کم مسافت کے لئے استعمال ہو سکے ایسا نہیں تھا بلکہ الیکٹرون جیسی کسی ایسی مخصوص قسم کی توانائی پر مشتمل ہونے کے ساتھ ناقابل اختتام خصوصیت کا حامل بھی ہوتا تھا جس سے دور دراز کے اسفار بغیر کسی رکاوٹ کے طے کر لیے جاتے تھے۔

سورۂ سبا میں ''قطر'' کے معنی کی وضاحت کے بعد ظاہر سی بات ہے کہ سورۂ کہف میں بھی قطر سے کوئی ایسا ہی سیال مراد ہوگا جو بجلی جیسی کسی توانائی پر مشتمل ہوگا۔ جس کی وجہ سے یہ ردم نامی مشین تب تک متحرک رہیگی جب تک قیامت نہیں آجاتی۔

اَلْقِطْر اور قِطْرًا کا فرق

زیر بحث آیت میں ''قطر'' نکرہ اور حالت نصبی میں ہے جبکہ سورۂ سبا میں یہ معرف باللام ہے۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے؟

آیت نمبر ۹۶ ''حَتَّىٰ إِذَا جَعَلَهُ نَارًا قَالَ آتُونِي أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ﴿۹۶﴾'' کے مخصوص انداز بیان کو ملاحظہ فرمائیں کہ آتُونِي قِطْرًا أُفْرِغْه عَلَيْهِ نہیں کہا گیا۔ یعنی ''قِطْرًا'' ''آتُونِي'' کا مفعول بہ نہیں بلکہ ''آتُونِي'' کے مفعول بہ محذوف سے حال واقع ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس سیال میں ''قطر'' کی صفت پہلے سے موجود نہیں تھی بلکہ ایڈی کرنٹ کی حامل لوہے کی پلیٹوں میں انڈیلنے کے بعد پیدا ہوئی۔ ہاں یہ صفت اسی بھنور کی صورت بہتے کرنٹ کو کنٹرول کرنے کے نتیجہ میں پیدا ہوئی جو لوہے کی پلیٹوں میں مقناطیس کے ذریعہ عمل نفخ کے بعد پیدا ہوئی تھی۔

جبکہ دوسری جانب سورۂ سبا کی آیت نمبر ۱۲ میں وارد ''وَأَسَلْنَا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ'' کا مخصوص انداز کلام بتلاتا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے لئے قطر کا جو چشمہ بہایا گیا تھا اس میں اس قسم کی خصوصیت پہلے سے موجود تھی۔

الغرض سلیمان علیہ السلام کے لئے الیکٹرون پر مشتمل اس قسم کے سیال کا چشمہ زمین سے بہایا گیا تھا جبکہ ذوالقرنین نے مقناطیس اور لوہے کی پلیٹوں کے درمیان عمل نفخ یعنی برقناطیسی امالہ کے نتیجہ میں وجود میں آئے الیکٹرون کے کرنٹ کو کسی مخصوص قسم کے سیال میں قید کر کے بنایا تھا۔

''آتُونِي'' مجھے مہیا کرواؤ۔ یعنی یہ سیال سلیمان علیہ السلام کی طرح پہلے سے قدرتی طور پر ''قطر'' نہیں تھا کہ کہا گیا ہو کہ فلاں جگہ سے نکال کر لے آؤ بلکہ ذوالقرنین کے بتلائے طریقے کے مطابق اسے مخصوص عمل کے ذریعہ اس قابل بنایا گیا تھا کہ وہ قطر کا کام انجام دے سکے۔

وہ سیال کونسا ہے؟

اب یہ سوال کہ موجودہ ۱۲۰ عناصر کی فہرست میں سے وہ کونسا سیال ہے، یا ایسا کونسا مرکب ہے جس کی مخصوص صفت کی بنا پر اسے ردم میں استعمال کیا گیا ہے۔۔۔ ان شاءاللہ اسے جلد ہی متعین کرنے کی کوشش کی جائیگی۔

الغرض یہ سیال سلیمان علیہ السلام کے جہاز کے لیے ایندھن کا کام کرتا تھا؛ لیکن اب یہ سیال ردم ذوالقرنین میں کیا کام کرتا ہے اسے دیکھتے ہیں۔

موجودہ دور کی الیکٹرک سائنس میں ایڈی کرنٹ کے بنیادی اثرات میں سے ایک حرارتی اثر کو انڈکشن چولہے اور بھٹی کے مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن ٹرانسفرمر جیسی ایسی جگہیں جہاں ان اثرات کی ضرورت نہ ہو بلکہ ان سے نقصان ہوتا ہو تو ایسی صورت میں مختلف تدابیر کے ذریعہ ایڈی کرنٹ کے ان اثرات کو کم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔۔۔۔لیکن ذوالقرنین نے اس ایڈی کرنٹ سے کیا کام لیا؟۔۔۔۔اس کے لئے ہمیں ''أُفْرِغْ عَلَيْهِ'' اور ''قِطْرًا'' دونوں بلکہ تینوں لفظوں پر غور کرنا ہوگا۔

میں اپنی کم علمی کی وجہ سے فی الحال صرف اتنا ہی کہوں گا کہ جس طرح

ایڈی کرنٹ کی غیر ضروری حرارت کے نقصان سے بچنے کے لئے ٹرانسفرمر کو تیل سے بھر دیا جاتا ہے، اسی طرح ہوسکتا ہے کہ ردم کو بھی اس سیال سے اوپر تک بھر دینے کا ایک مقصد یہی رہا ہو۔ جبکہ اس کا بنیادی مقصد بھنور کی شکل میں حرکت کرتے الیکٹرون کو قابو میں کر کے پلیٹوں کی چاروں اور اس طرح حرکت پذیر بنا دینا تھا جس طرح کسی سالینائیڈ میں کسی سلاخ کے چاروں اور کرنٹ کو بہایا جاتا ہے۔

یاد رہے کہ ''قِطْرًا'' کے حال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سیال کے اندر یہ صلاحیت ردم کے اندر انڈیلنے کے بعد پیدا ہوئی ہے؛ لیکن یہ سیال صرف لوہے کی پلیٹوں سے حاصل کردہ الیکٹرون کی وجہ سے ''قِطْرًا'' نہیں بنا بلکہ ''صدفین'' یعنی اس میں دونوں طرف موجود مقناطیس کے اس عمل کا بھی دخل ہے جس کی وجہ سے الیکٹرون ایک سے دوسری طرف دھکا کھاتے رہتے ہیں۔

حَتَّىٰ إِذَا جَعَلَهُ نَارًا قَالَ آتُونِي أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ﴿۹۶﴾

ترجمہ: حتی کہ جب اس نے لوہے میں برقی رو پیدا کر کے اسے آگ بنا دیا تو کہا کہ مجھے (مخصوص قسم کا سیال) مہیا کرواؤ کہ میں لوہے کی پلیٹوں کے اوپر تک اس طرح بھر دوں کہ وہ برقی رو کو ایک لائن میں متحرک رکھ سکے۔

ردم ذوالقرنین اور مقناطیسی میدان

تشکیل ردم کے لئے استعمال کئے گئے الفاظ کی لغوی تحقیق سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ یہ 'ردم' دیوار یا پہاڑ کی طرح کی کوئی ٹھوس چیز نہیں ہے بلکہ

الصدفین، زبرالحدید، قطر اور افرغ علیہ جیسے الفاظ کی بنیاد پر اس چیز کی جو صورت تشکیل پاتی ہے وہ تقریباً اسی طرح ہے جیسے ٹرک اور کاروں میں لگائی جانے والی لیڈ بیٹری کی ہوتی ہے۔ کیونکہ دو مقناطیس کے درمیان مساوی طور پر نصب کی گئی پلیٹوں کو کسی سیال سے تبھی بھرا جاسکتا ہے جب وہ کسی مستطیل ڈبہ نما بکس میں رکھے گئے ہوں۔

اب مقناطیس، لوہے کی پلیٹ اور قطر کے درمیان تعامل کی مذکورہ تشریح کے بعد سائنس کا تھوڑا بہت علم رکھنے والے شخص کے سامنے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس قسم کے عمل کے ذریعہ جو اثر پیدا ہوتا ہے اسے طبیعیات کی اصطلاح میں ''الیکٹرومیگنیٹک فیلڈ'' یعنی برق مقناطیسی میدان کہا جاتا ہے۔ کیونکہ دونوں طرف موجود مقناطیس کے دباؤ کی وجہ سے سیال میں موجود الیکٹرون جب لوہے کی پلیٹوں کی چاروں اور گردش کرینگے تو ایسی صورت میں لوہے کی پلیٹیں بھی مقناطیس میں بدل جائینگی۔۔۔۔۔۔اب سائنسی علم کے مطابق جب کسی جگہ ایسے دو قسم کے مقناطیسی میدان جمع ہوجائیں جن میں سے ایک سیڈ میگنیٹک فیلڈ کا کام دیتا ہو اور دوسرا رین فورس کا تو ایسی صورت میں پہلا مقناطیسی میدان امپلیفائی ہوجاتا ہے یعنی بڑی صورت اختیار کرلیتا ہے۔

یاجوج ماجوج اور مقناطیسی میدان

سوال یہ ہے کہ اگر ذوالقرنین نے ''ردم'' کے ذریعہ اس قسم کا مقناطیسی میدان بنایا ہے تو وہ کہاں ہے اور یاجوج و ماجوج کے خلاف وہ کس طرح دوطرفہ

روک کا کام کر رہا ہے؟

فَمَا اسْطَاعُوا ۔۔وَمَا اسْتَطَاعُوا ۔

اسْطَاعُوا و اسْتَطَاعُوا: استطاع ،استطاعة الأمر : کسی کام کی طاقت رکھنا۔

استطاع ،یستطیع ،استطاعة کی تاء کو حذف کر کے اسطاع یسطیع بولنا بھی درست ہے، جیسا کہ زیر بحث آیت میں اس کی مثال موجود ہے۔لیکن حذف جائز ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بہت سے حضرات نے لکھا ہے کہ ''زیادتی حرف معنی کی زیادتی پر اور تخفیف حرف تخفیف معنی پر دلالت کرتی ہے''، اس اصول کے تحت معنی میں بھی فرق پیدا ہو جائیگا۔۔۔۔ لیکن یہاں ایک بات کی جانب توجہ دلانا چاہونگا کہ جب تاء کا حذف ماضی منفی کے ساتھ ہو تو ایسی صورت میں معنی میں مزید تاکید پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے موسی و خضر علیہما السلام کے واقعہ میں ہے۔ ذَٰلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِع عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۸۲ الکھف﴾ کہ یہ ان امور کی حقیقت ہے جن کے متعلق آپ ایک ذرہ برابر صبر نہ کر سکے۔

أَنْ يَظْهَرُوهُ :

ظهر ،یظهر ،ظهورا و ظهرا ۔ ظهر الشيئ : نمودار ہونا، ظاہر ہونا۔

ظهر البيت : مکان کی چھت پر چڑھنا۔

ظهر بفلان و عليه: کسی پر غالب آنا۔

ظھرہ: پیٹھ پر مارنا۔

''اسْطَاعُوا ''میں تاء کی تخفیف کی وجہ سے ''فَمَا اسْطَاعُوا أَنْ يَظْهَرُوهُ '' کا معنی ہوگا: یاجوج وماجوج کے لئے ردم کے اوپر کسی بھی طور نمودار ہونا یا چڑھنا ممکن نہیں رہا۔

ظھر الشیئ :بدا بعد خفائہ: چھپنے کے بعد نمودار ہونا۔ظہر کے اس معنی کے پیش نظر'' فَمَا اسْطَاعُوا أَنْ يَظْهَرُوهُ '' کا مطلب ہوگا: کہ ردم یعنی دوطرفہ روک میں داخل ہوکر پھنس جانے کے بعد اس سے نکل کر اوپر آنا بالکل ناممکن ہوگیا۔

نَقْبًا :

نقَبَ/نقَبَ عن يَنقُب، نَقْبًا ،فھو ناقِب، والمفعول مَنْقوب

نَقَبَ فِي الأَرْضِ: جانا،گھومنا،سفر کرنا۔

نقب عن الشیئ : کھوج لگانا،تلاش کرنا

نَقَبَ الأَرْضَ: حَفَرَهَا: زمین کھودنا۔

نَقَبَ الْحَائِطَ : ثَقَبَهُ، خَرَقَهُ۔ چھید کرنا

النقب: الطریق الضیق فی الجبل۔ دو پہاڑوں کے بیچ کا تنگ راستہ۔

نقاب: کان کن ۔

''نقب'' کا بنیادی معنی ہے ''تنگ راستے سے اندر تک گھس جانا''۔'' وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا '': ان کے لئے تنگ راستے سے گذر کر نیچے کی طرف پہونچنا بھی ناممکن ہوگیا۔

ملاحظہ فرمائیں کہ یہاں ''نقبہ'' نہیں بلکہ ''لَہُ نَقْبًا'' کی ترکیب استعمال ہوئی ہے۔ اگر ''وَمَا اسْتَطَاعُوا نَقْبہ'' کہا جاتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ردم ایسی ٹھوس چیز ہے کہ اس میں چھید کیا جا سکتا تھا؛ لیکن یاجوج و ماجوج کے لئے اس میں چھید کرنا ممکن نہیں رہا؛ لیکن ''لَہُ نَقْبًا'' میں لام حرف جار ''ملکیت'' کے معنی میں ہونے کی وجہ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ردم میں تنگ راستے یا سوراخ ہیں؛ لیکن ردم کے اثر کی وجہ سے وہ ان سے بھی گذر کر نیچے کی طرف نہیں پہونچ سکتے۔

''اوپر کی جانب نکل نہ سکنا اور دائیں بائیں سے زمین کی طرف پہونچ نہ سکنا'' یہ بات واضح کر رہی ہے کہ تہہ بتہہ روک کا کام زبر الحدید، الصدفین اور قطر کے تعامل سے پیدا شدہ ایسے اثر سے متعلق ہے جس کا دائرہ بیٹری نما ردم کی چاروں اور دور تک پھیلا ہوا ہے۔

ہم پچھلے صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ زبر الحدید، الصدفین اور قطر سے بننے والی بیٹری نما چیز میں آپسی تعامل کے نتیجہ میں ایک مقناطیسی میدان پیدا ہوتا ہے۔ ۔۔۔۔ دراصل یہ مقناطیسی میدان ہی ''ردم'' کا کام کر رہا ہے۔

چنانچہ ردم کے معنی کے پیش نظر اس مقناطیسی میدان میں داخل ہو کر پھنس جانے کے بعد یاجوج و ماجوج کے لئے اوپر کی طرف چڑھ نکلنا ناممکن ہو گیا۔ اب جس طرح داخل ہونے کا راستہ تو ہے لیکن اس کے باوجود مقناطیسی میدان کی تاثیر کی وجہ سے دوبارہ وہاں سے اوپر کی طرف نکلنا ممکن نہیں اسی طرح نیچے کی طرف

باریک اور تنگ راہ ہونے کے باوجود وہ نیچے کی طرف بھی آ نہیں سکتے۔

ظہر اور نقب کے لفظوں پر غور فرمائیں! ''ظہر'' ''اوپر یا عمودی'' سمت کو بتلاتا ہے جبکہ ''نقب'' ''افقی''۔ اس فرق کے پیش نظر گویا ''ردم'' یعنی مقناطیسی میدان میں داخل ہو کر بیچ میں پھنس جانے والے یاجوج و ماجوج دوبارہ اوپر نکل نہیں سکتے، بلکہ وہ اندر ہی گردش میں رہتے ہیں حتی کہ وہ دائیں بائیں مڑ جاتے ہیں۔ لیکن ردم کے دائیں بائیں والا حصہ کچھ اس قسم کا ہے کہ وہاں سے تنگ راہ ہونے کے باوجود وہ وہاں سے بھی گذر کر نیچے کی طرف نہیں پہونچ سکتے۔

اب اگر ''ردم'' سے مراد مقناطیسی میدان ہے تو وہ کہاں ہے اور دو طرفہ روک کا کام دینے والے مقناطیسی میدان میں آخر ایسا کس قسم کا اثر ہے کہ اس نے حرارت والی انتہائی تیز روشنی پر مشتمل ذرات کی شکل میں تیز رفتاری سے سفر کرنے والے یاجوج و ماجوج کو اپنے اندر اس طرح مقید کر لیا ہے کہ وہ وہاں سے اوپر کی طرف بھی نکل نہیں سکتے اور نیچے کی طرف بھی آ نہیں سکتے؟

مقناطیسی میدان کہاں ہے؟

معزز قارئین! یہ مقناطیسی میدان کہیں اور نہیں بلکہ ''زمین کی حفاظتی ڈھال'' کے نام سے معروف اور زمین کے گرد موجود یہی وہ مقناطیسی میدان ہے جس کا میکانزم زمینی سائنس کے سب سے بڑے معموں میں سے ایک گردانا جاتا ہے۔

ارے بھائی!۔۔۔۔ سائنس دانوں کے مطابق زمین کے ارد گرد موجود مقناطیسی میدان زمین کے قلب میں موجود پگھلے لوہے میں گردش کرتی برقی رو کے

نتیجہ میں وجود میں آیا ہے۔۔۔۔اور بھلا اتنے بڑے مقناطیسی میدان کی کسی انسانی ہاتھوں بنائی گئی ایسی چھوٹی موٹی ردم سے کیا نسبت؟

میرے پیارو! کلیجہ تھام کے بیٹھو۔ مانا کہ نامور سائنسی جرائد، کتب و رسائل سے لیکر اسکول اور کالج کی نصابی کتابوں تک سبھی جگہ یہ بات گویا ایک سائنسی حقیقت کے طور پر پڑھائی اور سمجھائی جاتی ہو کہ زمین کے اوپر موجود مقناطیسی میدان زمین کے بیرونی کور میں موجود مائع لوہے میں برقی رو کی گردش کے نتیجہ میں وجود میں آیا ہے؛ لیکن سچ یہ ہے کہ ڈائنامو نظریہ کے حامل ان سائنس دانوں کے پاس اس دعوے کے حق میں ایک بھی ثبوت نہیں بلکہ ایسے کئی دلائل موجود ہیں جن کی بنیاد پر بڑے بڑے سائنس داں اس مفروضے کو مسترد کر چکے ہیں۔

مقناطیسی میدان کا منبع، طریقۂ کار، اس کے وجود میں آنے کی وجہ اور اس کی عمر کیا ہے؟ ایسے تمام سوالات سائنس دانوں کے لئے اب تک معمہ بنے ہوئے ہیں۔ دنیا بھر کے سائنس داں مختلف نظریات، فیلڈ ورک اور کمپیوٹر ماڈل کے ذریعہ اسے حل کرنے کی ہر ممکن کوشش میں لگے ہوئے ہیں؛ لیکن یہ گتھی کسی طرح سلجھتی نظر نہیں آ رہی ہے۔

مقناطیسی میدان کیا ہے؟

مقناطیسی میدان (Magnetic field): کسی بھی مقناطیس کے اردگرد غیر مرئی مقناطیسی اثر کا حامل ایک علاقہ پایا جاتا ہے جسے مقناطیسی میدان کہا جاتا

ہے۔ بالفاظ دیگر ایک ایسا میدان جہاں مقناطیسی قوت محسوس کی جائے۔۔۔۔

ٹھیک اسی طرح زمین کے اردگرد بھی ایک بہت بڑا مقناطیسی میدان موجود ہے۔

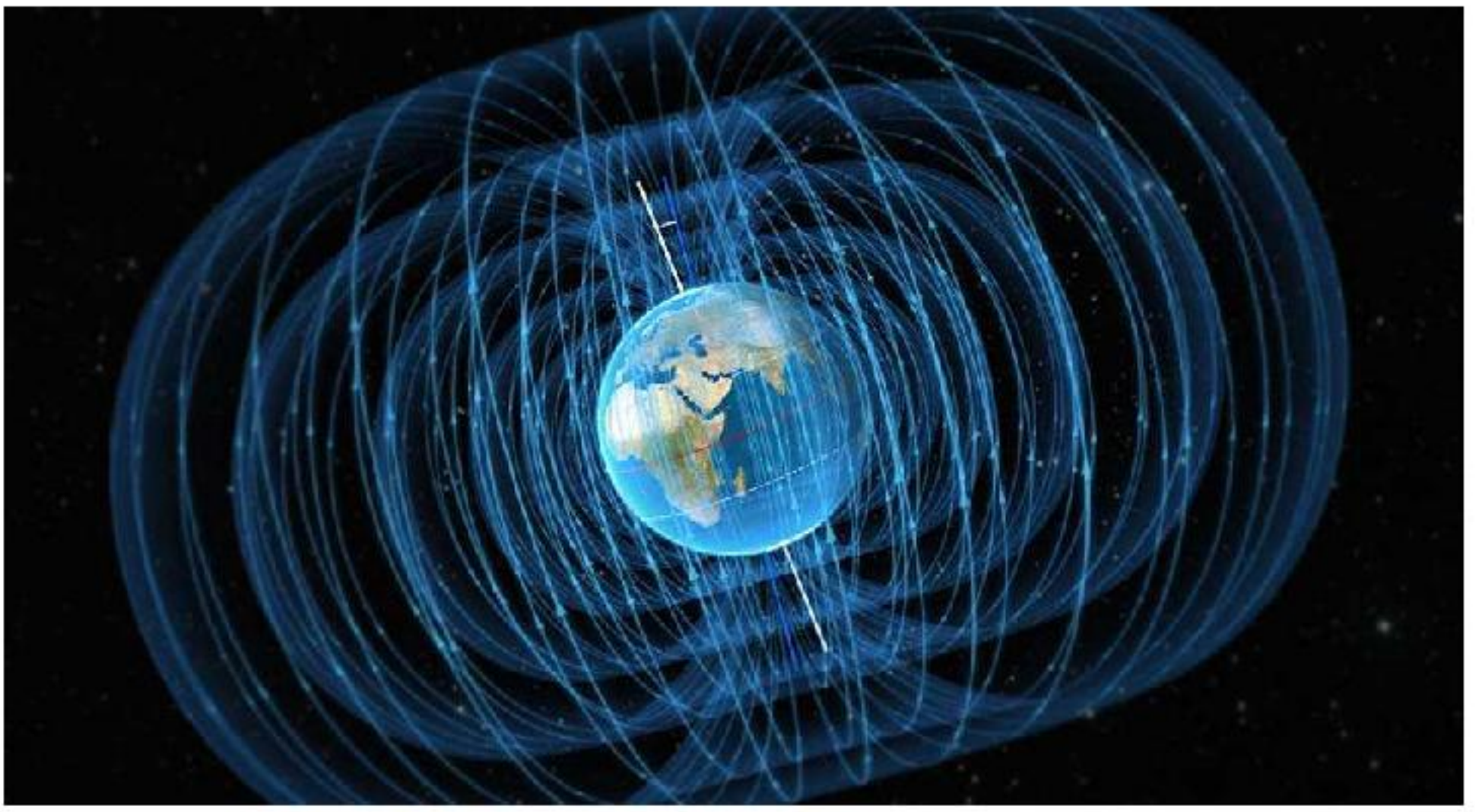

مقناطیس کی طرح کوئی بھی مقنایا ہوا مادہ دو قطبہ ہوتا ہے، ایک کو قطب شمالی تو دوسرے کو قطب جنوبی کہا جاتا ہے۔ مقناطیسی میدان غیر مرئی خطوط سے ملکر بنتا ہے، یہ خطوط شمال سے نکل کر جنوب کی طرف جاتے ہیں، پھر واپس جنوب سے شمال کی طرف آتے ہیں۔ اس طرح کسی بھی مقناطیسی قوت کے حامل مادے کے باہر ایک مقناطیسی میدان بن جاتا ہے۔

یاد رہے کہ زمین کا مقناطیسی شمالی قطب جغرافیائی قطب جنوبی میں واقع ہے جبکہ مقناطیسی جنوبی قطب جغرافیائی قطب شمالی میں واقع ہے۔ لیکن جغرافیائی قطب اور مقناطیسی قطب یکساں مقام پر واقع نہیں ہیں بلکہ دونوں ساڑھے گیارہ درجے کا زاویہ بناتے ہیں۔

قطب نما کی سوئی ہمیشہ مقناطیسی قطب جنوبی کو دکھلاتی ہے۔ لیکن زمین کے بہت سارے مقامات ایسے بھی ہیں جہاں قطب نما کی سوئی صحیح سمت کی جانب

اشارہ نہیں کرتی بلکہ بعض دفعہ قطب شمالی کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔

کرۂ فضائی کی طرح یہ میدان بالکل گول نہیں ہے بلکہ سورج کی سمت میں اس میدان کا حصہ تقریباً گول ہوتا ہے؛ لیکن جیسے جیسے زمین گردش کرتی جاتی ہے ویسے ویسے مخالف سمت میں یہ میدان مخروطی شکل اختیار کرتا جاتا ہے۔ سورج کی سمت میں سطح ارض سے اس میدان کی بلندی ۶۵۰۰۰ کلومیٹر ہے جبکہ اسکی دم تقریباً ۶ لاکھ کلومیٹر تک پھیلی ہوئی رہتی ہے۔

یہ مقناطیسی میدان ایک ''غیر مرئی حفاظتی ڈھال'' کا کام دیتا ہے۔ سائنسدانوں کے مطابق اگر زمین کے اردگرد یہ حفاظتی ڈھال نہ ہوتی تو سورج سے آنے والے شمسی طوفان اور دیگر نقصان دہ کائناتی تابکار شعاعیں انسانی زندگی کو ڈرامائی حد تک متاثر کردیتیں، کرۂ ارض پر انسانی زندگی کافی دشوار ہوجاتی بلکہ پیڑ پودوں سمیت حیوانات کی کئی اقسام نابود ہوجاتیں۔ اگر یہ میدان کسی طرح ختم ہوجائے تو مذکورہ بالا نقصانات کے علاوہ ٹیلی کمیونیکیشن سسٹم اور اسمارٹ فون میں میپنگ اور نیویگیشن سسٹم بھی معطل ہوجائینگے۔

کائناتی شعاعیں اور شمسی طوفان سے نکلنے والے اعلی توانائی کے حامل ذرات اس مقناطیسی کرہ میں داخل ہوکر اس میں پھنس جاتے ہیں۔ مقناطیسی میدان میں اس قسم کی اعلی توانائی کے حامل ذرات کے ڈونٹ نما دو حلقے ہیں۔ جن کے بیچ میں زمین واقع ہے۔ یہ حلقے یونیورسٹی آف آئیووا کے پروفیسر جیمز وان ایلن اور ان کے ساتھیوں نے ۱۹۵۸ء میں دریافت کی تھیں۔ انہیں کی جانب

منسوب کرتے ہوئے ان حلقوں کو وان ایلن ریڈی ایشن بیلٹس کہا جاتا ہے۔ کائناتی شعاعیں اور شمسی ہوا سے نکلنے والے کچھ ذرات اس بیلٹ میں پھنس کر قطبین کی طرف مڑ جاتے ہیں اور ہوا کے سالمات سے ملکر شمالی وجنوبی روشنیوں (Aroura) کے وجود میں آنے کا سبب بنتے ہیں۔

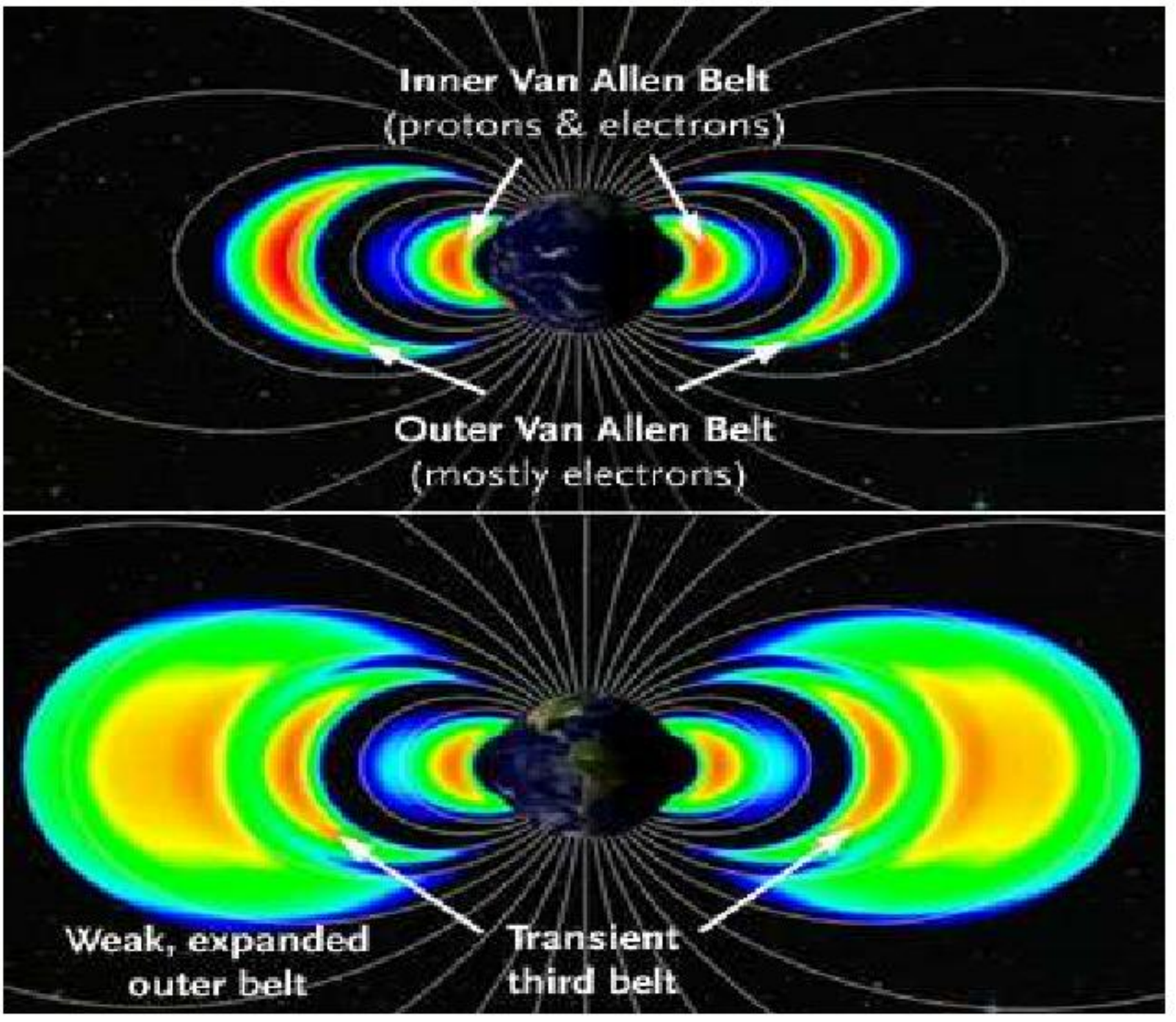

باردار ذرات : طبیعیات اور کیمیاء کی اصطلاح میں باردار ذرہ (charged particle) ایک ایسے ذرہ کو کہا جاتا ہے جو کسی مثبت یا منفی برقی بار (electric charge) کا حامل ہو۔ یہ ذرہ زیر جوہری ذرہ (subatomic particle) بھی ہوسکتا ہے اور آیون (Ion) بھی۔

ریڈی ایشن بیلٹ میں موجود باردار ذرات سطح زمین پر زندگی کو تو نقصان نہیں پہونچاتے لیکن یہ بین الاقوامی خلائی اسٹیشن، سیٹلائٹس اور خلابازوں کو کافی حد تک متاثر کر سکتے ہیں۔ اسی نقصان سے بچنے کے لئے چاند کے سفر کے دوران

ناسا نے خلابازوں کے لئے سب سے کم کثافت والے اس راستہ کا انتخاب کیا تھا جہاں یہ بیلٹ قدرے کم گہرائی رکھتے ہیں تا کہ خلائی جہاز سمیت خلابازوں کو بھی کم سے کم نقصان پہونچ سکے۔

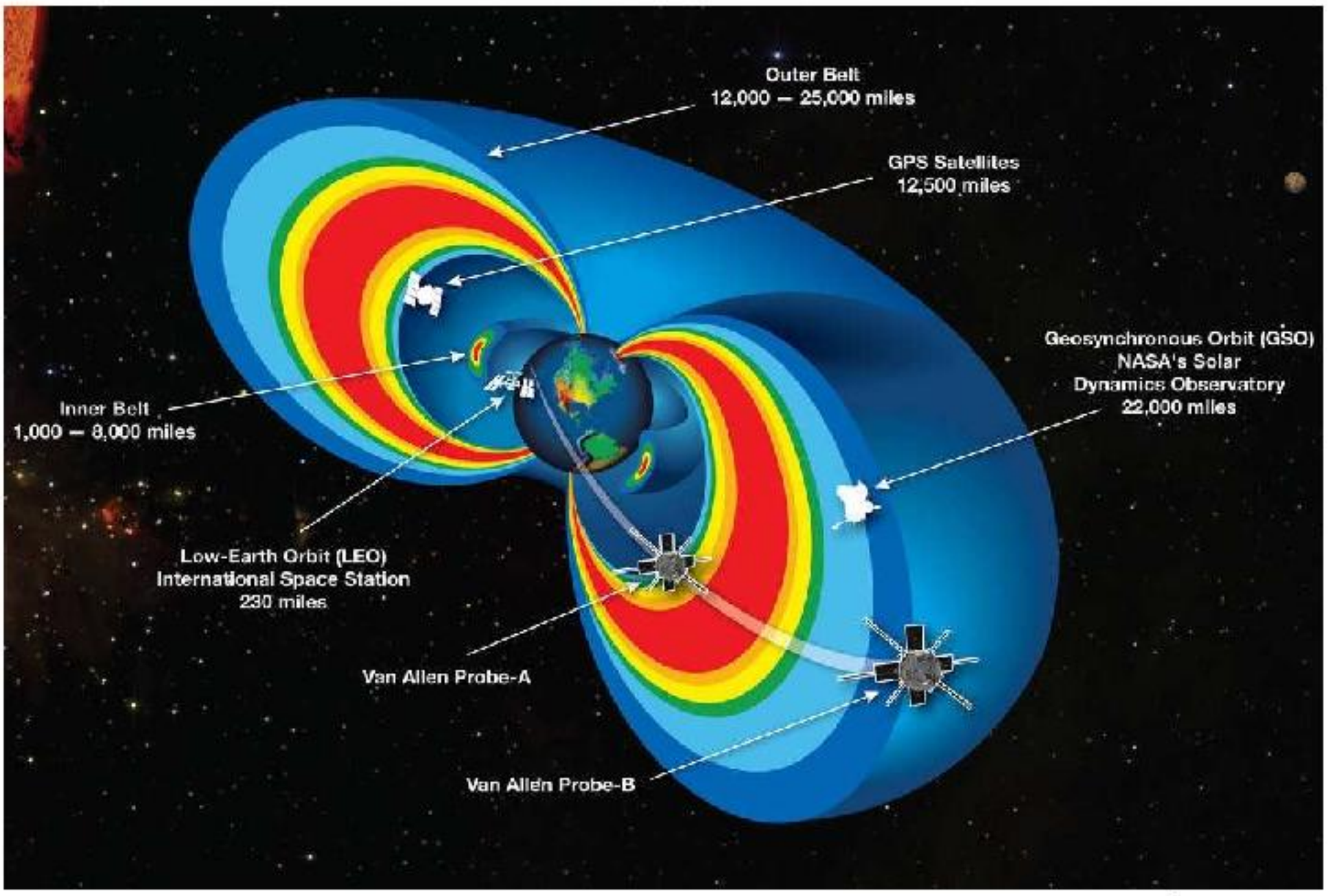

لیکن بیلٹ میں موجود یہ باردار ذرات اتنے باریک ہیں کہ بغیر حساس آلات کے انہیں کسی طرح محسوس نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ ۱۹۵۸ء میں ناسا کے مشن ایکسپلورر ا اسپیس کرافٹ (Explorer 1 Spacecraft) پر نصب کردہ cosmic ray detector کے ذریعہ پہلی مرتبہ ان کے بارے میں پتہ چلا تھا۔

کئی سیٹیلائٹ مطالعات کے بعد پتہ چلا کہ ان باردار ذرات کے بادلوں نے زمین کو ہر طرف سے گھیرا ہوا ہے۔ان بادلوں کی کثافت خط استواء کے آس پاس بہت زیادہ ہے لیکن جیسے جیسے قطبین کی طرف جاتے ہیں تو ان کی کثافت کم ہوتی جاتی ہے۔

ان ذرات کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۵۸ء

میں جب پہلی مرتبہ تابکاری بیلٹ کا انکشاف ہوا تو پہلے پہل سائنسدانوں کو ایسا محسوس ہوا کہ شاید وہ کوئی سوویت ایٹمی تجربہ کو ریکارڈ کر رہے ہیں۔

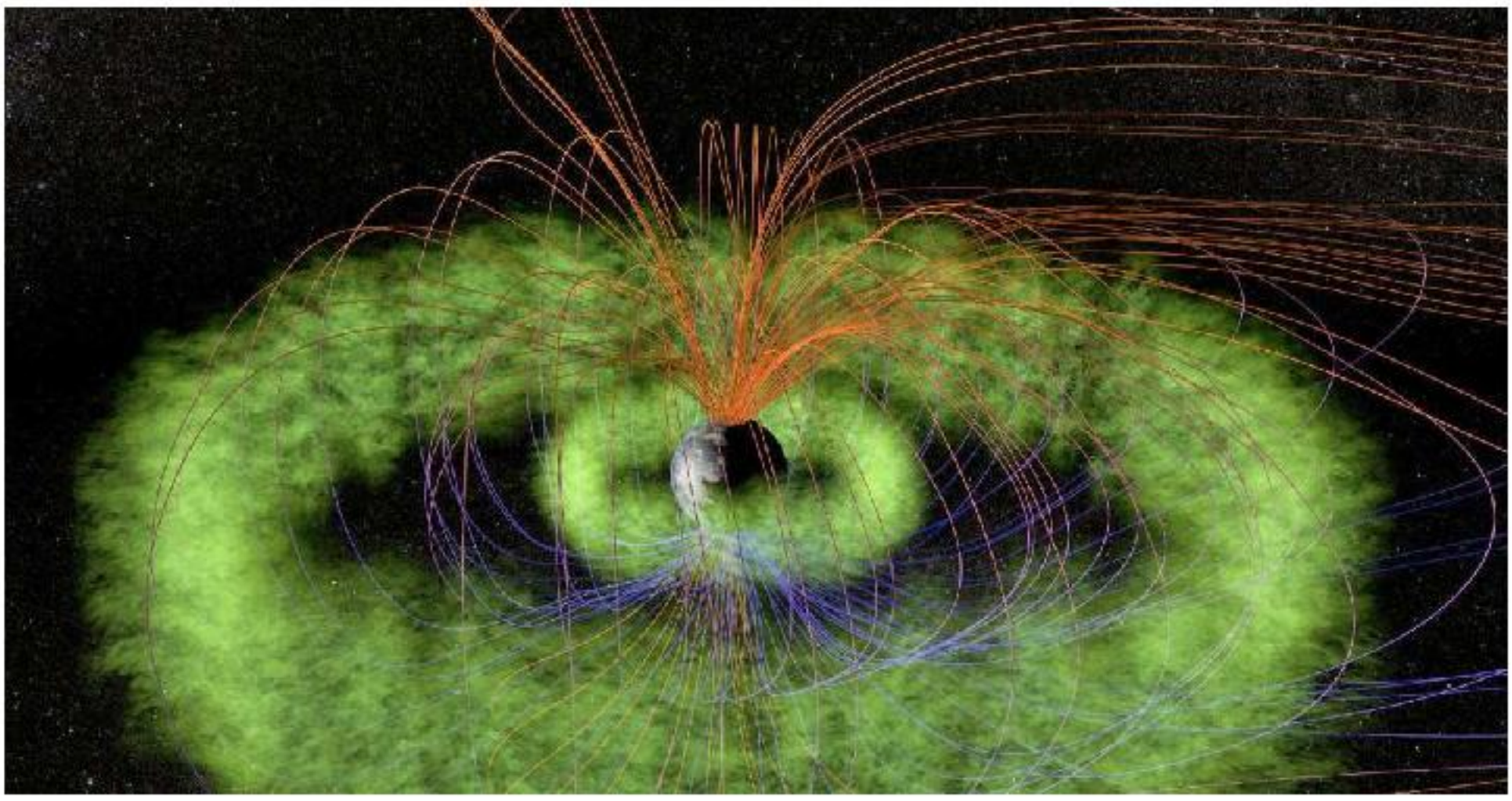

ناسا کی ویب سائٹ کے مطابق : پچھلے پچاس سالہ سیٹیلائٹ کے محتاط مطالعات کے مطابق ریڈی ایشن کی تین بیلٹیں ہیں ۔ دو الیکٹرون کی اور ایک پروٹون کی ۔ یہ انفرادی ذرات بہت زیادہ توانائی کے حامل ہیں۔

اندرونی وان ایلن بیلٹ اعلی توانائی والے پروٹونوں کا ایک علاقہ ہے، اس خطے میں چارج شدہ ذرات کی توانائی ۳۰۰۰۰۰۰۰ الیکٹران وولٹ سے زیادہ ہے۔ پروٹون اس علاقے میں انتہائی شدت کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔

پروٹون بیلٹ زمین کی سطح سے تقریباً ۵۰۰ کلومیٹر اوپر واقع ہے اور ۱۳۰۰۰ کلومیٹر تک پھیلی ہوئی ہے۔ سائنس دانوں کا فی الحال خیال ہے کہ یہ پروٹون نظام شمسی کے باہر سے آنے والی کائناتی شعاعوں کے ذرات یا ممکنہ طور پر شدید شمسی طوفانوں کے دوران خود سورج سے نکلے ہیں۔

اندرونی بیلٹ کی دریافت ۱۹۵۸ء میں ایکسپلورر ا کے ذریعہ ہوئی تھی۔

بیرونی حلقہ : ہائی انرجی الیکٹران بیلٹ : بیرونی وین ایلن بیلٹ کی ساخت بڑی حد تک انتہائی چارج شدہ ذرات پر مشتمل ہوتی ہے، اس خطے کے ذرات اندرونی حلقہ کے مقابلے میں نسبتاً کم توانائیاں رکھتے ہیں۔ تاہم ان کا بہاؤ بہت زیادہ ہوتا ہے، اس خطے میں الیکٹران اوسطاً ۱۰ سے ۱۰۰ ملین وولٹ توانائی کے حامل ہوتے ہیں۔

بیرونی تابکاری حلقہ عام طور پر زمین کی سطح سے تقریباً ۸۴۰۰ سے ۳۶۰۰۰ میل کی بلندی پر ہوتا ہے۔

بیرونی حلقہ کے اندر تابکاری کا سب سے شدید علاقہ زمین کی سطح سے تقریباً ۹۰۰۰ سے ۱۲۰۰۰ میل کے درمیان ہے۔

بیرونی حلقہ کی دریافت اندرونی حلقہ کی دریافت کے چند ماہ بعد Explorer IV اور Pioneer 3 کے ذریعہ ہوئی تھی۔

کم توانائی والی الیکٹرون بیلٹ : بیرونی اور اندرونی خطوں کے درمیان ایک تیسرا کمزور حلقہ بنتا ہے۔ اس میں الیکٹران اوسطاً ۱ سے ۵ ملین وولٹ توانائی کے حامل ہوتے ہیں۔

ریڈی ایشن بیلٹ میں موجود باردار ذرات کا سچ

عام طور پر ہر جگہ یہ بات پڑھنے سننے کو ملتی ہے کہ ان حلقوں میں موجود یہ باردار ذرات شمسی ہوا اور کائناتی شعاعوں سے نکل کر آتے ہیں ؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مقناطیسی میدان اور اس میں موجود بیلٹوں پر مسلسل تحقیقات کے باوجود

سائنس داں کسی بھی طرح یہ معمہ حل نہیں کر پائے ہیں کہ ان باردار ذرات کا منبع کیا ہے اور وہ اس قدر زیادہ توانائی کے حامل کیونکر ہیں؟ ملاحظہ فرمائیں امریکی سائنسی ادارہ ناسا کی ویب سائٹ کیا لکھتی ہے:

A Modern Mystery:

Although we have learned a lot about the Belt particles in the last 50 years, there are still some very big questions about them that, as yet, have no answers. Space physicists don't completely understand where they come from, or how their energies can be so 'astronomical' compared to either the plasmasphere particles or Ring Current particles. Typical 'Belt' particles carry energies between 1 and 100 million volts. The rest of the particles that we can encounter near the earth barely have energies higher than 200,000 volts. This means there is a BIG difference betwen the van Allen Belt particles and the others. It's such a big difference that its like comparing a cat and a dog and asking what their common ancestor might have been.

https://image.gsfc.nasa.gov/poetry/tour/AAvan.html

ترجمہ:

''ایک جدید معمہ:

اگرچہ ہم نے پچھلے ۵۰ سالوں میں بیلٹ کے ذرات کے بارے میں بہت کچھ سیکھا ہے، لیکن اب بھی ان کے بارے میں چند بہت بڑے سوالات ہیں جن کا ابھی تک کوئی جواب نہیں ہے۔

خلائی طبیعیات دان پوری طرح سے یہ نہیں سمجھ پائے ہیں کہ یہ ذرات کہاں سے آتے ہیں، یا ان کی توانائیاں کرۂ پلازما (اندرونی مقناطیسی کرہ) کے ذرات یا رنگ کرنٹ کے ذرات کے مقابلے میں اتنی زیادہ کیسے ہے۔ عام طور پر بیلٹ کے ذرات اسے ۱۰۰ ملین وولٹ کے درمیان توانائی کے حامل ہوتے ہیں۔ جبکہ باقی ذرات جن کا ہم زمین کے قریب مشاہدہ کر سکتے ہیں بمشکل ان کی توانائی ۲۰۰۰۰۰ وولٹ کے آس پاس ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وین ایلن بیلٹ کے ذرات اور دیگر ذرات کے درمیان بڑا فرق ہے۔ یہ فرق اتنا بڑا ہے کہ جیسے بلی اور کتے کا موازنہ کرتے ہوئے یہ پوچھا جائے کہ ان کا مشترکہ جد کیا رہا ہوگا''۔ الخ

الغرض ۱۹۵۸ کے بعد سے تابکاری حلقوں کا مسلسل مطالعہ جاری ہے۔ گزشتہ ستر سالوں میں ناسا کی جانب سے ایکسپلورر ۱ (Explorer 1 spacecraft) کے بعد ۲۰۱۲ میں پروب ۱ (Probe 1)، پروب ۲ (Probe 2) سیٹیلائٹ کے ذریعہ وان ایلن پروبس مشن کا آغاز بھی کیا ہے جن کا مقصد اس بات کی تعیین ہے کہ یہ تابکاری ذرات ان حلقوں میں کس طرح داخل

ہوتے ہیں، وہ کہاں غائب ہوجاتے ہیں اور وہ کونسا عمل ہے جو ان ذرات کو اس قدر زیادہ تیز رفتار اور اعلی توانائی کا حامل بنا دیتا ہے۔ مگر مسئلہ حل ہونے کی بجائے دیگر کئی ایسے سوالات جنم لے چکے ہیں جنہیں آج تک حل نہیں کیا جاسکا۔

مقناطیسی میدان کا منبع

ذوالقرنین نے جو ردم بنائی ہے اگر وہ یہی زمین کے گرد موجود مقناطیسی میدان ہی ہے تو سوال یہ ہے کہ اس میدان میں موجود تابکار ذرات کی حقیقت کیا ہے اور یاجوج وماجوج کہاں ہیں؟

لیکن اس سے پہلے یہ بات سمجھ لیتے ہیں کہ سائنسدانوں کے نزدیک زمین کے گرد موجود مقناطیسی میدان کے وجود میں آنے کی توجیہ کیا ہے۔

مقناطیسی میدان کے میکانزم کے متعلق اس سوال کا صحیح جواب کسی کے پاس نہیں۔ زمین کے گرد مقناطیسی میدان کی دریافت کے بعد سے ہی سائنس داں مختلف نظریات کے ذریعہ مسلسل اس گتھی کو سلجھانے میں لگے ہوئے ہیں کہ آخر یہ میدان کس طرح وجود میں آیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں کئی نظریات پیش کئے گئے جن میں ایک آئرن کور تھیوری ہے۔

آئرن کور تھیوری : اس نظریہ کے مطابق ایک لمبی مدت تک یہ سمجھا جاتا رہا کہ زمین کے مرکز میں مقناطیسی خصوصیت کا حامل مخصوص قسم کا لوہا موجود ہے، اسی کی وجہ سے یہ مقناطیسی میدان وجود میں آیا ہے۔ لیکن کیوری ٹمپریچر پر جدید تحقیقات سے جب یہ معلوم ہوا کہ ایک مخصوص درجۂ حرارت پر مقناطیسی مادے

اپنی مقناطیسی خصوصیات کھودیتے ہیں تو آئرن کور تھیوری کو مسترد کردیا گیا کیونکہ زمین کے مرکز میں درجۂ حرارت اتنا زیادہ ہے کہ وہاں لوہا اپنی مقناطیسی خصوصیت کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔

مشہور زمانہ ڈائناموتھیوری: اس نظریہ کے مطابق زمین کے گرد مقناطیسی میدان کے وجود میں آنے کی بنیادی وجہ زمین کے قلب کے بیرونی کور میں موجود مائع اور انتہائی گرم لوہے میں پیدا ہونے والی برقی رو ہے۔

۱۹۱۹ء میں سر جوسیف لیمر (Sir Joseph Larmor) نے پہلی بار (theory of sel-sxcited dynamos) خودکار ڈائناموتھیری متعارف کروائی تھی۔ اس نظریہ کو کافی شہرت ملی، عوامی سطح پر اس نظریہ کو ایک سائنسی حقیقت کے طور پر پیش کیا جانے لگا؛ لیکن اس نظریہ کے رد میں اتنے زیادہ دلائل سامنے آئے کہ مقناطیسی میدان کی توجیہ کے لیے اب اہل علم اس نظریہ کو کسی بھی طرح قابل قبول نہیں گردانتے۔ البتہ سائنسی لیٹریچر میں اب تک اسی نظریہ سے کام چلایا جارہا ہے۔

مقناطیسی میدان کا منبع اور ردم ذوالقرنین

زمین کے مقناطیسی میدان کی حقیقت جدید طبیعیات کے سب سے زیادہ حیران کن اور پیچیدہ مسائل میں سے ایک ہے۔ مقناطیسی میدان کی دریافت کے بعد اسے سمجھنے کی مسلسل کوشش کی جارہی ہے، کئی نظریات وجود میں آئے، دنیا بھر کے مختلف سائنسی اداروں کے علاوہ فرانس، جاپان اور امریکہ جیسے ممالک مشترکہ

مشن کے تحت بھی کام پہ لگے ہوئے ہیں۔

زمین کے اندر و باہر کہیں بھی مقناطیسی میدان کے میکانزم کا اتہ پتہ نہ ملنے کے بعد آیئے ہم یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مقناطیسی میدان اور ردم ذوالقرنین میں کیا تعلق ہے۔

''یاجوج و ماجوج، ظہر، نقب اور من کل حدب ینسلون'' جیسے الفاظ کی لغوی تحقیق سے یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ یاجوج اور ماجوج ایک خلائی مخلوق ہے۔

نیز مذکورہ بالا الفاظ کی لغوی تحقیق سے یہ بات بھی عیاں ہے کہ یاجوج و ماجوج اپنے آپ کو انتہائی زیادہ روشنی اور حرارت والے ذرات میں بدلکر زمین پر وارد ہوا کرتے تھے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ انتہائی زیادہ روشنی اور حرارت والے ذرات پر مشتمل یاجوج ماجوج کے ساتھ مقناطیسی میدان کا ردعمل کیسا ہے۔ اور ریڈی ایشن بیلٹ میں موجود باردار ذرات کی حقیقت کیا ہے۔۔۔۔۔لیکن اس سے پہلے آیئے ہم ردم کے میکانزم کو سمجھ لیتے ہیں کہ قرآن نے ردم کی تعمیر میں جن چیزوں کو جس ترتیب کے ساتھ استعمال کرنے کا طریقہ بیان کیا ہے اس کے مدنظر کیا تعمیر شدہ ردم کے ذریعہ ایسے اثرات پیدا ہو سکتے ہیں جس پر مقناطیسی میدان کا اطلاق کیا جا سکے؟

تنبیہ: یاد رہے کہ ''ردم'' کا مصداق زبر الحدید، الصدفین اور قطر سے ملکر

بننے والی بیٹری نما چیز نہیں بلکہ تہہ بتہہ منقسم یہی مقناطیسی میدان ہے جس میں باردار ذرات پھنسے ہوئے ہیں۔ لیکن پھر بھی یوں کہیے کہ ''مایؤول'' کے تحت یا وقتی طور پر ہم زبر الحدید، صدفین اور قطر سے بننے والی چیز کو بھی ردم سے ہی تعبیر کرینگے۔

مقناطیسی میدان کیسے وجود میں آسکتا ہے؟

سائنس دانوں کو زمین کے گرد موجود مقناطیسی میدان کی توجیہ بیان کرنے میں اب تک کامیابی تو نہیں ملی؛ لیکن اس کے میکانزم کے متعلق کام کرنے والے بہت سارے سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ اس قسم کے مقناطیسی میدان کے وجود میں آنے کے لئے چند بنیادی شرائط ہیں۔

۱۔(motion of electric charges) برقی بار کا حرکت میں ہونا۔

۲۔(curent cayring cundector)موصل (برقی بار کی حرکت کا ذریعہ)۔

۳۔(seed magnetic feald)بیج کا کام دینے والا مقناطیسی میدان۔

اگر مذکورہ بالا شرائط کہیں موجود ہوں تو ان سے ایک بڑا مقناطیسی میدان وجود میں آسکتا ہے۔

چنانچہ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ کیا سائنس دانوں کی بیان کردہ یہ شرائط ''ردم'' کے اندر موجود ہیں۔

الف: اولاً ''الصدفین'' یعنی مخصوص قسم کے دو مقناطیس کے درمیان لوہے کی

پلیٹیں ایک دوسرے کے مساوی نصب کرنے کے بعد ان کے درمیان عمل نفخ یعنی برقناطیسی امالہ کے ذریعہ لوہے کی پلیٹوں میں برقی رو پیدا کیا گیا۔۔۔۔موجودہ سائنسی اصطلاح میں اس طرح کی لوہے کی پلیٹوں کو (curent cayring cundector) یعنی موصل کہا جائیگا۔

ب: لوہے کی پلیٹوں میں پیدا ہونے والی برقی رو (Eddy Current) کو قابو کر کے انہیں ایک مخصوص سمت میں رواں دواں رکھنے کے لئے پلیٹوں کے خلا کو اوپر نیچے ہر طرف مخصوص قسم کے سیال سے بھر دیا گیا۔

ت: اس سیال میں حرکت پذیر برقی رو جب ایک صدف یعنی مقناطیس کی طرف جاتی ہے تو اس کا مقناطیسی میدان انہیں دھکا دے کر واپس کر دیتا ہے، جب یہ برقی رو دوسری جانب جاتی ہے تو وہاں سے بھی واپس کر دی جاتی ہے۔

یا برقی رو پر مشتمل سیال جب ایک صدف کی طرف جاتا ہے تو اسے کمانی شکل یا مخصوص نوعیت کا مقناطیس راستہ بدلنے پر مجبور کر دیتا ہے، اسی طرح جب وہ دوسری طرف جاتا ہے تو اس طرف سے بھی اسی صورت حال کا سامنا ہوتا ہے اور اس طرح برقی رو اپنے سیال کے ساتھ مسلسل حرکت میں رہتی ہے۔۔۔۔۔۔اس طرح برقی رو حرکت میں رہ کر سائنسی اصول کے مطابق زبر الحدید یعنی لوہے کی پلیٹوں کو بھی مقناطیس میں بدل کر ان کے گرد بھی مقناطیسی میدان بنا دیتی ہیں۔

ث: اب یہاں الصدفین کی صورت میں پہلے سے دو مقناطیسی میدان موجود ہیں اور پلیٹوں کے گرد الیکٹران کی حرکت کی وجہ سے وہ بھی مقناطیسی میدان کی

حامل ہو چکی ہیں۔تو سوال یہ ہے کہ ان میں سیڈ میگنیٹک فیلڈ کا کام کون دے رہا ہے اور رین فورس کا کام کون؟

تکبیر مقناطیسی میدان

زمین کے گرد مقناطیسی میدان کا وجود ایک امر واقعہ ہے، اسی طرح بعض سائنس دانوں کا یہ بھی ماننا ہے کہ اس طرح کا مقناطیسی میدان ستاروں اور سیاروں کے گرد بھی ہونا چاہیے؛ لیکن جس طرح زمین کے گرد موجود مقناطیسی میدان کا منبع ایک معمہ بنا ہوا ہے اسی طرح سائنس دانوں کے سامنے ایک بڑا سوال یہ بھی ہے کہ ہزاروں لاکھوں کلومیٹر دور تک پھیلا ہوا اتنے بڑے پیمانے کا مقناطیسی میدان کیسے وجود میں آتا ہے؟۔ دنیا بھر کے سائنس داں کئی دہائیوں سے اس مسئلہ کو انفرادی اور اجتماعی سطح پر مختلف تھیوریز اور کمپیوٹنگ ماڈلز کے ذریعہ سلجھانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔۔۔۔اس باب میں سائنس داں جس نظریہ کو صحیح مان کر چل رہے ہیں وہ (Seed Magnetic Field and Rein force Magnetic Field) یعنی بیج مقناطیسی میدان والا نظریہ ہے۔ جس کے مطابق ایک چھوٹے پیمانے کے مقناطیسی میدان کو جب دوسرے مقناطیسی میدان سے طاقت ملتی ہے تو وہ بڑا بن جاتا ہے۔

لیکن اس باب میں عملی طور پر انہیں ابھی تک کامیابی نہیں ملی ہے البتہ پلازما کے ذریعہ اس عمل کو دوہرا کر تجربہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جس میں ملی قدرے کامیابی کی وجہ سے سائنس دانوں کو اس نظریہ میں کچھ سچائی نظر آرہی ہے۔ ملاحظہ

فرمائیں: ۹ فروری ۲۰۱۸ء کو ''نیچر ڈاٹ کام'' پر (Laboratory evidence of dynamo amplification of magnetic fields in a turbulent plasma) شائع ہونے والا مضمون۔

البتہ ذوالقرنین کی تعمیر کردہ ردم میں اس کا عملی نمونہ موجود ہے۔۔۔۔۔

اب ہمیں دیکھنا ہوگا کہ پہلے سے موجود دو مقناطیس یعنی ''الصدفین'' اور سیال میں موجود الیکٹرون کی گردش کی وجہ سے ''زبرالحدید'' یعنی لوہے کی پلیٹوں کے گرد بنے مقناطیسی میدان کس طرح ایک دوسرے پر اثر انداز ہو کر ایک بڑا مقناطیسی میدان تشکیل دیتے ہیں۔ یا پھر تین یا اس سے زائد لوہے کی پلیٹوں کے گرد پیدا ہونے والے مقناطیسی میدان ہی آپس میں اثر انداز ہو کر ایک بڑا مقناطیسی میدان وجود میں لا رہے ہیں۔

الغرض میکانزم کچھ بھی ہو لیکن یہاں تک کی وضاحت کے بعد اس دعوی کے انکار کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ تعمیر ردم کے لیے اپنائے گئے طریقہ کے نتیجہ میں جو اثر پیدا ہوتا ہے وہ صرف اور صرف اسی قسم کے مقناطیسی میدان پر صادق آتا ہے جیسا کہ زمین کے گرد موجود ہے۔

اور ظاہر سی بات ہے کہ معروف مقناطیسی میدان کے علاوہ دوسرا ایسا کوئی میدان نہیں جس پر ردم کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے اثر کا اطلاق کیا جا سکے۔

مقناطیسی میدان کا تہہ بتہہ منقسم ہو کر اس میں مقید تابکاری ذرات کا وجود اس بات کی بڑی دلیل ہے کہ تہہ بتہہ پرتوں سے ملکر بننے والی یہی وہ روک ہے جو

ذوالقرنین نے سد کے بجائے ردم کہہ کر بنائی تھی۔

یاد رہے کہ

تعمیر ردم کے باب میں جہاں کہیں کام کی نسبت قوم کی جانب کی گئی ہے دراصل وہ قوت اور کام کی ضخامت کو بتلاتا ہے جبکہ جس کام کی نسبت ذوالقرنین کی جانب کی گئی ہے وہ علم وحکمت اور کاریگری کی علامت ہے۔ چنانچہ ''آتونی'' میں ضمیر جمع اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ لوہے کی پلیٹیں بنانا اور سیال فراہم کرنا آٹھ دس لوگوں کے بس کا کام نہیں تھا بلکہ اس کے لئے کافی افراد درکار تھے۔ اسی طرح ''انفخوا'' میں ضمیر جمع عملیت امالہ کے بھاری پن کو بتلا رہی ہے کہ جن مقناطیس اور لوہے کی پلیٹوں میں امالہ انجام دیا گیا وہ کافی بڑے اور بھاری بھرکم تھے۔ جبکہ ''حتی اذا جعلہ ناراً'' اور ''افرغ'' میں ضمیر واحد ذوالقرنین کی حکمت وسائنس دانی کو بتلا رہی ہے کہ لوہے کی پلیٹوں میں برقی رو کا پیدا ہونا اور اس کے بعد اس کے ذریعہ مقناطیسی میدان کا وجود میں آنا یہ ذوالقرنین کو عطا کردہ علم وسائنس کی بدولت تھا۔

اب یہ ردم کتنی بڑی اور لمبی چوڑی ہوسکتی ہے، اس کا اندازہ مقناطیسی میدان کی طاقت، کثافت اور بلندی کے ذریعہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔

خارجی قرائن

لیکن کیا ہمارے پاس ایسے کوئی خارجی قرائن ہیں جن کی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکیں کہ زمین کے گرد موجود مقناطیسی میدان وہی مقناطیسی میدان ہے جو

''ذوالقرنین کی تعمیر کردہ ردم'' کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے؟۔۔۔۔۔۔اس کے جواب میں بہت سے شواہد پیش کئے جاسکتے ہیں، جن میں سے چند حاضر ہیں۔

نمبر ۱: زمین کے گرد موجود مقناطیسی میدان کسی ایسے مقناطیس کا نتیجہ ہونا چاہیے جو بار میگنیٹ کی شکل میں یعنی سلاخ دار قسم کا ہو۔۔۔آج تک جتنے بھی نظریات پیش کئے گئے ان کی بنیادی کمزوریوں میں سے ایک بات یہی تھی کہ وہ بار میگنیٹ پر صادق نہیں آتی تھی، جبکہ بیٹری نما ''ردم'' کی بناوٹ بار میگنیٹ پر بالکل فٹ بیٹھتی ہے۔

نمبر ۲: عام طور پر ساری دنیا یہی بات جانتی ہے کہ زمین کے دو ہی مقناطیسی قطب ہیں: قطب شمالی اور قطب جنوبی۔لیکن ''ناسا'' کی تحقیقات کے مطابق زمین کے صرف دو قطب نہیں بلکہ تقریباً ۸ قطب ہیں۔البتہ ان میں سے دو طاقتور اور نمایاں ہیں جنہیں ہم جانتے ہیں جبکہ بقیہ کمزور ہیں۔ملاحظہ فرمائیں:

Does the Earth have more than two magnetic poles

Yes, but only two of them are dramatically obvious.....

Anyway, the earth has two dominant magnetic poles, and several very weak 'quadrupolar' poles of which there are, at least mathematically, about 8 in number. These poles are far weaker than the dipole field, and measure only weak departures of the local geographic field strength from the basic dipolar North-South field.

https://image.gsfc.nasa.gov/poetry/ask/a11813.html

اب جس طرح مقناطیسی میدان کا میکانزم ایک معمہ ہے اسی طرح اس میدان میں اتنے سارے قطب کس طرح وجود میں آئے ہیں اس کے بارے میں بھی سائنس داں کوئی حتمی بات نہیں کر سکتے۔

لیکن اس کا جواب ہمیں ردم کی تشکیل میں استعمال ہونے والے الصدفین ، زبرالحدید اوران کے گرد الیکٹرون کے حامل سیال کے گردش کرنے کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے مختلف مقناطیسی میدانوں سے مل سکتا ہے۔

نمبر ۳: مقناطیسی میدان کے وجود میں آنے کے لئے سیڈ میگنیٹک فیلڈ کا ہونا ضروری ہے۔آج تک جتنے بھی نظریات پیش کئے گئے ان کے لئے یہ ایک چیلینج رہا ہے کہ سیڈ میگنیٹک فیلڈ کی کمی کو کیسے پورا کیا جائے!۔۔۔لیکن ردم میں یہ بات بالکل واضح ہے۔

نمبر ۴: مقناطیسی میدان میں موجود وان ایلن بیلٹ کی توجیہ بھی کسی نظریہ کے ذریعہ ممکن نہیں کہ آخر مقناطیسی میدان میں اس قسم کی بیلٹ کیونکر وجود میں آئیں!۔۔۔جبکہ ردم کے معنی میں ہی یہ چیز شامل ہے کہ کوئی ایسی چیز بنائی جائیگی جو دوطرفہ یا تہہ بتہہ روک کا کام دیگی۔

اگر یہ بات سچ ہے کہ پلیٹوں کی وجہ سے یہ بیلٹ وجود پذیر ہوئی ہیں تو پھر بیلٹ دو کی بجائے کم از کم تین ضرور ہونی چاہیے؛اس لئے کہ ''زبر'' جمع ہے،جس کے لئے کم سے کم تین کی تعداد کا ہونا ضروری ہے۔۔۔۔حیرت کی بات ہے کہ

ان بیلٹ کی تعداد دو نہیں جیسا کہ مشہور ہے بلکہ تین یا زائد بھی ہوسکتی ہے جیسا کہ ۲۰۱۲ء میں مقناطیسی میدان پر تحقیقات کے لئے ناسا کی جانب سے روانہ کئے گئے دو سیٹیلائٹ کے مشاہدہ سے پتہ چلا ہے۔

نمبر ۵: ''فَمَا اسْطَاعُوا أَنْ يَظْهَرُوهُ'' اور ''وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا'' کے ذریعہ روشنی اور حرارت والی توانائی کے حامل ذرات کے ساتھ ردم کے اثرات کا جو تعامل بیان کیا گیا ہے وہ مقناطیسی میدان کے ساتھ بالکل چسپاں ہوجاتا ہے۔

یاجوج و ماجوج اور ان کے لیے مستعمل مفسدون اور ینسلون جیسے افعال کی لغوی تحقیق سے یہ بات بالکل واضح ہوچکی ہے کہ یاجوج و ماجوج ایک ذی شعور خلائی مخلوق ہے لیکن جب وہ زمین کی طرف آیا کرتے تھے تو وہ روپ بدلکر تیز روشنی اور حرارت پر مشتمل انتہائی اعلی توانائی کے حامل ذرات کی شکل میں غیر معمولی تیز رفتاری سے آیا کرتے تھے ۔۔۔۔ سائنسی تحقیقات کے مطابق وان ایلن بیلٹ میں موجود نا معلوم ذرائع سے آنے والے الیکٹرون اور پروٹون بھی غیر معمولی توانائی کے حامل تیز رفتار ذرات ہی ہیں ۔۔۔۔ اور عدم ظہر اور عدم نقب کی جو صفت یاجوج ماجوج کے متعلق بیان ہوئی ہے وہی بات وان ایلن بیلٹ کے ان ذرات میں بھی پائی جاتی ہے۔

تو کیا وان ایلن بیلٹ میں موجود انتہائی زیادہ توانائی کے حامل ذرات ہی یاجوج و ماجوج کی بدلی شکل ہیں؟ ۔۔۔۔ بہت ممکن ہے ۔۔۔۔۔۔ اس لئے کہ

آیت نمبر ۹۷ ''فَمَا اسْطَاعُوا أَنْ يَظْهَرُوهُ وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا ﴿۹۷﴾''

ہمیں یہ بات بتلاتی ہے کہ یاجوج و ماجوج اس ردم میں اس طرح پھنس چکے ہیں کہ نہ وہ اوپر نکل سکتے ہیں اور نہ زمین کی طرف آسکتے ہیں ۔اب اس مقناطیسی میدان میں اگر کوئی ایسی مقید چیز ہے جس پر یاجوج و ماجوج کے معانی وخصائص چسپاں ہوسکتے ہیں تو وہ انتہائی تیز رفتار اور اعلی توانائی کے حامل الیکٹرون اور پروٹون کے باردار ذرات ہی ہیں۔

الغرض اس طرح مقناطیسی میدان کے متعلق ان تمام سوالات کا جواب مل جاتا ہے جن کے حل کرنے کے لئے سائنس داں پریشان ہیں ۔اور یہ بات مزید پختہ ہوجاتی ہے کہ زمین کے گرد موجود عظیم الشان مقناطیسی میدان قدرتی عوامل کا نتیجہ نہیں بلکہ اسی ذوالقرنین کی تعمیر کردہ ردم کا ہی نتیجہ ہے جسے خالق کائنات نے روئے زمین کے تکوینی معاملات میں بے پناہ قدرت عطا فرمائی تھی۔

الغرض اس قسم کے دیگر بہت سے دلائل ہوسکتے ہیں ، میں نے اپنی معلومات کے مطابق اس بارے میں کچھ کہنے کی کوشش کی ہے، اہل علم اس کی تصحیح فرمائینگے۔۔۔۔ان شاءاللہ بہت جلد سائنس داں اپنی تحقیقات کے ذریعہ خود یہ بات ثابت کردینگے کہ زمین کے گرد موجود مقناطیسی میدان ذوالقرنین کے ذریعہ تعمیر کردہ ''ردم'' کے نتیجہ میں ہی وجود میں آیا ہے۔

ردم کہاں ہے؟

تو اب ہمارے سامنے ایک اہم سوال یہ ہے کہ اگر ذوالقرنین نے اس

قدر عظیم الشان مقناطیسی میدان کے پیچھے کارفرما ''ردم'' نامی کوئی چیز بنائی ہے تو یقیناً وہ بھی وسیع وعریض رقبے پر ہی پھیلی ہونی چاہیے؛ لہٰذا وہ کہاں ہے، اور وہ ہمیں کہیں نظر کیوں نہیں آتی؟

یاجوج و ماجوج کی وجہ تسمیہ، سورۂ کہف میں وارد ''فَمَا اسْطَاعُوا أَنْ يَظْهَرُوهُ'' اور سورۂ انبیاء میں وارد ''وھم من کل حدب ینسلون'' کے الفاظ سے یہ بات طے ہوجاتی ہے کہ یاجوج و ماجوج خلا کی جانب سے ہی آیا کرتے تھے۔ انہی کو روکے رکھنے کے لئے مقناطیسی میدان بنایا گیا ہے تو اب اہم سوال یہ ہے کہ وہ کونسا علاقہ ہے جہاں ذوالقرنین نے ردم بنائی ہے۔

بین السدین سے جنوبی امریکہ میں موجود ایمیزون کے جنگل کے آس پاس کا علاقہ طے ہوجانے کے بعد ظاہر سی بات ہے کہ ''ردم'' بھی کسی ایسے ہی علاقہ میں ہونی چاہیے جو ایمیزون کے آس پاس رہنے والی قوم کے علاقہ کے قریب واقع ہو۔

اب سدین کے مقابلہ ردم کی تعمیر کا جس انداز سے قرآن نے تفصیلی تذکرہ کیا ہے، اس کے پیش نظر ردم کا وجود روئے زمین پر کہیں نہ کہیں ملحوظ شکل میں ضرور ہونا چاہیے۔

لیکن حفاظتی حکمت و مصلحت کے پیش نظر عین ممکن ہے کہ ذوالقرنین نے یہ ردم سطح زمین کے بجائے کسی قدر گہرائی میں بنائی ہو۔ اور اگر سطح زمین پر بنائی ہوتی تب بھی مرور زمانہ سے اس کا حال اہرام مصر اور ہزاروں سال پرانی نو دریافت

تعمیرات کی طرح ہوتا جن پر مٹی کے ڈھیر اور درختوں نے قبضہ کر کے انہیں بالکل ڈھانپ دیا تھا اور ماضی قریب میں ہی انہیں کھوج نکالا گیا ہے؛ لہٰذا ان نو دریافت عمارتوں اور کھنڈرات سے بھی ہزاروں سال پہلے بنائی گئی ردم کا اسی طرح کہیں پوشیدہ ہو جانا عین ممکن ہے۔

لہٰذا ظاہری آنکھوں سے اسے تلاش کر لینا ایک مشکل مسئلہ ہے، البتہ لیڈار جیسی ٹکنالوجی کے ذریعہ اس کا پتہ لگانا آسان ہے اور ان شاء اللہ وہ وقت دور نہیں جب یہ ردم بھی لوگوں کی نگاہوں کے سامنے واشگاف ہو جائیگی۔ لیکن سر دست ہمارے پاس اس تک پہونچنے کے کئی ایسے راستے ہیں جن سے کم از کم اس دعوے کو تقویت ضرور ملیگی کہ یہ ردم جنوبی امریکہ کے کسی علاقہ میں ہی بنی ہے۔

ردم ذوالقرنین اور ساؤتھ اٹلانٹک انومل

یورپی خلائی ادارے کے (Swarm) 'سوارم' سیٹلائٹس کے حاصل کردہ اعداد و شمار کے مطابق جنوبی بحر اوقیانوس کے علاقے کے اوپر مقناطیسی میدان میں ایک غیر معمولی پن کے حامل علاقہ کا انکشاف ہوا ہے۔ اسے (South Atlantic Anomaly-SAA) جنوبی اوقیانوسی بے ضابطگی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ علاقہ جنوبی امریکہ سے جنوب مغربی افریقہ تک پھیلا ہوا ہے۔

پچھلے صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ زمین کے گرد حفاظتی ڈھال کا کام دینے والے مقناطیسی میدان میں باردار ذرات پر مشتمل ریڈی ایشن بیلٹ موجود ہیں۔

اندرونی تابکاری حلقہ سطح زمین پر ایک ہزار کلومیٹر سے لیکر چھ ہزار کلومیٹر تک پھیلا ہوا ہے، جبکہ بیرونی حلقہ پندرہ ہزار کلومیٹر سے لیکر پچیس ہزار کلومیٹر تک پھیلا ہوا ہے۔

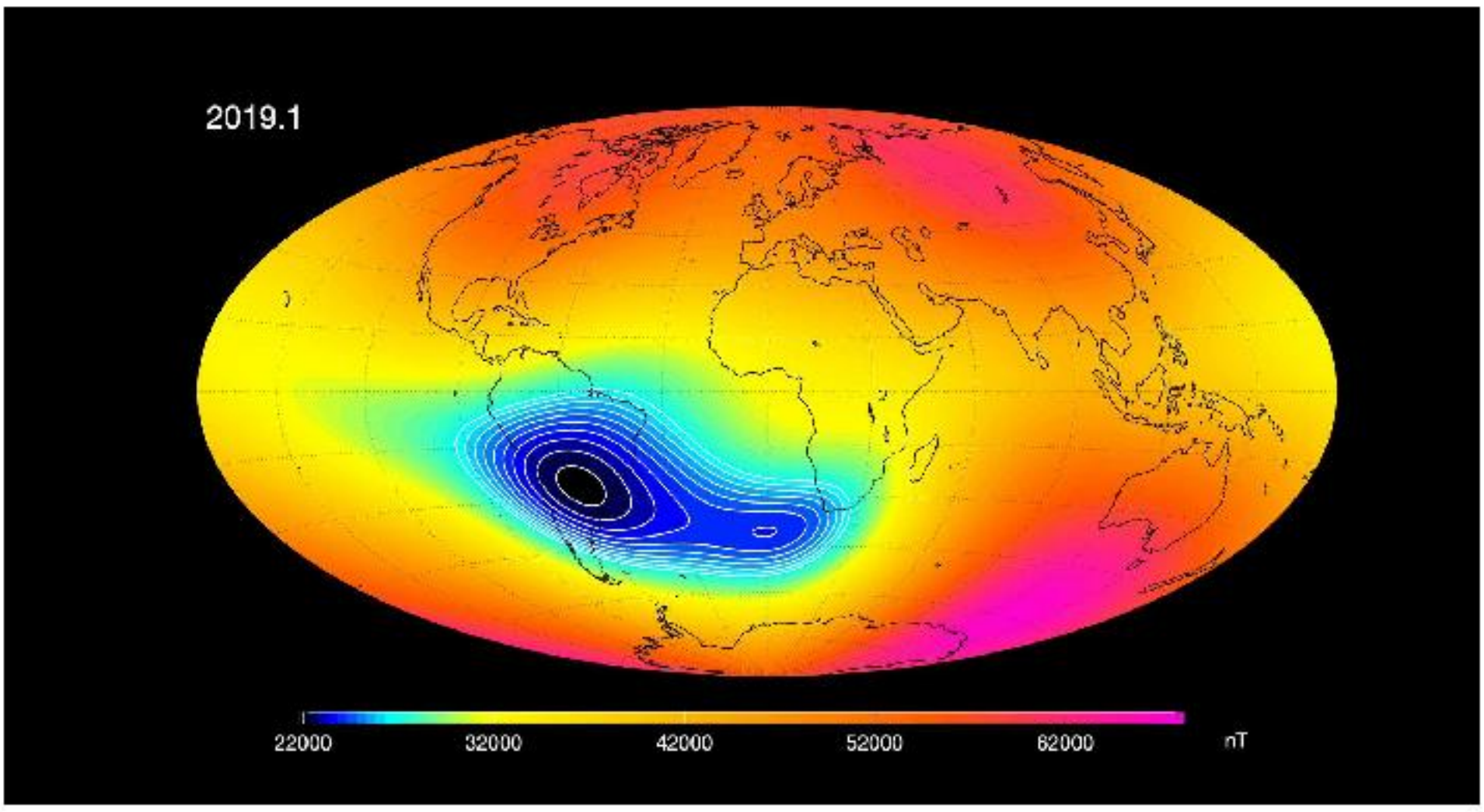

لیکن جنوبی انٹلانٹک بے ضابطگی ایک ایسا علاقہ ہے جہاں (Van Allen Radiation Belt) وان ایلن ریڈی ایشن بیلٹ سطح زمین سے کافی قریب آجاتی ہے۔ یہ بیلٹ اپنی معمول کی بلندی سے قریباً ۲۰۰ کلومیٹر تک نیچے ہے۔ اسکی وجہ سے اس خطہ میں باردار ذرات کے بہاؤ میں اضافہ پایا جاتا ہے۔

اس علاقہ کو فضا کا برمیوڈا ٹرائنگل بھی کہا جاتا ہے۔ اس علاقہ میں مقناطیسی میدان کی طاقت کے کم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہاں اعلی توانائی والے پروٹون کی مقدار زیادہ ہوتی ہے، اگر خلائی سٹیشن یا سیٹیلائٹس ان سے ٹکرا جائیں تو ان میں موجود تکنیکی نظام شارٹ سرکٹ اور خرابی کا شکار ہوسکتا ہے۔ بھلے یہ نقصان کم درجہ کا شمار کیا جائے لیکن ساتھ ہی ان میں موجود ڈیٹا اور کلیدی اجزاء کو مستقل نقصان

پہونچنے کا خطرہ بھی موجود ہوتا ہے ؛ لہٰذا اس علاقہ میں داخل ہونے سے پہلے سیٹلائٹ آپریٹرز غیر ضروری پرزوں کو بند کر دیتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ۱۹۷۰ کے بعد سے اس علاقہ کی وسعت میں مسلسل اضافہ دیکھا گیا ہے۔ اور یہ ۲۰ کلومیٹر سالانہ کی رفتار سے مغرب یعنی بولیویا اور پیرو کی جانب بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے یہ بے ضابطگی دو حصوں میں تقسیم ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔

درحقیقت یہ بے ضابطگی سائنس دانوں کے لئے ایک معمہ بنی ہوئی ہے، سائنس داں اب تک اسکے مضمرات کو اچھی طرح سمجھ نہیں پائے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ ۱۹۵۸ء میں پہلی بار مشاہدہ میں آنے والی اس بے ضابطگی کا وجود کتنے عرصہ سے ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ بے ضابطگی مستقبل میں کیا رخ اختیار کریگی۔ اور سب سے بڑی بات کہ آخر یہ بے ضابطگی کیوں کر وجود میں آئی ہے؟۔۔۔۔۔ الغرض امریکہ، یورپ اور جاپان سمیت دنیا کے کئی سائنسی ادارے اس بے ضابطگی کی مسلسل تحقیق اور نگرانی میں لگے ہوئے ہیں۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: ۱۸ اگست ۲۰۲۰ کو (Science alert) پر (NASA Is Tracking a Vast Growing Anomaly in Earth's Magnatic Field) کے نام سے شائع ہونے والا مضمون۔ نیز ملاحظہ فرمائیں: ۱۷ اگست ۲۰۲۰ء کو (www.nasa.org) ویب سائٹ پر (NASA Researchers Track Slowly Splitting 'Dent' in

(Earth's Magnetic Field) کے نام سے شائع ہونے والا مضمون۔

مقناطیسی میدان کے اس علاقہ کو سائنس داں ''بے ضابطگی'' سے تعبیر کرنے کے لیے مجبور ہیں، چونکہ وہ مقناطیسی میدان کا منبع زمین کے قلب میں واقع بیرونی کور میں بہتے لوہے کو گردانتے ہیں۔لیکن اگر قرآن کے بتائے نقشے اور ردم کے تعمیری پلان پر غور کیا جائے تو امید ہے کہ اس کی قابل قبول کوئی توجیہ نکل آئے ۔کیونکہ یہ بے ضابطگی بھی اسی علاقہ کے اوپر ہے جو بین السدین کا علاقہ ہے اور جہاں ردم کی تعمیر کا امکان ہے۔

نمبر دو:

ردم کی تشکیل میں صدفین کی تعمیر کے لئے لگنے والے مواد کے علاوہ بہت بڑے پیمانے پر لوہے کا استعمال کیا گیا ہے، لہٰذا اس علاقہ میں کہیں نہ کہیں کان کنی کے آثار ضرور ملنے چاہیے۔اسی طرح بطور قطر جس سیال کا استعمال کیا گیا ہے وہ اگر تانبہ یا اس قسم کی کوئی چیز ہے تو ان کے باقیات بھی کہیں نہ کہیں ضرور ہونگے۔ اگر ان چیزوں کے آثار کہیں ملتے ہیں تو ان قرائن وشواہد کو دیکھ کر اس قدر اندازہ ضرور لگایا جاسکتا ہے کہ ردم چاہے تھوڑی دور صحیح لیکن یہیں کہیں واقع ہونی چاہیے۔

چنانچہ جنوبی امریکہ میں بعض مقامات پر لوہے اور تانبے کی ایسی کانیں بھی دریافت ہوئی ہیں جن کے متعلق ماہرین آثار قدیمہ کا کہنا ہے کہ یہ کانیں ہزاروں سال پرانی ہیں۔

مثلاً ۲۹ جنوری، ۲۰۰۸ء کو www.purdue.edu پر شائع ہونے والے ایک مضمون کے مطابق پرڈیو (Purdue) یونیورسٹی کے ماہر آثار قدیمہ نے جنوبی امریکہ میں واقع پیرو کے مینا پریما ویرا میں ایک بہت بڑی لوہے کی کان دریافت کی ہے۔ ماہرین کے اندازے کے مطابق قدیم باشندوں نے ۷۰۰ کیوبک میٹر پر پھیلی اس کان سے تقریباً ۳۷۱۰ میٹرک ٹن لوہے پر مشتمل ہیمیٹائٹ نکالا ہے۔

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: (www.purdue.edu)

اسی طرح ''کرنٹ انتھروپولجی'' کے جون کے شمارے کے حوالے سے ۲۰ مئی ۲۰۱۱ء کو یونیورسٹی آف شکاگو پریس جرنلز میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق ماہرن آثار قدیمہ نے ''چلی'' میں تقریباً ۱۲۰۰۰ سال پرانی آئرن آکسائڈ کی ایک کان دریافت کی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس کان سے ۷۰۰ کیوبک میٹر یعنی ۲۰۰۰ ٹن چٹان نکالی گئی ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق کان کی کھدائی کان کنوں کی تکنیکی مہارت اور نسلاً بعد نسل منتقل ہونے والی ہنرمندی پر دلالت کرتی ہے۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں:

(University of Chicago Press Journals)

اسی طرح میکسیکو کے ساحل پر پانی کے اندر بھی ایک کان دریافت ہوئی ہے۔ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ کان دس سے بارہ ہزار سال پرانی ہے۔

تانبے کی بات کریں تو امریکہ میں اس کی بھی ہزاروں سال پرانی کئی

کانیں دریافت ہوئی ہیں۔ مثلاً سپیریئر جھیل (Lake Superiore) اور اس کے آس پاس کے علاقے جیسے گریٹ لیک (Great Lakes) اور اسلے رویل (Isle Royel) میں تانبے کی ایسی بے شمار قدیم کانیں دریافت ہوئی ہیں جہاں سے لاکھوں پونڈ تانبہ نکالا گیا ہے۔ ماہرین کے مطابق یہ کانیں زیر زمین کئی کئی میل تک پھیلی ہوئی ہیں۔

حیرانی کی بات یہ ہے کہ ۱۸۴۸ء میں دریافت ہونے والی پہلی کان سے ایک چھ ٹن وزنی خالص تانبے کا گٹھہ بھی دریافت ہوا ہے۔ اسی طرح میشیگن کے جزیرہ نمائے کیوینا و میں دریائے ایگل اور ایگل ہاربر کے درمیان سپریئر جھیل کی تہہ سے ۱۹ ٹن وزنی خالص تانبہ کا ایک گٹھہ بھی دریافت ہوا ہے، اس کو گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں بھی مندرج کیا گیا ہے۔ خالص تانبے کے ایسے کئی ٹن وزنی گٹھے میشیگن کے جزیرہ نمائے کیوینا و میں جابجا بکھرے ملے ہیں۔ حالانکہ ماہرین کے مطابق تانبہ عام طور پر دوسرے عناصر کے ساتھ ملا ہوا اور آکسیڈائزڈ حالتوں میں ہی پایا جاتا ہے۔

تاریخ داں اور ماہرین آثار قدیمہ کے لئے یہ بات حیران کن ہے کہ جس زمانہ میں سپیریئر جھیل کے آس پاس کے علاقوں سے کان کنی کے ذریعہ تانبہ نکالا گیا ہے وہاں اس دور میں انسانی بود و باش کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تو اب سوال یہ ہے کہ یہ کان کن کہاں سے آئے تھے اور تانبے کی اتنی بڑی مقدار وہ کہاں لے گئے!

لوہے اور تانبے کی یہ کانیں کس قدر پرانی ہیں اس کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے؛ لیکن ان کانوں سے ملنے والی ہڈیاں، لکڑی، کوئلہ، مختلف اوزار اور انسانی تہذیب و ثقافت سے وابستہ باقیات کی کاربن ڈیٹنگ سے سائنس دانوں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ کانیں دو ہزار سے لیکر دس بارہ ہزار سال پرانی ہوسکتی ہیں۔

یاد رہے کہ شمالی و جنوبی امریکہ کا یہ علاقہ مختلف قسم معدنیات کی دولت سے بھی مالا مال ہے، یہاں تانبہ، لوہا، بکسائٹ اور نکل کے دنیا کے سب سے بڑے ذخائر موجود ہیں۔

الغرض امریکہ میں موجود ہزاروں سال پرانی کانیں جس فنی صلاحیت کے ساتھ اتنی بھاری مقدار میں کان کنی کی نشاندہی کر رہی ہیں اس کی توجیہ اس کے علاوہ بڑا مشکل مسئلہ ہے کہ یہ اسی ردم میں استعمال کئے گئے لوہے اور تانبے کے آثار و باقیات ہیں جس کے ذریعہ ذوالقرنین نے خالص لوہے کے تختے اور پگھلا تانبہ تیار کیا تھا۔

پوما پنکو (Puma Punku) کے پتھر

پوما پنکو (Puma Punku) بولیویا میں تیوانا کو (Tiwanaku) کے قریب واقع ایک بڑے مندر کے احاطہ کے طور پر مشہور ہے۔

پوما پنکو (Puma Punku) دراصل ایک وسیع و عریض علاقہ میں مختلف جگہ پڑے ہوئے ٹنوں وزنی پتھروں کا مجموعہ ہے۔ سرخ سینڈ اسٹون اور اینڈیسائٹ پتھروں کا یہ مجموعہ اس قدر حیران کن تکنیکی مہارت، صفائی اور درستگی کے ساتھ تراشا

گیا ہے کہ وہ بغیر کسی کیل وغیر کے ایک دوسرے میں اسطرح فٹ ہوجاتے ہیں کہ ان میں کاغذ کا ایک ٹکڑا یا ایک بلیڈ بھی نہیں رکھی جاسکتی ۔ان میں کچھ بلاکس کی تراش وخراش اوران میں بنائے گئے سوراخ اس کمال درجہ شاندار انجینئرنگ، غیر معمولی کاریگری، علم ریاضی میں رسوخ اورفنی مہارت پر دلالت کرتے ہیں کہ بغیر مشینی کام کے ان کا تصور بڑا ہی مشکل نظر آتا ہے۔۔۔اس علاقہ میں پڑے ان پتھروں کا یہ مجموعہ ماہرین آثار قدیمہ کے لئے ایک معمہ بنا ہوا ہے کہ ان پتھروں کوکون، کب، اورکس مقصد کے لئے اس قدر مہارت کے ساتھ تراش کر یہاں لایا ہے ؟ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں ۱۶ مئی ۲۰۱۵ء کو (www.amusingplanet.com) پر شائع ہونے والا مضمون۔

بچند وجوہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ پتھر دراصل ردم سازی میں استعمال ہونے والے ان پتھروں کے باقیات ہیں جن سے ''بیٹری نما صندوق اور صدفین'' تیار کرنے کے بعد اس میں لوہے کی پلیٹیں نصب کی گئیں تھیں۔

اس خیال کوتقویت دینے والی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان پتھروں

میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے پتھروں کی ہے جو مقناطیسی خصوصیات کے حامل ہیں۔ جبکہ دیگر پتھر سادہ قسم کے ہیں۔ گویا سادہ پتھروں سے صندوق بنایا گیا اور مقناطیسی خصوصیت کے حامل پتھروں سے صدفین۔

اسکی دوسری وجہ یہ ہے کہ دیگر پرانی اور تاریخی عمارتوں کی طرح یہ پتھر کسی کھنڈر عمارت کا حصہ معلوم نہیں ہوتے بلکہ واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ ان پتھروں کو کسی مقصد کے تحت کہیں سے لاکر یہاں عارضی طور پر رکھا گیا ہے۔

اسی طرح پتھروں کا یہ مجموعہ کسی نامکمل عمارت کی غمازی کرتا ہے، گویا اسی قسم کے پتھروں کا ایک بڑا مجموعہ کہیں دوسری جگہ اصل مقصد کے تحت منتقل کر دیا گیا ہے۔

نیز ان پتھروں کے ذریعہ کسی قسم کی مکمل عمارت کھڑی نہیں کی جاسکتی چنانچہ ماہرین نے اس بات کا اندازہ لگانے کے لئے کہ ان پتھروں سے کس طرح کی عمارت بنائی جاسکتی ہے جب کمپیوٹر ماڈل کے ذریعہ انہیں جوڑنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ ان پتھروں کو جوڑنے پر ایک ایسا پلیٹ فارم تشکیل پاتا ہے جسے چاروں طرف سے دیوار کے ذریعہ محفوظ کیا گیا ہو۔

الغرض اس قسم کے بہت سارے شواہد پیش کئے جاسکتے ہیں جن سے کم از کم یہ اندازہ ضرور لگایا جاسکتا ہے کہ ردم کی تعمیر کا کام بین السدین یعنی جنوبی امریکہ کے ہی کسی علاقہ میں ہونا چاہیے۔

خلاصۂ کلام

السدین سے مراد دو پہاڑ نہیں بلکہ قطبین کے علاقوں پر موجود ہزاروں کلومیٹر لمبی چوڑی برف کی دو چادریں ہیں۔

چنانچہ ذوالقرنین کا تیسرا سفر بین السدین یعنی گرین لینڈ اور انٹارکٹکا کے بیچ پڑنے والے جنوبی امریکہ میں واقع دریائے ایمیزون اور اسکے آس پاس کا علاقہ تھا۔

وہاں رہنے والی قوم نے یاجوج و ماجوج کے ذریعہ ہونے والی کاشت کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے ان کے درمیان کسی سد یعنی روک بنادینے کی درخواست کی تو ذوالقرنین نے کسی بڑی حکمت و مصلحت کے پیش نظر یک طرفہ روک کے بجائے ''ردم'' یعنی ایسی دوطرفہ روک بنادینے کی تجویز پیش کی کہ ایک مرتبہ اس میں پھنس جانے کے بعد یاجوج و ماجوج کے لئے اوپر نیچے کسی بھی طرف نکلنا ممکن نہ رہے۔

یاجوج و ماجوج زمینی مخلوق نہیں بلکہ ایک خلائی مخلوق ہے جو انتہائی تیز روشنی و حرارت کے حامل ذرات میں بدل کر تیز رفتاری سے سفر کرتے ہوئے زمین پر آکر اپنے اصلی روپ میں آجایا کرتے تھے۔

یہ خلائی مخلوق بنیادی طور پر دو قسم کے باردار ذرات میں تبدیل ہوکر آیا کرتی تھی، جن میں سے ایک یعنی یاجوج کے دوسرے یعنی ماجوج بہ سے ملنے پر انتہائی تیز روشنی اور حرارت خارج ہوا کرتی تھی۔ یہی تیز روشنی اور حرارت کاشت کو جھلسا کر ختم کردیتی تھی اور پانی کو بھی خشک کردیا کرتی تھی۔

چنانچہ ان کے نقصاندہ اثرات سے اہل زمین کو بچائے رکھنے کے لئے ذوالقرنین

نے وہ مقناطیسی میدان تعمیر کر دیا جسے ہم زمین کی حفاظتی ڈھال کے نام سے بھی جانتے ہیں۔

یہ مقناطیسی میدان ایک غیر معمولی اور بہت بڑے بیٹری نما ڈبے میں دو مقناطیس کے درمیان لوہے کی پلیٹیں مساوی طور پر نصب کر کے ان میں برقناطیسی امالہ کے ذریعہ برقی رو پیدا کرنے کے بعد اسے مخصوص قسم کے سیال سے بھر دینے کے نتیجہ میں وجود میں آیا ہے۔

سائنسی تحقیقات کے مطابق اس مقناطیسی میدان کے مختلف طبقات میں غیر معمولی توانائی کے حامل اور نامعلوم منبع سے آئے انتہائی تیز رفتار اور غیر مرئی ذرات مقید ہیں۔

مقناطیسی میدان کو ''ردم'' مان لینے کے بعد یہ بات بھی ماننی ہوگی کہ یہ باردار ذرات ہی یاجوج و ماجوج ہیں؛ اس لئے کہ اس مقناطیسی میدان میں اگر کوئی ایسی مقید چیز ہے جس پر یاجوج و ماجوج کے معانی و خصائص چسپاں ہو سکتے ہیں تو وہ الیکٹرون اور پروٹون کے باردار ذرات ہی ہیں۔

الغرض اس طرح زمینی سائنس کے سب سے بڑے معمے یعنی مقناطیسی میدان کے میکانزم تابکاری ذرات کے حامل بیلٹ اور اس سے جڑے دیگر بے شمار سوالوں کے جواب مل جاتے ہیں جن کو سلجھانے کے لئے سائنس داں سالوں سے بے تاب ہیں۔

سدین یعنی قطبی علاقوں پر موجود برف کی چادروں کا معمار کون؟

ماہرین ارضیات اور جغرافیہ دانوں نے ایسے کئی شواہد پیش کئے ہیں جن سے یہ بات ایک حقیقت کے طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ ایک وقت ایسا تھا جب منطقۂ باردہ شمالی وجنوبی کے دونوں علاقے برف سے خالی تھے، بلکہ ان علاقوں کی آب وہوا بھی کم وبیش اسی طرح کی ہوا کرتی تھی جیسی کہ زمین کے دیگر علاقوں میں، ان علاقوں میں حیوانات ونباتات اسی طرح پنپتے اور پلتے بڑھتے تھے جیسا کہ دوسرے حصوں میں۔۔۔۔دوسری جانب قرآن کے بیان سے بھی یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ جس وقت ذوالقرنین مذکورہ دونوں منطقوں پر وارد ہوئے تھے اس وقت وہ علاقے برف سے خالی تھے۔

گویا قرآن اور علم ارضیات اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ کبھی ان دونوں علاقوں میں برف کا وجود نہیں تھا؛ لیکن اب سوال یہ تھا کہ ان دونوں علاقوں پر پھیلی ہزاروں مربع کلومیٹر لمبی چوڑی اور دو دو، چار چار کلومیٹر تک موٹی برف کی یہ چادریں وجود میں کیسے آئیں؟

ماہرین ارضیات اور سائنسی دنیا کے لئے یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا حل کسی کے پاس نہیں۔اس سوال کو حل کرنے کے لئے گذشتہ ڈیڑھ سو سالوں میں بے شمار نظریات وجود میں آئے؛ لیکن برف کی تشکیل کا یہ مسئلہ ایک ایسا معمہ بنا ہوا ہے جسے سائنسی بنیادوں پر حل کرنے سے دنیا اب بھی قاصر ہے۔

برفانی دور کا افسانہ

چنانچہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے دنیا بھر کے ماہرین ارضیات، فلکیات داں اور سائنس دانوں نے متعدد نظریات پیش کیے۔

کسی نے کاربن ڈائی آکسائڈ کے ارتکاز کا نظریہ پیش کیا۔

کسی نے پلیٹ ٹیکٹونکس یعنی بین الجزائر پلیٹوں کا۔

کوئی کہتا ہے کہ وقتاً فوقتاً سورج میں ہونے والے تغیرات کی وجہ سے برفانی دور وجود میں آتے رہتے ہیں۔

تو کسی کا کہنا ہے کہ نظام شمسی کبھی اپنی کہکشاں میں دھول کے بادل سے ہو کر گذرتا ہے تب ایسے حالات پیدا ہوتے ہیں۔

کوئی اسکے لیے مسلسل آتش فشاں پہاڑوں سے اٹھنے والی راکھ کو ذمہدار مانتا ہے۔

تو کوئی کہتا ہے کہ زمین کے گرد دو جرم سماوی ٹکرا کر دھول میں تبدیل ہو گئے، اس دھول کے ذرات نے زمین کو لمبی مدت تک گھیر لیا تھا جس کے نتیجہ میں یہ برف وجود میں آئی۔

ان تمام نظریات کا محور سورج سے زمین کی طرف آنے والی تابکاری کی کمیت و کیفیت کی کمی بیشی پر رہا۔ ان نظریات میں جس نظریہ کو سب سے زیادہ شہرت ملی وہ ہے ''برفانی دور کا نظریہ''۔

اس نظریہ کے مطابق زمین سردی اور گرمی کے مختلف دور سے گذرتی ہے، جب سردی کا دور آتا ہے تو سطح ارض اور آب و ہوا کا درجۂ حرارت بہت حد تک

گر جاتا ہے جس کی وجہ سے دونوں قطبی علاقوں کے علاوہ بر و بحر کے بعض حصے ملا کر زمین کا تقریبا ایک تہائی حصہ برف کی موٹی موٹی پرتوں سے ڈھنک جاتا ہے۔ ایسے دور کو جغرافیائی اصطلاح میں برفانی دور (ice Age) کہا جاتا ہے۔ سردی کا یہ دورانیہ لاکھوں سالوں پر محیط ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ زمین پر ایسے کم و بیش پانچ دور گذر چکے ہیں۔ پانچویں برفانی دور کی ابتدا ۲۵ لاکھ سال قبل ہوئی تھی جو آج سے تقریبا ۱۰ / ۱۱ ہزار سال قبل ختم ہو گیا تھا۔ لیکن گرین لینڈ اور انٹارکٹکا میں جمی برف کے پیش نظر بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ آخری دور ابھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوا بلکہ ہم اب بھی برفانی دور کے آخری حصے سے گذر رہے ہیں۔

برفانی دور کا نظریہ ۱۸۴۰ء میں سوئٹزرلینڈ کے عالم حیاتیات اور ماہر ارضیات لوئس اگاسیز (Louis Agassiz) نے پیش کیا تھا، جسے کافی مقبولیت حاصل رہی۔ لیکن سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ اگر برف کی چادریں برفانی دور کے نتیجہ میں وجود میں آتی ہیں تو یہ برفانی دور کس اصول کے تحت وجود میں آتے ہیں؟

برفانی دور کی اس گتھی کو سلجھانے کے لیے پچھلے سو، ڈیڑھ سو سالوں میں کئی نظریات وجود میں آئے جن میں جس نظریہ کو سب سے زیادہ شہرت ملی وہ ایک سائبرین سائنس داں ملوٹن میلانکووچ (milutin milankovitch) کا نظریہ تھا، اس نظریہ کو milankovitch cycles بھی کہا جاتا ہے۔ اس

نظریہ کے مطابق زمین کا مدار اور اس پر جھکاؤ ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا بلکہ ان میں ہزاروں سال پر محیط حساب کے مطابق تبدیلی آتی رہتی ہے، چنانچہ تاریخ میں ایک دور ایسا آتا ہے جب زمین کے جھکاؤ میں تبدیلی کے ساتھ مدار اس قدر بیضوی شکل اختیار کر لیتا ہے کہ زمین ایک لمبی مدت کے لیے بے تحاشہ سردی کی لپیٹ میں آجاتی ہے، جس کے نتیجہ میں زمین کا تقریباً ایک تہائی حصہ برف کی چادروں سے ڈھنک جاتا ہے۔

میلانکووچ کے اس نظریہ کو برفانی دور کے عقدے کے لیے اس طرح حتمی حل سمجھا جانے لگا (یا اس نظریہ کو اس قدر شہرت ملی یا اسے جان بوجھ کر پھیلایا گیا) کہ عوام ہی نہیں بلکہ سائنس دانوں کی اکثریت بھی اسے ایک حقیقت سمجھنے لگی۔ دنیا بھر میں برفانی دور سے متعلق بیسیوں فلمیں بنائی گئیں، بے شمار کتابیں اور مضامین لکھے گئے حتی کہ نصابی کتابوں میں بھی اسے جگہ دے دی گئی؛ حالانکہ میلانکووچ کے اس نظریہ پر دنیا بھر کے محققین اور سائنس دانوں کی جانب سے پے در پے ایسے کئی لاینحل اعتراض بھی ہوتے رہے کہ محققین اور سائنس دانوں کو بالآخر یہ نظریہ ترک کر دینا پڑا۔ اور اس طرح دنیا آج بھی اس معمہ کو حل کرنے کے لیے سرگرداں ہے۔

گرین لینڈ اور انٹارکٹکا پر موجود برف کی تشکیل کا مسئلہ کس قدر پیچیدہ ہے اس کا اندازہ اسکے متعلق پیش کئے گئے نظریات کی کثرت سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

سائنس کا مشہور جریدہ ''نیچر'' ۱۶ جنوری ۲۰۰۸ کو ''Unlocking the mysteries of the ice ages'' کے نام سے شائع کردہ مضمون میں برف کی اس گتھی کو زمینی سائنس کے سب سے بڑے معموں میں سے ایک کہتے ہوئے اس کے متعلق لکھتا ہے:

Much progress has been made towards understanding what caused the waxing and the waning of the great ice sheets, but a complete theory of the ice ages is still elusive.

Perhaps the longest-standing puzzle in the Earth sciences is what caused the Northern Hemisphere ice sheets to come and go. Earth scientists have been trying to solve this puzzle since 1840, when Louis Agassiz proposed that the geological deposits in Europe and North America were the remnants of vast ice sheets that spilled from the mountains.

https://www.nature.com/articles/nature06589

کلائمیٹ پالیسی واچ نامی ویب سائٹ پر ''برفانی دور کے نظریات، ماضی اور حال'' کے عنوان سے نشر کئے گئے طویل مضمون میں رچارڈ لیمنس ان نظریات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''To finally solve such a large and enduring puzzle would be a mark of the greatest scientific distinction, worthy of a Nobel Prize. The hunt

would be joined by astronomers, mathematicians, physicists, geologists, oceanographers, biologists, botanists, chemists, climatologists, meteorologists, and computer modelers. They would look everywhere for explanations—deep in the earth and far out in space. They would consider the multifaceted character of the climate system itself—how the oceans, the atmosphere, and the ice cover affect one another—and any number of external astronomical possibilities. "

''آخر کار اتنی بڑی اور پائیدار پہیلی کو حل کرنا ایسے سب سے بڑے سائنسی امتیاز کا نشان ہوگا جو نوبل انعام کا مستحق ہوگا۔اس ہدف کو پانے کے لئے ماہرین فلکیات، ریاضی دان، طبیعیات دان، ماہرین ارضیات، سمندری ماہرین، ماہرین حیاتیات، ماہرین نباتات، کیمیا دان، موسمیاتی ماہرین اور کمپیوٹر ماڈلرز شامل ہوں گے۔ وہ (برفانی دور کی) توجیہ کے لیے ہر جگہ تلاش کریں گے، زمین کی گہرائی میں اور خلا میں بہت دور، وہ خود آب و ہوا کے نظام کے کثیر جہتی کردار پر غور کریں گے کہ کیسے سمندر، ماحول اور برف کا احاطہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتا ہے اور بہت سے بیرونی فلکیاتی امکانات۔'' ملاحظہ فرمائیں۔

https://www.climate-policy-watcher.org/climate-crash/theories-of-ice-ages-past-and-future.html

لیکن جس ارتقائی نقطہ نگاہ کو بنیاد بنا کر دنیا بھر کے ماہرین علم وفن اور

سائنس داں اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کر رہے ہیں اس طریقہ پر یہ عقدہ کبھی حل نہیں ہو پائیگا؛ کیونکہ برف کی چادریں قدرتی عوامل کے تحت وجود میں نہیں آئیں بلکہ انہیں ٹکنالوجی اور سائنسی علوم کے سہارے وجود میں لایا گیا ہے۔

ہاں ہاں دونوں منطقوں پر موجود برف کی یہ چادریں اسی ذوالقرنین کا کارنامہ ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ ''ہم نے انہیں ساری زمین پر اقتدار بخشا تھا اور انہیں ہر طرح کے بلند پرواز وسائل حمل ونقل عطا کئے تھے''۔

وہ کیسے؟

ہم ابتدائی صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ قرآن نے قصۂ ذوالقرنین کے بیان کو ''ذکر'' سے تعبیر کرتے ہوئے اس بات کو واضح کر دیا تھا کہ ذوالقرنین کے حالات کا تذکرہ بطور نمونہ مختصر تو ہوگا لیکن ان کے متعلق جو بات کہی جائیگی وہ خارجی ثبوت کے ساتھ مدلل بھی ہوگی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے '' إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا '' کے ذریعہ ذوالقرنین کے متعلق دو دعوے کئے تھے۔ ایک ذوالقرنین کو ساری روئے زمین پر بشمول تکوینی امور کے اقتدار دیا گیا تھا۔ دوم: انہیں ہر طرح کے بلند پرواز وسائل حمل ونقل سے نوازا تھا ۔ثانی الذکر دعوی دراصل پہلے دعوے کی کیفیت کو بیان کرتا ہے کہ ذوالقرنین کو کس نوعیت کا اقتدار حاصل تھا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ذوالقرنین کے تینوں اسفار میں وہ کچھ ایسے عظیم الشان کارنامے انجام دینگے جو قرآنی دعوے کو واضح انداز میں ثابت کرسکیں۔

چنانچہ مقام ثالث میں حیرت انگیز ردم کی تعمیر کے ذریعہ ذوالقرنین کے متعلق دونوں دعووں کا اثبات ہوجاتا ہے کہ ذوالقرنین کے پاس سائنس وٹکنالوجی پر مبنی کس معیار کا تکوینی اقتدار تھا؛ لیکن مقام اول اور دوم میں ''سبب'' یعنی بلند پرواز سواری کس قسم کی ترقی یافتہ تھی، اسکا تو قدرے اندازہ مل جاتا ہے؛ لیکن تکوینی معاملہ کا بظاہر کوئی تذکرہ نہیں ملتا حالانکہ دعوے کے پیش نظر ان دونوں جگہوں پر بھی تکوینی معاملات سے متعلق کوئی نہ کوئی عظیم الشان کارنامہ ضرور ہونا چاہیے؟

منطقۂ باردہ شمالی وجنوبی کے دونوں علاقوں کے سفر کے بعد جیسے ہی قرآن مقام ثالث کے سفر کا تذکرہ کرتا ہے تو ''حَتَّى إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ'' کہہ کر دو عظیم الشان روک کی بات کرتا نظر آتا ہے۔۔۔۔اور پچھلے صفحات میں ہم نے بتلایا تھا کہ سدین سے مراد ان دونوں منطقوں پر موجود برف ہے؛ لیکن بڑا سوال یہ تھا کہ مانا کہ ان برفانی چادروں کو سد سے تعبیر کرنا عین درست ہے لیکن ہم کس دلیل کی بنیاد پر کہہ سکتے ہیں کہ سدین سے قرآن کی مراد یہ برفانی چادریں ہی ہیں!

''عَيْنٍ حَمِئَةٍ'' پر بحث کے دوران ہم دیکھ چکے ہیں کہ مغرب الشّمس یعنی قطب شمالی کے سفر کے دوران وہاں برف موجود نہیں تھی، دریا اپنی تیزی کے ساتھ بہا کرتا تھا، نیز اس کے کناروں پر لوگ بود وباش کیا کرتے تھے۔ کناروں کے کٹاؤ کے علاوہ اس دریا میں موجود کیچڑ کی ساخت بھی بتلاتی ہے کہ یقیناً یہاں کبھی پانی بڑی تیزی کے ساتھ بہا کرتا ہوگا جس نے لہروں کی شکل میں کیچڑ کا ڈھیر لگا دیا ہے۔

اسی طرح جب وہ مطلع الشّمس میں تشریف لے گئے تو اس وقت وہاں پر بھی بڑی تعداد میں لوگ آباد تھے، اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ منطقۂ شمالی کی طرح منطقۂ جنوبی کا علاقہ بھی اس وقت برف سے خالی تھا۔

لیکن اب سوال یہ ہے کہ جب ان دونوں علاقوں میں ذوالقرنین کے ورود کے وقت برف کا وجود نہیں تھا تو آج وہاں یہ برف کیسے موجود ہے، نیز وہاں بسنے والی قومیں کہاں چلی گئیں؟

مطلع الشّمس یعنی منطقۂ قطب جنوبی کے سفر کے تذکرے میں ''كَذَٰلِكَ وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿۹۱﴾'' پر بحث کے دوران ہم دیکھ چکے ہیں کہ ''بِمَا لَدَيْهِ'' سے مراد انٹارکٹکا پر موجود برف ہے۔

اب یہاں ایک عجیب تغیر کلام ملاحظہ فرمائیں کہ ''لَمْ نَجْعَل لَّهُم مِّن دُونِهَا سِتْرًا'' میں ستر کی تشکیل کی نسبت اللہ عزوجل خود اپنی جانب فرما رہے ہیں جبکہ اگلے ہی جملہ كَذَٰلِكَ وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿۹۱﴾ میں برف کی تخلیق کو اپنی جانب منسوب کرنے کی بجائے اس کے پیچھے کارفرما محرک کے علم کی نسبت اس طرح اپنی جانب فرما رہے ہیں کہ گویا برف کسی اور نے کسی خاص مقصد سے بنائی ہو!

جی ہاں اس انداز کلام سے یہی بات کہی جا رہی ہے اور وہ بنانے والا کوئی اور نہیں بلکہ ذوالقرنین ہی ہے کیونکہ انہی کے کارناموں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے اور قصۂ ذوالقرنین کو ''ذکر'' کہنے کا تقاضہ بھی یہی ہے۔

چلو مانا کہ انٹارکٹکا پر موجود برف ذوالقرنین کی تعمیر کردہ سد ہے؛ لیکن یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ منطقۂ باردہ شمالی پر موجود برف بھی ذوالقرنین کا ہی کارنامہ ہے؟

آیت نمبر ۹۳ میں ''وَجَدَ مِنْ دُونِهِمَا قَوْمًا'' سے پتہ چلتا ہے کہ بین السدین رہنے والی قوم کے تمام افراد مرفوع القلم یا غیر مکلف تھے جبکہ منطقۂ شمالی اور جنوبی کے سفر میں ملی دونوں قومیں معیاری عقل کی وجہ سے مکلف تھیں جن میں کچھ لوگ تو کافر تھے جبکہ دیگر مؤمن وصالح۔ اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ دونوں علاقوں کی قومیں حکم شرعی اور وعدۂ جزا وسزا کے لحاظ سے ایک ہی درجہ میں تھیں ۔۔۔اسی لئے مطلع الشّمس میں رہنے والی قوم کے ساتھ برتاؤ کا الگ سے تذکرہ نہیں کیا گیا بلکہ ''من دونہما'' کے ذریعہ بڑا لطیف مگر واضح اشارہ کر دیا گیا ۔

چنانچہ ''یسر'' کا جو وعدہ منطقۂ شمالی کی قوم سے کیا تھا وہی وعدہ منطقۂ جنوبی کی قوم سے بھی کیا تھا اور جس عسر کا سامنا منطقۂ شمالی کی قوم کو تھا ویسے ہی کسی خطرے سے منطقۂ جنوبی کی قوم بھی دوچار تھی ۔

آیت نمبر ۸۸ میں منطقۂ شمالی کے لوگوں سے تکوینی معاملات میں اپنی شان کے مطابق ''یسر'' کا وعدہ اس بات کا غماز ہے کہ اس منطقے کے لوگ کسی بڑے پیمانے کے ''عسر'' کی زد میں تھے۔

لیکن اس آیت سے اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ ان لوگوں سے ایفائے وعدہ کا معاملہ کہاں انجام دیا گیا، کیا وہیں رہتے ہوئے وعدۂ یسر پورا کیا گیا یا انہیں

کہیں دوسرے مقام پر منتقل کر کے عظیم الشان آسانی کا انتظام مہیا کیا گیا تھا۔

آیت نمبر ۹۱ میں منطقۂ جنوبی کے متعلق اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ ''آج وہاں جو کچھ موجود ہے اس کے محرک سے ہم اچھی طرح باخبر ہیں''۔۔۔۔اب منطقۂ جنوبی میں واقع انٹارکٹکا سارا کا سارا برف سے ڈھنکا ہوا ہے؛ لہٰذا اس کے متعلق کسی شک کی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ ''لدیہ'' سے مراد برف کی یہی چادر ہے ۔۔۔تو گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ کسی بڑے زمینی خطرے کے پیش نظر انٹارکٹکا کو برف سے ڈھانکنا پڑا ہے اور اسی وجہ سے جو قوم وہاں بود و باش کیا کرتی تھی وہ قوم آج وہاں موجود نہیں۔۔۔۔۔ بلکہ انہیں کسی دوسری جگہ منتقل کر کے ان کے ساتھ عظیم الشان ''یسر'' کا معاملہ کیا گیا ہے۔

ملاحظہ فرمائیں کہ دونوں مقام کے لوگوں کو کسی بڑے خطرے کا سامنا ہے، اب ظاہر سی بات ہے کہ جس ہیبتناک خطرے کی بنا پر انٹارکٹکا کی قوم کو نقل مکانی کروا کر اسے برفانی سد سے ڈھانک دیا گیا ہے، اسی طرح کے خطرے کا سامنا منطقۂ شمالی کی قوم کو بھی ہوگا، اسی خطرے سے بچا کر ''یسر'' کا معاملہ کرنے کی بات کہی جا رہی ہے، چنانچہ یہاں بسنے والی قوم کو بھی کسی دوسری جگہ منتقل کر کے ان کے ساتھ بھی آسانی والے عظیم الشان معاملہ کا انتظام کیا گیا ہوگا۔۔۔۔ چنانچہ اس وقت سے لیکر آج تک یہ دونوں علاقے انسانی آبادی سے خالی اور برف سے ڈھنکے ہوئے ہیں۔

اب باقتضائے لفظ ''من دونہما'' یہ بات تو واضح ہو چکی ہے کہ ان دونوں

علاقوں میں بسنے والی قوموں کو دوسری جگہ منتقل کر کے ان کے ساتھ جزا وسزا کا معاملہ انجام دیا گیا تھا؛ لیکن ابھی بھی یہ بات واضح نہیں ہو پائی ہے کہ منطقۂ شمالی کی برفانی چادر کا بنانے والا بھی ذوالقرنین ہی ہے؟

زمین کے تکوینی معاملات میں خداداد اختیار وقدرت کے پیش نظر یہ ممکن نہیں کہ ذوالقرنین انٹارکٹکا میں موجود خطرے کو تو برفانی سد کے ذریعہ بند کر دے؛ لیکن منطقۂ شمالی کے خطرے کو اپنے ہی حال پر چھوڑ دے۔ چنانچہ جس مصلحت و حکمت اور انسانی مفاد کی خاطر انٹارکٹکا کو برف سے ڈھانک دیا تھا اسی مصلحت و حکمت کے پیش نظر اپنا فرض نبھاتے ہوئے منطقۂ شمالی کے ایک بڑے رقبے کو بھی برف پر بھی برف بچھا دی تھی۔

یہ بات محض ایک قیاس نہیں بلکہ ایک سچائی ہے، اسی لئے ''سدین'' کو معرف باللام بیان کیا گیا ہے۔ گویا ماقبل میں صرف انٹارکٹکا پر موجود برفانی سد کے بنانے کا تذکرہ نہیں ہوا بلکہ باقتضائے نص منطقۂ شمالی کی برفانی سد کا ذکر بھی موجود ہے۔ اور اسی لیے ''السدین'' معرف باللام لایا گیا ہے۔

الغرض دونوں منطقوں کی قومیں کسی بڑے زمینی خطرے کو جھیل رہی تھیں، خطرہ اس قدر بڑا تھا کہ ان قوموں کو وہاں رکھتے ہوئے اس کا سد باب نہیں کیا جاسکتا تھا چنانچہ وہاں بسنے والے لوگوں سے تکوینی معاملات میں اپنی وسعت و اختیار کے مطابق ''عسر'' سے نجات دلا کر کسی دوسرے مقام پر سکون وآرام والی جگہ مہیا کرنے کا وعدہ کیا جارہا ہے ۔

ذوالقرنین نے دونوں قوموں کو نقل مکانی کروا کر ان کے ساتھ آسائش کا کس قدر عظیم الشان اور بے مثال معاملہ کیا اس کو بھی ہم دیکھینگے، نیز یہ بھی جانینگے کہ آج وہ قومیں کہاں اور کس حال میں ہیں؛ لیکن ذوالقرنین نے ان دونوں جگہوں کو اپنے حال پر نہیں چھوڑ دیا بلکہ تکوینی معاملات میں حاصل اختیار و قدرت کے پیش نظر اپنا فرض پورا کرتے ہوئے وہاں پنپنے والے خطروں کو بھی برف کی عظیم الشان اور ہیبتناک چادروں سے بند کر کے ساری انسانیت کو ان خطروں کے دوررس برے نتائج سے محفوظ کر دیا۔

اس طرح اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ ذوالقرنین نے پہلے دو سفر میں بھی دو بڑے کارنامے انجام دئے ہیں اور وہ ہے ''تعمیر سدین''۔

برفانی چادر: قدرتی عمل یا ذوالقرنین کی کاریگری

مذکورہ بالا وضاحت سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ یہاں سدین سے مراد برف کی دو چادریں ہی ہیں اور انہیں ذوالقرنین نے ہی تشکیل دیا ہے۔

دور حاضر کی (Cloud Seeding and Weather Modification) ٹکنالوجی (جس سے مصنوعی بارش، بناوٹی گرمی اور آب و ہوا وغیرہ میں تبدیلی پیدا کی جاسکتی ہے) اس کے ذریعہ ہمارے لیے یہ سمجھنا آسان ہوجاتا ہے کہ ذوالقرنین نے بھی اسی طرح مگر اس سے کہیں زیادہ اعلی ٹکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے برفانی سد تعمیر کی ہوگی۔

یقیناً ہمارے بہت سے قارئین کو یہ دعوی ایک پاگل پن نظر آئیگا کہ بھلا

ہزاروں مربع کلومیٹر پر پھیلی برف کی اس طرح عظیم الشان چادروں کی تشکیل کسی انسان کے بس کا کام کیسے ہوسکتا ہے اور وہ بھی ہزاروں سال پہلے۔۔۔۔! یقیناً یہ کام انتہائی محیر العقول اور دور حاضر کی سائنس اس معیار کے کام کا سوچ بھی نہیں سکتی ،؛ لیکن جس بندے کے متعلق تکوینی نظام میں عظیم الشان اقتدار کی بات کہی جارہی ہو اور مقناطیسی میدان جس کی عظمت کا گواہ ہو اس کے متعلق کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہنی چاہیے کہ اس نے ہی یہ کارنامہ انجام دیا ہوگا۔

اب قرآنی نقطۂ نظر سے تو برفانی سد کے معمار ذوالقرنین ہی ہیں، لیکن کیا اس بات کے لئے کوئی خارجی شواہد اور دلائل بھی موجود ہیں کہ جن کی بنیاد پر کہا جا سکے کہ واقعتاً ان برفانی سد کا معمار ذوالقرنین ہی ہے ؟

اولاً تو موجودہ سائنس کے پاس برف کی ان چادروں کی تشکیل کی سائنسی توجیہ تو بہت دور کی بات اس کے متعلق گڑھے گئے نظریات میں کوئی ایک نظریہ بھی ایسا نہیں جسے سائنسی بنیادوں پر امکانی صورت کا درجہ دیا جا سکے۔

لہٰذا ہر ممکن کوشش کے باوجود برفانی چادروں کی تشکیل کی سائنسی توجیہ کرنے سے دنیا بھر کے سائنس دانوں کا قاصر ہونا ،مروجہ طبیعیات کے قوانین سے میل نہ کھانا اور قدرتی عوامل کے تحت ان چادروں کے وجود میں آنے کی گنجائش نہ ملنے کے بعد منطقی حیثیت سے یہی ایک راستہ بچ جاتا ہے کہ قرآنی دعوے کو سچ مانتے ہوئے انہیں ذوالقرنین کی کاریگری کا نتیجہ ہی قرار دیا جائے۔

اب اگر برف کی یہ چادریں قدرتی عوامل کے تحت وجود پذیر ہونے کے

بجائے واقعتا انسانی کاریگری کا نتیجہ ہے تو پھر اسکے دلائل وشواہد کیا ہیں؟ لیکن مزید شواہد پیش کرنے سے پہلے ہم یہ دیکھ لیتے ہیں کہ آخر قطبین پر ''برفانی سد'' بنانے کی وجہ کیا تھی؟

تعمیر سدین کی وجہ

اگر ہم قرآنی نقطۂ نظر کے مطابق برفانی سدین کی تشکیل کے پیچھے کارفرما بنیادی وجہ اور محرک کی تشریح کرتے ہوئے خارجی طور پر اسے ڈھونڈ نکالیں تو یقیناً یہ بھی اس بات کی ایک بڑی دلیل ہوگی کہ واقعتاً برفانی سدین کا معمار ذوالقرنین ہی ہے۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ آخر وہ کونسی بنیادی اور اہم وجہ تھی جس کو لیکر برف کی اس قدر عظیم الشان پرتوں کے ذریعہ ان منطقوں کو ڈھانپنے کی نوبت آئی؟

سائنسی دور کے عنوان سے اگلے صفحات میں مختلف دلائل کی روشنی میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی جائیگی کہ سائنس وٹکنالوجی کوئی دور جدید کا کارنامہ نہیں بلکہ انسانی تاریخ میں سائنس وٹکنالوجی کے اس سے بھی بڑے بڑے کئی دور گذر چکے ہیں اور جس سائنسی دور میں ہم جی رہے ہیں اس کا وعدہ بھی پروردگار نے قرآن میں پیشگی کر رکھا ہے بلکہ اسکے بعد اس میدان میں آگے کیا کیا بڑی تبدیلیاں آسکتی ہیں اس کی بھی قرآن نے جابجا پیشین گوئی کردی ہے۔

درحقیقت سائنس وٹکنالوجی کا دور قانون ربوبیت کے تحت انسان کو تن توڑ محنت ومشقت سے بچانے کے لیے لایا جاتا ہے۔ مثلا دور حاضر کی سائنس و

ٹکنالوجی جن بنیادی اور امتیازی حیثیت کی حامل چیزوں کے ارد گرد گھومتی ہے، وہ ہے نظام مواصلات اور وسائل حمل ونقل کی تیز رفتاری۔ اگر ان چیزوں کو ہماری زندگی سے نکال دیا جائے تو بھلا سوچو ہمارا حشر کیا ہوگا!

چنانچہ اسی طرح کے خلا کو پر کرنے کے لیے رب العالمین نے ذوالقرنین کو بھی روئے زمین پر لاثانی اقتدار کے ساتھ بے مثل سائنس وٹکنالوجی سے نوازا تھا۔ ذوالقرنین کے پاس کس قدر عظیم الشان علم وہنر اور سائنس وٹکنالوجی تھی اس کا اندازہ انکے اسفار اور کارناموں سے لگایا جاسکتا ہے۔

الغرض سائنس وٹکنالوجی کا بنیادی مقصد شدت مشقت کو دور کرتے ہوئے نوع انسانی کو آسانی فراہم کرنا ہوتا ہے۔ زیب وزینت اور سکون وآرام جیسی دیگر باتیں اسکے ضمن میں اضافی فائدے کے طور پر لگی آتی ہیں۔ اب یہ مشقت وآرام کا مسئلہ زراعت کے قبیل سے بھی ہوسکتا ہے یا آبادی کی کثرت کی صورت میں نظام مواصلات اور وسائل حمل ونقل کے قبیل سے بھی یا پھر غیر معمولی آفت کے لئے بطور ڈھال بھی ہوسکتا ہے۔

مقام ثالث میں ردم بنانے کا مقصد تو بالکل واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، لیکن اب یہاں دیکھنا یہ ہے کہ ذوالقرنین نے کس مقصد کے پیش نظر اس طرح عظیم الشان سدین کی تعمیر کو عملی جامہ پہنایا تھا۔

مقام ثالث کے تذکرے میں 'من دونہما' پر بحث کے دوران یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ مقام ثالث کی قوم کے برخلاف منطقۂ باردہ شمالی وجنوبی پر رہنے والی

دونوں قوموں کے لئے ذوالقرنین نے جزاوسزا کا ایک ہی پیمانہ استعمال کیا تھا۔

چنانچہ جزاوسزا کا طرز بتلاتے ہوئے ذوالقرنین نے فرمایا تھا ''وَأَمَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُ جَزَاءً الْحُسْنَىٰ ۖ وَسَنَقُولُ لَهُ مِنْ أَمْرِنَا يُسْرًا ﴿٨٨﴾'' ۔

''یسر''، ''عسر'' کا متقاضی ہے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ قومیں دونوں مقام پر کسی خطرے اور پریشانی کا سامنا کررہی تھیں، یہی وہ محرک تھا جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں فرمایا کہ انٹارکٹکا پر موجود برف کی چادر کے محرک سے ہم اچھی طرح باخبر ہیں۔

لہٰذا اب سوال یہ تھا کہ آخر ایسی کونسی بات تھی جس کی وجہ سے وہاں سے ان قوموں کو نکال کر اس قدر موٹی برف کی پرتوں کے ذریعہ ان منطقوں کو ڈھانک کر ہزاروں سال تک آنے والی انسانیت کی سہولت کا سامان بھی مہیا کردیا گیا۔

وہ کونسی وجہ ہے؟

دراصل اس سوال کا جواب ہمیں کہیں اور تلاشنے کی ضرورت نہیں بلکہ ''كَذَٰلِكَ وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿٩١﴾'' میں ہی اس کا حل موجود ہے۔

ماسبق میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ''بِمَا لَدَيْهِ'' سے مراد انٹارکٹکا پر موجود برف ہے، برف کو ہی سد کہا گیا ہے، لفظ سدین سے یہ بات عیاں ہے کہ برف کی ان چٹانوں کے ذریعہ زمین کے شگاف یا مخرج کو بند کرکے کسی ایسی چیز کو روکا گیا ہے جو انسانیت کے لیے خطرہ تھی۔لیکن زمین سے نکلنے والی وہ کونسی چیز ہے جسے ان پرتوں کے ذریعہ ڈھانپا گیا ہے؟

دنیا بھر کے سائنس داں ان دونوں منطقوں پر کافی عرصہ سے وہاں کے ماحول، برف کی تشکیل اور برف کے اندر باہر اور اوپر نیچے کیا ہے، کیا ہو رہا ہے، برفیلی چادروں کے زمینی آب و ہوا پر اثرات اور ان جیسے کئی سوالات کو حل کرنے کے لیے رات دن کوشاں ہیں۔

ان تحقیقات کے دوران ایک چونکانے والی جو بات سامنے آئی ہے وہ ہے اس برفیلی چادروں کے نیچے کثیر تعداد میں آتش فشاں پہاڑوں کا وجود۔

برف کی ہزاروں فٹ موٹی پرت سے ڈھنکے ہونے کی وجہ سے اس بات کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ انٹارکٹکا پر آتش فشاں پہاڑوں کی صحیح تعداد کیا ہے، لیکن حالیہ مطالعہ میں انٹارکٹکا کے صرف مغربی کنارے پر ۱۳۸ آتش فشاں پہاڑوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پورے انٹارکٹکا پر آتش فشانوں کی تعداد کتنی ہوگی۔

ناسا کلائمیٹ چینج ویب سائٹ کے مطابق انٹارکٹکا جس ٹیکٹونک پلیٹ پر ٹکی ہوئی ہے وہ زمین پر سب سے زیادہ متحرک ہے، نیز یہ علاقہ بڑی سرگرمیوں سے گھرا ہوا ہے۔

سائنس دانوں کی تحقیق کے مطابق ہزاروں سال سے یہاں ایک بھی آتش فشاں پھٹا نہیں ہے البتہ ان میں ایسے آتش فشاں کی ایک بہت بڑی تعداد ہے جو فعال کہے جاسکتے ہیں۔

نوٹ: یاد رہے کہ برف کے نیچے موجود سرگرمیوں کی یہ اکثر باتیں جی پی ایس،

سونار تکنیک اور ہائی رزولیشن ٹوموگرافی (high-resolution tomographic images) جیسی تکنیک کو استعمال کرتے ہوئے معلوم کی جاتی ہیں۔

اسی طرح گرین لینڈ پر بھی آتش فشاں پہاڑوں کے بے شمار شواہد موجود ہیں۔

آتش فشاں پہاڑوں کے علاوہ ان دونوں جگہوں پر بہت سے ایسے ''hot spot'' حرارتی مقامات بھی ہیں، جو زمینی چٹانوں سے حرارت کو سطح زمین پر نکالتے رہتے ہیں۔

اگر آتش فشاں پہاڑ اور حرارتی مقامات ہی وہ بنیادی وجہ ہے جس کی جانب قرآن اشارہ کر رہا ہے تو پھر اب دیکھنا یہ ہے کہ آخر آتش فشاں پہاڑوں میں ایسی کونسی نقصاندہ خاصیت پائی جاتی ہے کہ ان کے دوررس خطرناک نتائج کے پیش نظر ذوالقرنین نے موجودہ قوم کے علاوہ آنے والی نسوں کی فلاح کی خاطر انہیں برف کے ذریعہ ڈھانک دینا مناسب بلکہ ضروری سمجھا۔

آتش فشاں کیا ہے؟

آتش فشاں فارسی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی ہے آگ اگلنا۔ اصطلاحاً جوف ارض سے پگھلے ہوئے گرم مادے کے نکلنے کو آتش فشانی کہا جاتا ہے۔

آتش فشانی کے وقت زمین سے پگھلے ہوئے گرم چٹانی مادوں کے ساتھ، دھواں، راکھ، معدنیات اور بعض قسم کی گیسوں کا اخراج بھی ہوتا ہے۔

اس قسم کی آتش فشانی عام طور پر پہاڑوں کے ذریعہ ہوتی ہے۔

آتش فشاں پہاڑوں کی تین قسمیں ہیں۔زندہ،خفتہ اور مردہ۔

زندہ ایسے آتش فشاں پہاڑ کو کہا جاتا ہے جس میں آتش فشانی مستقل طور پر جاری ہو یا وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے پھٹتا رہتا ہو۔خفتہ ایسے آتش فشاں کو کہا جاتا ہے جہاں کسی زمانے میں تو آتش فشانی ہوئی ہو؛لیکن اب کافی عرصہ سے اس میں کوئی سرگرمی نظر نہ آتی ہو البتہ اس کے دوبارہ سرگرم ہونے کی توقع بھی ہو۔جبکہ مردہ ایسے آتش فشاں کو کہا جاتا ہے جس کے اب سرگرم ہونے کا کوئی امکان نظر نہ آتا ہو۔۔۔۔روئے زمین پر تینوں قسم کے بے شمار آتش فشاں موجود ہیں۔

اس آتش فشانی کے جہاں آب و ہوا اور انسانی زندگی پر مختلف قسم کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں وہیں اس کے مثبت نتائج بھی ہیں۔

دور جدید کی نت نئی سائنسی ترقیات کے باوجود ابھی تک آب و ہوا میں ہونے والے تغیرات کے پیچھے کارفرما عوامل کو صحیح معنی میں سمجھا نہیں جاسکا ہے؛ لیکن پھر بھی ہماری آب و ہوا پر اثر انداز ہونے والے عوامل میں النینو،سورج میں ہونے والے تغیرات،سمندری بہاؤ اور آتش فشاں جیسے عوامل کو کافی اہمیت حاصل ہے۔

اس کے مثبت و منفی اثرات سے قطع نظر ایک بات جو ہمارے لیے اہمیت کی حامل ہے وہ ہے آتش فشانی کے وقت کاربن ڈائی آکسائڈ اور سلفر ڈائی آکسائڈ جیسی گیسوں کا اخراج۔ ۱۹۹۱ء میں فلپائن کے آتش فشاں پہاڑ پیناٹوبو کے پھٹنے کے بعد سائنس دانوں نے کمپیوٹر ماڈلز کے علاوہ تجرباتی سطح پر بھی یہ بات

ثابت کر دکھائی ہے کہ آتش فشاں سے نکلنے والی سلفر ڈائی آکسائڈ گیس بالائے بنفشی شعاعوں کو جذب کر دنے والی اوزون کی پرت کو ختم کر سکتی ہے۔

گلوبل وارمنگ کو لیکر جیو انجینیر نگ پر کام کرنے والے بہت سے سائنس دانوں کا ماننا ہے کہ سلفر ڈائی آکسائڈ کا سب سے تیز اثر قطبین کے علاقوں پر موجود اوزون کی پرت پر ہو سکتا ہے۔

نیز بہت سے سائنسدانوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ سلفر ڈائی آکسائڈ کے ساتھ اگر ہلوجن جیسی دوسری گیسیں بھی فضا میں داخل ہو کر کیمیائی ردعمل شروع کر دیں تو ایسی صورت حال انسانی زندگی کے لیے بہت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔

الغرض آب و ہوا اور فضا کے اوپر آتش فشاں کے مثبت و منفی نتائج پر سائنس داں مسلسل تحقیقات میں لگے ہوئے ہے، لیکن موجودہ تحقیقات کے پیش نظر ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ مقناطیسی پول جیسی مخصوص خصوصیات کے حامل براعظم انٹارکٹکا کی کم گہرائی والی فضا کے نیچے اگر آتش فشاں پہاڑوں کی کثیر تعداد تواتر کے ساتھ مختلف قسم کی گیسوں کا اخراج کرتے ہوئے انہیں فضا میں شامل کرتی رہیں تو اس کے کیمیائی ردعمل کے نتیجہ میں یقینا اوزون کی پرت سمیت دیگر وہ سبھی پرتیں بھی یا تو ختم ہو جائینگی یا ان میں اتنی کثافت نہیں رہیگی کہ وہ سورج کی شعاعوں کو زمین پر پہونچنے سے روک سکیں۔

الغرض اسی آتش فشانی سرگرمی کو روکنے کے لیے ذوالقرنین نے گرین لینڈ اور انٹارکٹکا کے پورے جزیرے پر برف کی موٹی تہہ جمادی تھی چنانچہ سائنس

دانوں کی تحقیق کے مطابق ہزاروں سال سے یہاں ایک بھی آتش فشاں پھٹا نہیں ہے۔

لیکن اب سوال یہ ہے کہ آتش فشاں تو دنیا بھر میں جا بجا پھٹتے رہتے ہیں اوران کے مثبت ومنفی اثرات مرتب ہوتے رہتے ہیں تو آخران منطقوں کے آتش فشاں میں ایسی کیا بات تھی کہ ان کی سرگرمی کو روکنا ذوالقرنین کو ضروری محسوس ہوا۔

فی الحال ہم صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ قرآن کے بیان سے اتنی بات تو معلوم ہوجاتی ہے کہ ان دونوں علاقوں کی قومیں عسر یعنی کسی خطرے کا سامنا کررہی تھیں۔ مستقبل میں یہ خطرہ اس قدر بڑا روپ اختیار کرسکتا تھا کہ ان قوموں کے وہاں رہتے ہوئے اس سے نپٹنا ممکن نہیں تھا؛ اس لئے ذوالقرنین نے ان قوموں کو وہاں سے نکال کر صرف ان پر ہی احسان نہیں کیا بلکہ اپنے وسعت اختیار اور ذمہداری کے پیش نظر آنے والی نسلوں کے ساتھ حیات ارضی کے لیے مزید خطرناک ثابت ہونے والے اس خطرے کو بھی پیشگی روک دینا ہی ضروری سمجھا۔

الغرض انٹارکٹکا کے متعلق ''سد'' کے لغوی معنی کے پیش نظر غالب گمان یہی ہے کہ جس محرک کی بنا پر برف کی چادریں بچھائی گئی ہیں وہ محرک ''آتش فشاں پہاڑ'' اور ''وہاں موجود حرارتی مقامات'' ہی ہونا چاہیے؛ لیکن ہوسکتا ہے کہ ایک لمبی مدت تک ایک حد تک قائم رہنے والی آتش فشانی اور اوزون کا یہ شگاف وہاں رہنے والی قوم کے مفاد میں رہا ہو، لیکن اب ذوالقرنین کی آمد کے عرصہ میں یہ آتش فشانی اور اس کے نتیجہ میں تشکیل پانی والی فضا خطرناک بنتی جارہی ہو اور مستقبل

میں مزید خطرناکی کا یقین ہونے کی وجہ سے ذوالقرنین نے اس علاقہ کو برف سے ڈھانک دینا ضروری سمجھا ہو۔

منطقۂ باردہ شمالی پر برف کی سد بنانے کی اضافی وجہ

منطقۂ باردہ شمالی اور جنوبی پر برف کی چادر بنانے کا محرک آتش فشاں پہاڑوں کی کثرت ہے؛ لیکن اگر منطقۂ شمالی کے سفر کی روداد دیکھی جائے تو ''عَيْنٍ حَمِئَةٍ'' کا لفظ اس کے دیگر محرک کے بارے میں بھی رہنمائی کرتا نظر آتا ہے۔

''عَيْنٍ حَمِئَةٍ'' کی لغوی تحقیق کے دوران ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس کے معنی میں مسلسل رگڑ کے ذریعہ کناروں کے ٹوٹنے پھوٹنے اور ختم ہوتے جانے کا معنی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کے نتیجہ میں ایک طرف دریا کا میٹھا پانی کھارا ہوتا جارہا تھا، کھارے پانی کی سطح بڑھنے پر کنوؤں اور چشموں کے پانی میں بھی کھاراپن بڑھتا جارہا ہوگا جس کی وجہ سے کھانے پینے کے علاوہ کاشت میں بھی تکلیف کا سامنا ہوگا ۔۔۔۔ دوسری جانب ٹوٹ پھوٹ کی یہ صورت حال اگر اسی طرح برقرار رہتی تو شاید آج گرین لینڈ اور یورپ سمیت کناڈا، شمالی امریکہ اور شمالی روس کا کافی حصہ غرقاب ہو چکا ہوتا۔

الحاصل

یقیناً اس دعوے کی صداقت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ''برفانی سد'' کا معمار ذوالقرنین ہی ہے لیکن قارئین کے سامنے کچھ ایسے قرائن وشواہد بھی پیش

کیے جارہے ہیں جن سے کم از کم یہ اندازہ ضرور لگ جائیگا کہ برف کی یہ چادریں کیا واقعتاً لاکھوں سال کے عمل سے وجود میں آئی ہیں یا بڑے مختصر وقت میں کسی علم و ہنر کے ذریعہ انہیں تیار کیا گیا ہے۔

نمبر ایک: ماضی اور مستقبل میں آب وہوا کے تغیرات اور برفانی دور کی عمر، اس وقت کی آب وہوا کی کیفیت وغیرہ کو سمجھنے کی غرض سے دنیا کے مختلف سائنسی اداروں نے شمالی اور جنوبی قطبین پر موجود برف کی کھدائی کر کے برف کے کئی نمونے حاصل کئے ہیں۔

برف کے ان نمونوں کو آئس کور کہا جاتا ہے، ان میں دھول کے ذرات، آتش فشاں کی راکھ، سمندری نمکیات، مختلف قسم کی معدنیات اور گیس کے بلبلے جیسی کئی چیزیں دریافت ہوئی ہیں۔

دنیا بھر کے سائنسی ادارے اور مختلف یونیورسٹیاں برف میں موجود ان چیزوں کی گتھی سلجھانے کی کوشش میں لگی ہوئی ہے؛ لیکن ہر کوئی اس بارے میں درست رائی قائم کرنے سے عاجز نظر آرہا ہے کہ آخر یہ چیزیں برف کی ان چادروں میں کس طرح اور کہاں سے آئیں۔

مثلاً انٹارکٹکا کی برف کی پرت سے حاصل کردہ آئس کور میں آتش فشانی راکھ کی جو تہہ نظر آرہی ہے وہ کسی اتنے بڑے آتش فشاں کی نمائندگی کر رہی ہے جس کی راکھ نے پورے کرۂ ارض کو گھیر لیا تھا، لیکن یہ آتش فشاں کہاں پھٹا تھا اس کا پتہ ابھی تک نہیں لگ پایا، دنیا بھر کے سائنس داں اس گتھی کو سلجھانے میں لگے

ہوئے ہیں، کوئی اسے انڈونیشیا کے آتش فشاں سے جوڑنے کی کوشش کر رہا ہے تو کوئی دیگر پہاڑ سے لیکن چونکہ سائنسی تحقیقات کے مطابق ہر آتش فشاں کی مخصوص خصوصیات ہوتی ہیں، اور انٹارکٹکا پر پائی جانے والی راکھ دنیا کے کسی بھی پہاڑ کی راکھ سے منطبق نہیں ہو رہی ہے۔ دوسری جانب سائنس داں انٹارکٹکا کی برف کی تشکیل اور اس کے نیچے موجود آتش فشاں کے متعلق کچھ ایسے نظریات رکھتے ہیں کہ وہ یہ بھی نہیں مان سکتے کہ یہ راکھ انٹارکٹکا کی برف کے نیچے موجود آتش فشاں کے پھٹنے کے نتیجہ میں ہی نکلی ہے۔

لیکن اگر ہم یہ مانیں کہ راکھ کی یہ تہہ اور برف میں موجود مختلف گیسیں اور سلفر ڈائی آکسائڈ کی بھاری مقدار دراصل انہیں آتش فشاں کے باقیات ہیں جو برف کی تشکیل کے وقت بھی سرگرم تھے تو یہ گتھی آسانی سے حل ہو جاتی ہے چنانچہ آئس کور میں موجود دھول اور مٹی کا کسی پرت کی صورت میں جمنے کی بجائے گدلے پن اور بکھری ہوئی صورت میں موجود ہونا اس بات کا غماز ہے کہ برف کی یہ تہہ بہت کم مدت میں تشکیل دی گئی تھی ۔۔۔۔۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ مکمل چادر بنانے میں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے کام لیا گیا ہو؛ لیکن مکمل چادر بننے میں شاید ایک دو ماہ سے زیادہ کا وقت نہ لگا ہو۔

۔۔۔۔ ہاں حالیہ دنوں میں بعض محققین نے یہ تحقیق پیش کی ہے کہ آئس کور میں نظر آنے والی یہ گیسیں اور راکھ کی تہہ وہیں موجود آتش فشاں کے پھٹنے سے ہی وجود میں آئی ہے۔

اس طرح آئس کور میں آتش فشانی مادوں کی کثرت پھر اس خیال کی تائید کرتی نظر آتی ہے کہ آتش فشاں اور حرارتی مقامات ہی وہ وجہ اور محرک تھا جس کی وجہ سے ''برفانی سدین'' کی تعمیر عمل میں آئی ہے۔

نمبر دو: سائنس دانوں کی طرف سے پیش کردہ مذکورہ نظریات میں سے اگر کسی ایک کو بھی درست مانا جائے تو ایسی صورت میں ہونا یہ چاہیے کہ جس طرح آج گرین لینڈ پر برف جمی ہوئی شکل میں موجود ہے اسی طرح منطقۂ باردہ شمالی کے دوسرے علاقوں میں بھی برف ہونی چاہیے تھی، جبکہ بہت سے محققین کا ماننا ہے کہ سائبیریا، الاسکا اور کناڈا کے شمال مغرب کے نشیبی علاقوں کے معائنہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان علاقوں میں برف کا ایسا انجماد کبھی ہوا ہی نہیں جیسا کہ گرین لینڈ وغیرہ میں ہے۔

مان لیں کہ اگر ان علاقوں میں بھی برف موجود تھی تو آخر کیا وجہ تھی کہ موسم اور آب و ہوا کی یکسانیت کے باوجود دیگر علاقوں سے تو وہ برف ختم ہوگئی؛ لیکن گرین لینڈ کا علاقہ اس سے بچ گیا؟ بلکہ حیران کن بات یہ ہے کہ گرین لینڈ کے اس علاقہ پر بھی اسی طرح برف کی چادر پھیلی ہوئی ہے جو دائرۂ منطقۂ شمالی سے باہر ہے؛ حالانکہ کم از کم اس علاقہ کی برف تو کب کی ضرور پگھل جانی چاہیے تھی۔ کیا یہ چیز اس بات کی طرف اشارہ نہیں کرتی کہ گرین لینڈ پر کسی مخصوص ہدف کے پیش نظر اس قسم کی برف جمائی گئی ہے!

نمبر تین: ان دونوں منطقوں پر برف کے انجماد کے متعلق جتنے بھی

نظریات پیش کئے گئے ہیں ان میں ایک بات قدرے مشترک ہے کہ یہ برف برف باری کے ذریعہ وجود میں آئی ہے؛ لیکن شواہد کسی بھی طرح ان کے حق میں نہیں ہیں۔

دائرہ منطقہ باردہ شمالی کے آس پاس تراشیدہ اور مخروطی شکل کے پہاڑ، U شکل کی وادیاں، ندی نالوں میں گاد، نیز کنکر اور ایسے بڑے بڑے پتھر پائے جاتے ہیں جن کا تعلق ان علاقہ سے نہیں۔ ان کے متعلق برفانی دور کی وکالت کرنے والے ماہرین ارضیات کا کہنا ہے کہ پہاڑوں کی یہ شکلیں متحرک رہنے والے برفانی تودوں کی رگڑ کی وجہ سے بنی ہیں۔ اسی طرح یہ تودے جب پگھل کر بہتے ہیں تو اپنے ساتھ ریت کے ذرات اور ایسے بڑے بڑے پتھروں کو بھی بہا لے جاتے ہیں جو اپنی رگڑ سے وادیوں کو U کی شکل میں تراش دیتے ہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے مخروطی شکل کے کٹاؤ یا 'یو' شکل کی وادیاں برفانی تودوں کی رگڑ یا انکے پگھلنے پر ساتھ آنے والے ریت کے ذرات اور پتھر سے کسی طرح وجود میں نہیں آسکتی بلکہ انکی وجہ وہ پتھر اور ریت کے ذرات تھے جو پانی کے اس طوفان کے ساتھ تیزی کے ساتھ بہہ کر آئے تھے جس سے برف تشکیل دی گئی تھی۔

نمبر چار: آج کل گرین لینڈ سے پگھل کر سمندر کی طرف بہنے والے پانی اور برف کے ساتھ لاکھوں ٹن کے حساب سے ریت کی بڑی مقدار بھی بہہ کر آرہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ ریت کی اتنی بڑی مقدار کیا برف کی چٹانوں کی رگڑ سے وجود میں آسکتی ہے یا پھر یہ ریت بھی تشکیل برف کے وقت اسی تیز رفتاری سے گردش کرتے پانی کے نتیجہ میں وجود پذیر ہوئی تھی جو اپنے ساتھ پتھروں کے ٹکڑے بھی گھسیٹ کر لے آتا تھا۔

نمبر پانچ: اگر ان منطقوں میں موجود برف کی یہ چادریں برف باری کے نتیجہ میں بنی ہوتیں تو ایسی صورت میں ان کے نیچے نباتات اور درختوں کے باقیات کسی نہ کسی صورت میں موجود ہونے چاہیے تھے؛ لیکن ان علاقوں میں پگھلنے والی برف کی تہہ کے نیچے درخت اور پودوں کی ایسی کوئی باقیات نہیں پائی جاتیں کہ یہ کہا جاسکے کہ یہاں پہلے کبھی درخت اور نباتات کا وجود تھا۔ گویا اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ تشکیل برف کے وقت وہاں نباتات اور درخت تو موجود تھے لیکن تیزی کے ساتھ آنے والے پانی نے سیلاب کی طرح اس جگہ کو بالکل صاف کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے آج وہاں نباتات کا نام ونشان بھی نہیں ملتا۔

نمبر چھ: برف باری کے لیے ایک مخصوص قسم کا درجہ حرارت مطلوب ہوتا ہے، اب برفانی دور کے لیے جس نوعیت کا درجہ حرارت بتلایا جارہا ہے اس میں کسی بھی طرح برفباری ممکن نہیں کیونکہ ایسی صورت میں موسم اس قدر خشک اور سرد ہوگا کہ اس میں برف باری کی کوئی شکل پیدا نہیں ہوسکتی۔ مثلاً آج انٹارکٹکا کو ہی دیکھ لیں کہ وہاں بہت سے علاقے ایسے ہیں جہاں بارش یا برف باری کا کوئی نام ونشان نہیں، بلکہ پورے انٹارکٹکا پر سالانہ ۲ انچ کے اوسط سے برف باری ہوتی ہے۔

نمبر سات: ماہرین ارضیات کو منطقۂ باردہ شمالی کے آس پاس کے کئی علاقوں سے ہاتھیوں کی ہڈیاں دستیاب ہوئی ہیں۔ آثار قدیمہ کے ماہرین نے انہیں ''اونی ہاتھی'' کا نام دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ہاتھی لاکھوں سالوں سے یہاں آباد تھے جو تقریباً چار پانچ یا دس بارہ ہزار سال پہلے وہاں سے نابود ہو گئے۔

اب سوال یہ ہے کہ کس بنیاد پر یہ دعوی درست ہوسکتا ہے کہ ہاتھی کی یہ قسم برفانی دور کے جانوروں سے تعلق رکھتی تھی؟

اگر ان ہاتھیوں کو ''اونی ہاتھی'' کا نام دیکر برفانی دور سے جوڑا جائے تو اس صورت میں سب سے بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ برفانی دور میں زمین ہر طرف برف سے ڈھنکی ہوئی ہونے کی وجہ سے جب وہاں درخت اور بناتات کا نام و نشان بھی نہیں مل سکتا تھا تو پھر ایسے ماحول اور آب و ہوا میں وہ وہاں کیسے زندہ رہ سکتے تھے۔!

اگر یہ کہا جائے کہ ٹنڈرا اور گھاس پھوس والے میدان ان کا ٹھکانہ تھے تو اولاً تو جس برفانی دور کی بات کی جارہی ہے اس نقطۂ نگاہ سے ایسے حالات میں ٹنڈرا جیسے علاقوں کا وجود ہی ممکن نہیں اور اگر مان بھی لیا جائے تو پھر سوال ہوتا ہے کہ ایسے علاقے تو آج بھی موجود ہیں پھر ہاتھی جیسے جانوروں کی یہ اقسام کیونکر معدوم ہوگئی۔ مناسب ماحول میں زندگی کا مقتضی تو یہ تھا کہ ایسے جانور آج بھی زندہ ہوتے۔

اس نظریہ پر اشکال کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ اگر موسم کی تبدیلی آہستہ آہستہ

ہوتی تو یہ تمام جانور نقل مکانی کے ذریعہ شمال سے جنوب کی طرف نکلتے جاتے ؛ لیکن چونکہ موسم کی یہ تبدیلی آہستہ آہستہ نہیں تھی بلکہ یکا یک تھی اسی وجہ سے ان جانوروں کو نقل مکانی کا موقع نہیں ملا اور فوت ہو گئے۔

لہٰذا یہ کہنا زیادہ معقول ہوگا کہ معتدل یا گرم آب و ہوا میں رہنے والے ہاتھیوں کو جب تشکیل سد کے بعد یکا یک بدلنے والا موسم راس نہیں آیا تو وہ بے حد ٹھنڈ کی تاب نہ لا کر مر گئے اور یہ ہڈیاں انہیں ہاتھیوں کی باقیات میں سے ہیں۔

نمبر آٹھ: برف کا پانی

یہاں ایک سوال یہ ہے کہ اگر برف کی یہ چادریں ذوالقرنین کے ذریعہ بنائی گئی ہیں تو ان چادروں میں موجود پانی کہاں سے لایا گیا؟ کیا اندرون زمین موجود پانی کے عظیم الشان ذخیرے یا بحر شمالی و جنوبی جو درحقیقت عین ہیں، ان سے یہ چادریں تشکیل دی گئی ہیں یا پھر سمندروں سے یہ پانی کھینچا گیا ہے، یا پھر ہر قسم کے پانی کا استعمال کرتے ہوئے ان چادروں کی تشکیل عمل میں آئی ہے۔

۔۔۔۔۔ شواہد اور قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ برف کی تشکیل کے لئے عین کے علاوہ سمندروں کا پانی بھی استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن سمندری پانی کو بارش یا برف باری میں بدل کر برفانی سد کی تعمیر کرنے کے بجائے براہ راست کھارے پانی کی صفائی کر کے اسے منجمد کیا گیا ہے۔

دیگر تمام نظریات کے حاملین کی طرح برف باری کے ذریعہ برفانی سد کی تشکیل مانی جائے تو ایسی صورت میں گرین لینڈ اور انٹارکٹکا کی برف میں نمک کی

مقدار بالکل نہیں ہونی چاہیے کیونکہ برف فضا میں موجود بخارات کے ذریعہ بنتی ہے اور جب سمندری پانی بخارات میں بدلتا ہے تو ایسی صورت میں اس میں نمک شامل نہیں ہوتا۔ نیز برف کے کریسٹل میں نمک بالکل نہیں ہوتا ورنہ برف کا انجماد ٹھیک سے نہیں ہو پاتا ہے۔ دوسری جانب گرین لینڈ اور انٹارکٹکا سے حاصل کئے گئے آئس کور سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں کی برف میں تقریباً ایک فیصد نمک پایا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر برف باری کے ذریعہ یہ برف جمی ہوتی تو ایسی صورت میں یہاں نمک بالکل نہیں ہونا چاہیے تھا۔

نمبر نو : یہاں شمالی وجنوبی امریکہ نیز افریقہ کے صحرا میں پائے جانے والے سالٹ فلیٹ کے نام سے مشہور نمک کے عظیم الشان ذخائر بھی قابل توجہ ہیں جن میں لاکھوں ٹن نمک موجود ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ نمک کے یہ ذخائر آخر کس طرح وجود میں آئے۔ سائنس دانوں کا ماننا ہے کہ نمک کے یہ ذخائر کھارے پانی پر مشتمل جھیل کے سوکھنے پر وجود میں آئے ہیں ؛لیکن سائنسی اصولوں کے پیش نظر یہ بات کسی طرح قابل فہم نہیں ہوسکتی کہ کسی جھیل کے سوکھنے پر لاکھوں ٹن کی بھاری مقدار میں اس طرح نمک پیچھے چھوٹ جائے۔۔۔۔۔۔لہٰذا کہیں ایسا تو نہیں کہ ان ذخائر میں موجود نمک اس سمندری پانی سے صاف کر کے نکالا گیا ہو جن سے گرین لینڈ اور انٹارکٹکا پر برف کی چادروں کی تشکیل ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ نباتاتی ، حیاتیاتی ، ارضیاتی اور برف کے کیمیائی تجزیہ جیسے دیگر بے شمار دلائل پیش کئے جاسکتے ہیں جو اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی

ہیں کہ قدرتی طور پر اس قسم کی چادریں کسی طرح وجود میں نہیں آسکتیں بلکہ انہیں کسی غیر معمولی طریقہ سے مختصر وقت میں تشکیل دیا گیا ہے۔

الغرض اس طرح مختلف نوعیت کے دیگر بہت سارے شواہد پیش کئے جاسکتے ہیں جو قرآن کے اس دعوے کی صداقت کے لئے کافی ہونگے کہ ان برفانی چادروں کا معمار ذوالقرنین ہی ہے۔

یہاں پہونچنے کے بعد اب ہمیں اس بات کی وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی کہ ردم کی طرح اگر سدین کا وجود نہ ہوتا تو آج انسان کے لیے روئے زمین پر بسنا کس قدر دشوار ہوتا۔ آتش فشانی کی کثرت کی وجہ سے دونوں منطقے قابل رہائش نہ رہتے۔ بلکہ فضائی غلاف میں خرابی کی وجہ سے خط استواء کے آس پاس کے علاقوں کا درجہ حرارت شاید اس قدر بلند ہوتا کہ اس علاقے میں جینا بھی ناممکن ہوتا۔ سطح سمندر ڈھائی سوفٹ بلند ہونے کی وجہ سے بلند علاقوں کے پانی میں بھی کھاراپن موجود ہوتا، ساحلی علاقے غرقاب ہونے کی وجہ سے کناروں پر بسنے والی چالیس فی صد آبادی مزید گنجان آبادی کا سبب بنتی۔ الغرض آب وہوا سے لیکر پانی کے نظام تک ہر معاملہ کس قدر پیچیدہ ہوتا اس کا تصور بھی لرزاں طاری کرنے کے لئے کافی ہے۔

وعدۂ جزاوسزا

ذوالقرنین کی عظمت پر دلالت کرنے والی سدین اور ردم کے تذکرے کے بعد اب ایک اہم سوال یہ رہجاتا ہے کہ منطقۂ باردہ شمالی اور جنوبی کے علاقے

آتش فشانی کی زد میں ہونے کی وجہ سے وہاں انسانی وجود خطرے میں تھا تو دوسری جانب ان پر برف کی چادریں بچھانے کے بعد یہ علاقے کسی طرح انسانی بود و باش کے قابل نہیں تھے تو اب وہاں بسنے والی قوموں کا کیا ہوا؟

''قَالَ أَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهُ ثُمَّ يُرَدُّ إِلَى رَبِّهِ فَيُعَذِّبُهُ عَذَابًا نُكْرًا ﴿۸۷﴾ وَأَمَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُ جَزَاءً الْحُسْنَىٰ ۖ وَسَنَقُولُ لَهُ مِنْ أَمْرِنَا يُسْرًا ﴿۸۸﴾''

مذکورہ آیت میں ذوالقرنین نے مغرب الشّمس میں رہنے والی قوم کے ساتھ اپنے فرض کے مطابق جزا و سزا کا معاملہ کرنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ اب چونکہ اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کے تذکرہ کو ''ذکر'' سے تعبیر کیا ہے تو پھر اس جزا و سزا کی تعمیل و نفاذ پر دلالت کرنے والے کسی نہ کسی درجہ کے ثبوت بھی خارج میں ضرور ہونے چاہیے۔

دوسری جانب مقام ثالث کے سفر میں جس قوم سے ذوالقرنین کی ملاقات ہوئی تھی اس کا تذکرہ قرآن نے ان الفاظ سے کیا ہے ''حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُونِهِمَا قَوْمًا لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا ﴿۹۳﴾''۔

''مِنْ دُونِهِمَا'' کی لغوی تحقیق کے سے جہاں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بین السدین رہنے والی قوم کے تمام افراد مرفوع القلم یا غیر مکلف تھے وہیں یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ پہلی دو قومیں حکم شرعی کے لحاظ سے ایک ہی درجہ کی تھیں، گویا جزا و سزا کے جس سلوک کا وعدہ مغرب الشّمس یعنی منطقۂ باردہ شمالی میں

رہنے والی قوم کے لئے ذوالقرنین نے کیا تھا وہی وعدہ مطلع الشّمس یعنی منطقۂ باردہ جنوبی میں رہنے والی قوم کے لئے بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے منطقۂ باردہ جنوبی یعنی انٹارکٹکا پر رہنے والی قوم کے لئے جزاوسزا کا الگ سے تذکرہ نہیں کیا۔

اخروی جزا وسزا تو قیامت کے دن ہوگی ؛ لیکن اب سوال یہ ہے کہ ذوالقرنین نے دنیا میں ان قوموں کے ساتھ ایسا کیا معاملہ کیا کہ اس پر جزاوسزا کا اطلاق کیا جاسکے، نیز کیا موجودہ وقت میں اس جزاوسزا کے ایسے کوئی آثار ہیں جن سے ثابت ہو کہ اس طریقہ پر ذوالقرنین نے ان قوموں کے ساتھ جزاوسزا کا معاملہ فرمایا تھا؟

ذوالقرنین کے طریقۂ سزاوجزا کو بیان کرتی آیت نمبر ۸۷ اور ۸۸ کو غور سے دیکھیں !۔۔۔۔اس میں سب سے پہلی قابل توجہ بات یہ ہے کہ جزاوسزا کے بیان میں پہلے سزا کا تذکرہ ہے، پھر جزا کا۔ دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ جزا کے بیان میں بھی اخروی جزا کو پہلے بیان کیا گیا ہے جبکہ دنیوی جزا کو بعد میں۔ ۔۔۔۔اس کی وجہ کیا ہے؟ من جملہ مفادات کے اس کا ایک واضح مطلب یہ ہے کہ دنیوی جزا کوئی ایسا معاملہ تھا جس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تھوڑا وقت درکار تھا، جبکہ سزا کے نفاذ کے لئے لمبے وقت کی ضرورت نہیں تھی۔

نیز ''فَسَوْفَ نُعَذِّبُهُ ثُمَّ يُرَدُّ إِلَىٰ رَبِّهِ فَيُعَذِّبُهُ عَذَابًا نُّكْرًا ''میں ''ثم '' اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ ذوالقرنین نے ظالم قوم کو قتل نہیں کیا تھا بلکہ ان کو زندہ رکھتے ہوئے کسی ایسے حالات میں مبتلا کر دیا تھا جو اس قوم کے لئے راحت و

سکون کے خلاف تھے۔

الفاظ قرآنی پر غور فرمائیں کہ سزا کے متعلق زیادہ تفصیل سے بات نہیں کی گئی لیکن جزا کے متعلق بات کرتے ہوئے فرمایا ''وَأَمَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُ جَزَاءً الْحُسْنَىٰ ۖ وَسَنَقُولُ لَهُ مِنْ أَمْرِنَا يُسْرًا ﴿۸۸﴾'' کہ جو مؤمن اور صالح ہے تو اسکے لئے (آخرت میں) بہترین بدلہ ہے ہی اور ہم بھی اس کے لئے ہمارے اختیار و قدرت کے مطابق آسودہ حالی کا معاملہ کرینگے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ بات یاد رکھیں کہ قال یقول قولاً: کا استعمال صرف کہنے یا بولنے کے معنی میں نہیں ہوتا بلکہ قرآن نے اسے جا بجا ''روش، معاملہ، فیصلہ اور برتاؤ کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے، چاہے اس کا تعلق لسان سے ہو، لین دین سے ہو یا عبادت جیسے کسی دیگر معاملہ سے۔

آیت نمبر ۸۸ کے اس جملہ ''وَأَمَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُ جَزَاءً الْحُسْنَىٰ ۖ وَسَنَقُولُ لَهُ مِنْ أَمْرِنَا يُسْرًا'' میں کئی باتیں نہایت توجہ کی حامل ہیں۔

ایک: ظالمین کی سزا کے برخلاف جزا کے معاملہ میں اخروی بدلے کو پہلے بیان کیا جارہا ہے اور اس کے بعد کہا جارہا ہے کہ ہم جلد ہی ان کے لئے ہمارے اختیار و استطاعت کے مطابق راحت و سکون کا انتظام کرینگے۔ گویا ''یسر'' کا جو معاملہ ہے وہ کسی بادشاہ کے دربار کی طرح کا فوری اور وقتی نہیں تھا کہ دراہم و دنانیر تقسیم کر کے روانہ کر دیا گیا ہو بلکہ یہ آسائش کا کوئی ایسا معاملہ تھا جس کے لئے وقت درکار تھا۔

دو: ''مِنْ أَمْرِنَا'' کے لفظ پر غور فرمائیں! ''امر'' کا لفظ قدرت و استطاعت پر دلالت کرتا ہے۔ اب ذوالقرنین کو کس قسم کی قدرت و استطاعت حاصل تھی اسے إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿۸۴﴾ میں بیان کیا گیا ہے اور جس کی تشریح ''سدین اور ردم'' کی تعمیر صورت میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ اب گویا ذوالقرنین فرما رہے ہیں کہ زمین کے تکوینی معاملات میں ہمیں جس قسم کا بے پناہ اختیار و قدرت حاصل ہے ہم اسی حیثیت کے مطابق اتنا ہی بڑا یسر کا معاملہ کرینگے۔ یعنی یہ آسانی اور سہولت کا معاملہ کوئی چھوٹا موٹا اور وقتی نہیں ہوگا بلکہ ''سدین اور ردم'' کی طرح کا ایسا ہی وسیع و عریض اور ایسا دیر پا ہوگا کہ اس کا فائدہ نسلا بعد نسل چلتا ہی رہے۔

ذوالقرنین کے متعلق قرآنی دعوے کے پیش نظر یہ بات ذہن نشیں رہے کہ انہیں روئے زمین پر تکوینی معاملات میں جو عظیم الشان اور حیرت انگیز تصرفات کا اختیار حاصل تھا وہ صرف وقتی اور محدود پیمانے کا نہیں تھا بلکہ ان کی صوابدید کے مطابق وہ قیامت تک کے دیر پا کارنامے بھی انجام دے سکتے تھے۔

تین: 'یُسر' کیا ہے؟

یُسْرًا: ''یسر'' عسر کی ضد ہے۔ یسر کا معنی ہے آسانی۔ الیسر ھو فعل ما یحقق الغایة بأدنی قدر من المشقة. و تدلُّ کلمة الیسر علی السھولة واللین والانقیاد، والغنی.

یسر کسی بھی معاملہ میں ایسی سہولت پر دلالت کرتا ہے جو عسر کے بعد حاصل ہو۔ اگر

ہم اسے زیر بحث آیت میں اس ''عسر'' کو مدنظر رکھتے ہوئے سمجھیں جس کی وجہ سے دونوں علاقے ان قوموں کے لئے قابل رہائش نہیں تھے تو ایسی صورت میں ''یسر'' سے مراد، ایسی سہولت و آسائش ہوگی جس کا تعلق انسان کی بنیادی ضرورت آب وہوا اور کھان پان سے ہو۔

گویا ان دونوں علاقوں کی آب وہوا اور کھانا پانی مسلسل بگڑتا جارہا تھا جس کی وجہ سے وہاں کی قومیں کسی ایسی تنگی کا سامنا کررہی تھی جو کبھی ختم ہونے والی نہیں تھی۔

اب ظاہر سی بات ہے کسی قوم کے لئے اس سے زیادہ آسائش فراہم کرنے والی بات کیا ہوگی کہ اس کا ذریعۂ معاش آسان ہوجائے۔ اگر کسی کے لئے مناسب آب وہوا کے ساتھ پانی کا بہتر نظام میسر ہو، کاشت کے قابل اچھی زمین ہو، سبزی ، اناج وغلہ، مچھلی اور گوشت جیسی بنیادی ضروریات زندگی کے علاوہ ہزاروں قسم کے پھل اور میوے جیسی تمام چیزیں کسی جگہ آسانی سے میسر ہوں تو بھلا اور کیا چاہیے۔

لہٰذا اب ہمیں مذکورہ بالا ضروریات زندگی کو نہایت آسانی سے پورا کرنے والی ایسی جگہ تلاش کرنی ہوگی جو ہزاروں سال گذرنے کے باوجود اسی طرح قائم و دائم ہو جس طرح کہ گرین لینڈ وانٹارکٹکا کی برف اور مقناطیسی میدان آج تک بنی نوع انسانی کے لئے سہولت اور حفاظت کی خدمات سرانجام دیتے چلے آرہے ہیں۔

چنانچہ جب ہم روئے زمین پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں ایسی جگہوں میں سر فہرست ایسے دو علاقے نظر آتے ہیں جہاں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جن پر صحیح معنی میں ''من امرنا یسرا'' کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ ان میں پہلا ہے دنیا کا سب سے بڑا اور پر اسرار ترین ایمیزون کا جنگل اور دوسرا ہے براعظم افریقہ میں واقع کانگو کا برساتی جنگل۔

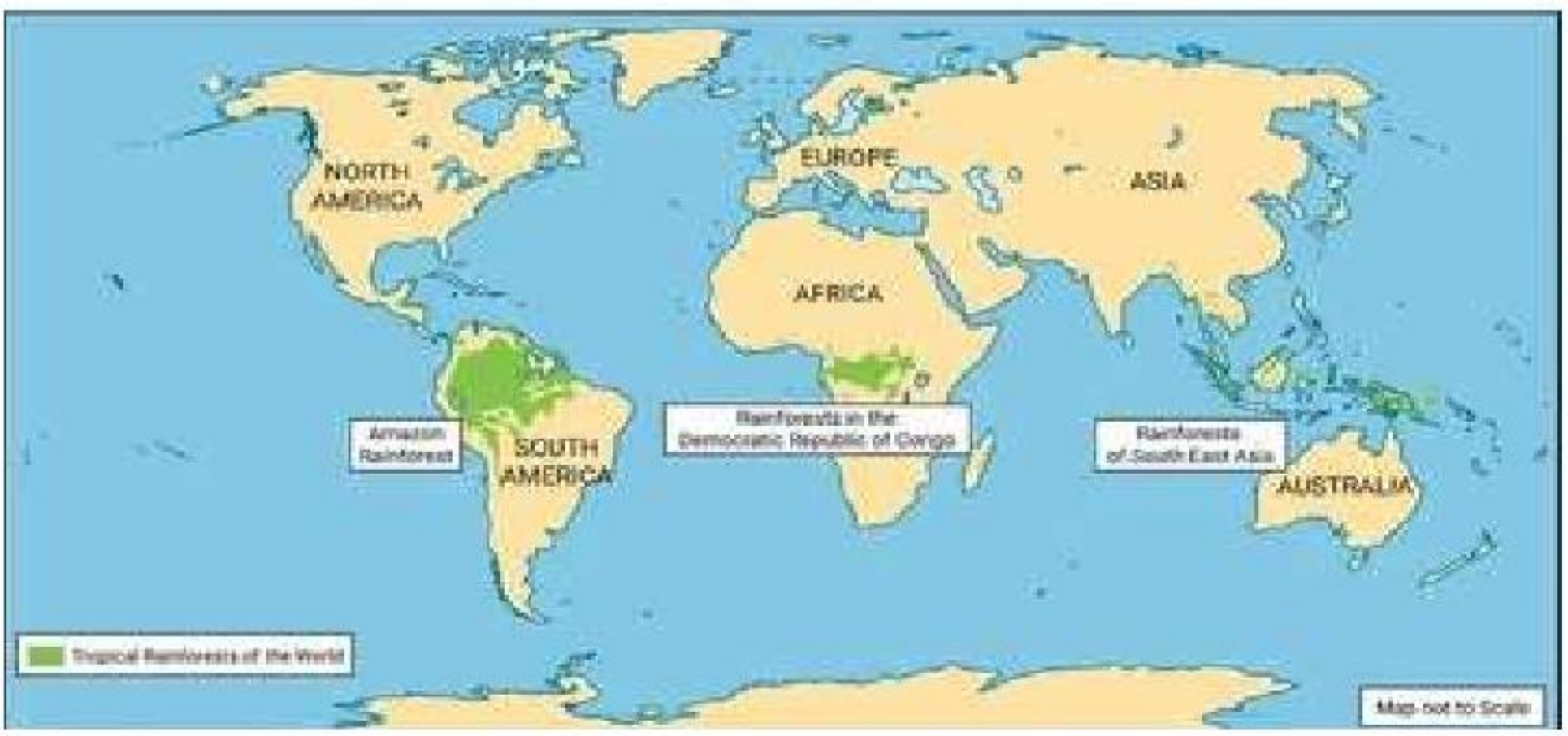

تو کیا ان جنگلوں کا معمار بھی ذوالقرنین ہے؟

ہاں جی ہاں! ان برساتی جنگلوں کا معمار ذوالقرنین ہی ہے اور ان جنگلوں میں اور ان کے آس پاس بسنے والی قومیں وہی ہیں جو برفانی سدین کی تعمیر سے پہلے آرکٹک سرکل میں واقع دریائے شمالی کے آس پاس اور براعظم انٹارکٹکا پر بسا کرتی تھی۔ چنانچہ براعظم افریقہ میں واقع کانگو کے جنگل اور اس کے آس پاس بسنے والی سیاہ فام قوم وہی قوم ہے جو پہلے انٹارکٹکا میں رہا کرتی تھی جبکہ دنیا کے سب سے بڑے جنگل ایمیزون اور اس کے آس پاس بسنے والی مختلف قوموں میں ایک قوم وہ ہے جو منطقۂ شمالی میں واقع دریائے شمالی کے اردگرد رہا کرتی تھی۔

ہے نا حیران کر دینے والی بات!۔۔۔۔۔ہاں وہی افریقی نسل جنہیں ہم ''کالے لوگ'' کہتے ہیں، ان کا اصلی وطن جزیرۂ انٹارکٹکا ہی ہے۔ ذوالقرنین نے برفانی سد کی تشکیل سے پہلے انہیں وہاں سے ہٹا کر براعظم افریقہ منتقل کر دیا تھا۔

لیکن کیسے؟

کیا آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ افریقی قوم قد و قامت، خد و خال اور رنگ و بال جیسی مختلف صفات و خصوصیات میں دنیا کی دیگر اقوام سے اس قدر مختلف کیوں ہے؟ صرف ظاہری شکل و شباہت نہیں بلکہ میٹابولزم اور ہڈیوں کی کثافت میں بھی یہ قوم دنیا کی دیگر اقوام سے قدرے مختلف ہے۔

آب و ہوا، جغرافیائی جائے وقوع اور زمینی کوائف حیوانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں، رنگ، ساخت، خد و خال، قد و قامت حتی کہ عادات و اطوار جیسی سب چیزیں زمینی کیفیات سے اثر پذیر ہوتی ہیں، یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ لیکن افریقی زمین میں ایسے حالات و کوائف بالکل بھی نہیں پائے جاتے کہ جنہیں افریقی نسل میں اس قسم کے بین تغیر کے لئے ذمہدار مانا جا سکے۔

تو کیا سیاہ فام قوم کا اصل وطن افریقہ کی سرزمین نہیں بلکہ کوئی دوسری جگہ ہے؟ جی ہاں ان کا اصلی مسکن انٹارکٹکا کی وہی زمین ہے جہاں کی فضا میں اوزون کی پرت نہ ہونے کی وجہ سے بالائے بنفشی کی قصیر موج رکھنے والی شعاعیں بھی انٹارکٹکا تک بلا کسی رکاوٹ کے پہونچ جایا کرتی تھیں۔ ہاں یہ وہی قوم ہے جسے انٹارکٹکا پر برفانی سد تعمیر کرنے سے پہلے افریقہ منتقل کر دیا گیا تھا۔

قرآن کے اس بیان کو دوہرائیں جس میں اس نے مطلع الشّمس یعنی انٹارکٹکا کے سفر کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا ''حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلَىٰ قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَل لَّهُم مِّن دُونِهَا سِتْرًا ﴿۹۰﴾'' یعنی فضا میں ایک مخصوص قسم کی پرت کا نہ ہونا اور اس کی وجہ سے بالائے بنفشی شعاعوں کا ان تک بلا کسی رکاوٹ کے پہونچ جانا یہ ان کے مفاد میں تھا۔

روئے زمین کے دیگر علاقوں میں سورج کی الٹرا وایولیٹ بی شعاعیں انسان، چرند پرند، نباتات، پیڑ پودے حتی کہ معدنیات کے لئے بھی مختلف قسم کے نقصان کا باعث ہیں، بالائے بنفشی شعاعوں کے نتیجہ میں ہونے والے مضر اثرات میں خلیات کی توڑ پھوڑ، ڈی این کی خرابی اور جلدی کینسر بھی شامل ہے۔لیکن تحقیقات کے مطابق سیاہ فام قوموں میں جلدی کینسر کا خطرہ عام لوگوں کی بنسبت ۷۰ فیصد کم ہے، نیز سیاہ رنگت کے لوگوں کے لئے سفید فام لوگوں کی بنسبت سورج کی تپش میں زیادہ طویل عرصے تک رہنے کے باوجود سن برن کا خطرہ بہت ہی کم ہوتا ہے۔

بالائے بنفشی شعاعوں کے کچھ مثبت نتائج بھی ہیں چنانچہ جس طرح الٹرا وایولیٹ اے عام لوگوں کے لئے مثبت نتائج پیدا کر کے مدافعتی نظام اور انسانی جلد میں وٹامن ڈی ۳ کی پیدائش کو بڑھا کر ہڈیوں کو مضبوط کرنے کا کام کرتی ہے اسی طرح الٹرا وایولیٹ بی کی وجہ سے ہی انٹارکٹکا پر بسنے والی سیاہ فام قوم کا میٹابولزم اور ہڈیوں کی کثافت اس قدر مضبوط اور مختلف ہے۔

گویا سیاہ فام لوگوں میں بال و رنگ، شکل وصورت اور قد و قامت کے علاوہ ان کی ہڈیوں کا حجم، معدنی کثافت، پروٹین کا فرق، میٹابولزم، اور اس قسم کے دیگر جینیاتی فرق اور ایسی کئی خصوصیات کے پیچھے بالائے بنفشی بی شعاعوں کا ہی بڑا کردار ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں ہم یوں کہینگے کہ خالق کائنات نے انٹارکٹکا کا فضائی ماحول ان لوگوں کی طبعی ضرورت کے مطابق ہی بنایا تھا۔

دراصل ان امتیازی اختلافات اور بلائے بنفشی شعاعوں کے درمیان جو چیز کلیدی کردار ادا کرتی ہے وہ ہے انسانی جلد میں میلانین (melanin) نامی روغنی مادہ کا وجود۔ اسی روغن کی وجہ سے رنگت سیاہ نظر آتی ہے۔ سائنسی تحقیقات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ یہ روغنی مادہ بیرونی عوامل اور سورج کی بالائے بنفشی جیسی شعاعوں کے مضر اثرات سے انسان کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔

اب ظاہر سی بات ہے کہ افریقہ میں رہتے ہوئے سیاہ فام لوگوں کو اتنی زیادہ مقدار میں میلانین کی ضرورت ہی نہیں؛ چونکہ بالائے بنفشی شعاعوں کے مضر اثرات سے بچاؤ کے لئے تو اتنی مقدار کافی ہے جتنی جنوبی امریکہ، انڈونیشیا اور کیریباتی جیسے دیگر استوائی علاقوں میں رہنے والی انسانی نسلوں میں پائی جاتی ہے۔

چنانچہ سیاہ فام قوم کی جلد میں الٹراوایولیٹ شعاع کو جذب کرنے والے اور رنگت کو سیاہ بنانے والے ''میلانن'' مرکب کی زیادتی، اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ہڈیوں کی کثافت اور میٹابولزم کے فرق جیسی خصوصیات پکار پکار کر کہہ

رہی ہیں کہ یہ سیاہ فام لوگ دراصل براعظم انٹارکٹکا کے اس ماحول کے پروردہ تھے جہاں قرآن کے بیان کے مطابق اوزون نامی پرت کا وجود ہی نہیں تھا، جس کی وجہ سے بالائے بنفشی شعاعوں کی قصیر موج رکھنے والی وہ قسم بھی زمین تک پہونچ کر انہیں فائدہ پہونچایا کرتی تھی جو دنیا کی دیگر اقوام کے لئے نہایت نقصاندہ ثابت ہوتی تھی۔

مزید تحقیقات کے ذریعہ اس بات کو مزید پختہ کیا جاسکتا ہے کہ افریقہ کی سیاہ فام قوم کا اصل مسکن انٹارکٹکا ہی ہے۔ اس کے لئے ہمیں قرآن کے بتلائے نقشے کے مطابق یہ دیکھنا ہوگا کہ اس وقت انٹارکٹکا کی آب و ہوا کیسی تھی۔ مثلاً کیا سیاہ فام قوم کے ناک کے نتھنوں کی مخصوص وضع قطع آتش فشانی کی وجہ سے فضا میں گندھک جیسی گیس کی شمولیت کی بنا پر تھی؟ اسی طرح اس قسم کی مخصوص آب و ہوا میں پنپنے والے پیڑ پودے اور جانور بھی مخصوص خصوصیات کے حامل ہونگے، چنانچہ جب اس قوم کو وہاں سے منتقل کیا گیا تو غالب گمان ہے کہ ضرورت کے مطابق بہت سے جانور اور مخصوص قسم کے پیڑ پودوں کو بھی منتقل کیا گیا ہوگا؛ لہٰذا اب ہمیں دیکھنا ہوگا کہ کیا افریقہ میں ایسے پیڑ پودے یا جانور پائے جاتے ہیں جن کے متعلق کہا جاسکے کہ یہ بھی اسی انٹارکٹکا کے مخصوص ماحول کے پروردہ ہیں۔

الغرض ذوالقرنین کی آمد کے وقت موجود انٹارکٹکا کی آب و ہوا اور موجودہ سیاہ فام لوگوں کی جسمانی ساخت میں اصولی مطابقت کے بعد یہ بات بلا کسی تردد کے کہی جاسکتی ہے کہ انٹارکٹکا کی سیاہ فام قوم کے مؤمن و صالح لوگوں سے جس

''یسر'' کا وعدہ ذوالقرنین نے کیا تھا وہ آج کانگو کے برساتی جنگل کی صورت میں موجود ہے۔ ٹھیک یہی صورت حال ایمیزون جنگل کی بھی ہے؛ اس لئے کہ اس جنگل اور اس کے آس پاس ''ناسمجھ قوم'' کے علاوہ ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو امریکہ کے اصلی باشندے نہیں بلکہ سائنسی تحقیقات بتلاتی ہیں کہ ان لوگوں کے آباء واجداد ہزاروں سال پہلے سائبیریا سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔

قرائن وشواہد کی بنیاد پر اس دعوے کو مزید معقول ثابت کرنے سے پہلے آیئے ہم ان دونوں جنگلوں کے کوائف کو جان لیتے ہیں۔

ایمیزون: روئے زمین کا سب سے بڑا، خوبصورت، خوفناک اور پراسرار جنگل

ایمیزون جنوبی امریکہ میں ۵۵ لاکھ مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا دنیا کا سب سے بڑا برساتی جنگل ہے، یہ برازیل، بولیویا، سرینام، گیانا، فرانسیسی گینا، وینزویلا، پیرو، کولمبیا اور ایکواڈور جیسے نو ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔

اس جنگل میں کیڑے مکوڑے، چرند و پرند، حشرات الارض اور جانوروں کی لاکھوں اقسام کے علاوہ ہزاروں قسم کے پیڑ پودے پائے جاتے ہیں۔ دنیا کے کل تیس فیصد جانور امیزون کے جنگلات میں پائے جاتے ہیں۔ جن میں ان گنت اقسام ایسی ہیں جو دنیا میں اور کہیں نہیں پائی جاتیں۔

مختلف قسم کے پچیس لاکھ حشرات الارض، سوا چار سو سے زائد دودھ دینے

والے جانداروں کی اقسام، تیرہ سو سے زائد پرندوں کی قسمیں، تین سو اسّی اقسام کے رینگنے والے جاندار اور چار سو سے زائد ایسے جانداروں کی اقسام پائی جاتی ہیں جو پانی و خشکی دونوں جگہ رہ سکتے ہیں۔ دریائے ایمیزون میں تقریباً تین ہزار قسم کی مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔ اس جنگل میں پائی جانے والا گرین اینا کونڈا، بلیک کیمین، زہریلے ڈارٹ مینڈک، بل شارک اور برازیل کی زہریلی آوارہ مکڑیاں دنیا کے خطرناک ترین جانداروں میں شمار ہوتے ہیں۔

ایک تحقیق کے مطابق روئے زمین پر موجود حیاتیات کا نصف اس جنگل میں پایا جاتا ہے۔ اس جنگل میں موجود ساٹھ فی صد حیاتیات ایسی ہیں جن کی ابھی تک شناخت نہیں ہو پائی ہے۔

تیس ہزار قسم کے پھل کی پیداوار کے علاوہ یہاں ہزاروں قسم کی جڑی بوٹیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ یہ جنگل اس قدر گھنا ہے کہ بہت سارے علاقوں میں سورج کی روشنی بھی نہیں پہونچ پاتی، جب ایسے علاقوں میں بارش ہوتی ہے تو پانی کو نیچے پہونچنے میں دس سے بارہ منٹ کا وقت لگ جاتا ہے۔

حجم کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا دریا بھی اسی جنگل میں بہتا ہے، جسکی لمبائی تقریبا ۶۵۰۰ کلومیٹر ہے، لمبائی کے اعتبار سے دریائے نیل کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ امیزون کے کل ۱۱۰۰ کے قریب معاون دریا ہیں۔ ان میں ۱۷ دریا ایسے ہیں جن کی لمبائی ۱۵۰۰ کلومیٹر سے زیادہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ایک سیکنڈ میں ایمیزون دریا کا پچپن لاکھ گیلن پانی بحر اوقیانوس میں بہہ جاتا ہے۔ برازیل کا شہر ماناؤس اور بیلم، پیرو کا ایلکوٹس اور پورٹو مالڈوناڈو اسی دریا کے کنارے آباد ہیں۔

امیزون کے معاون دریاؤں میں ایک دریا ایسا بھی ہے جس کا پانی بہت ہی گرم ہے۔ ماہرین کے مطابق اس پانی کا درجہ حرارت ۹۵ سے ۱۱۰ درجہ سنٹی گریڈ تک گرم رہتا ہے۔

ماہرین حیاتیات کے مطابق اس قدر سائنسی ترقی کے باوجود اس جنگل کا اب تک صرف دس فیصد حصہ ہی معلوم کیا جاسکا ہے۔

الغرض عجیب وغریب خصوصیات سے آراستہ یہ جنگل صرف مقامی آبادی کے لئے ہی نفع بخش نہیں اور صرف یہی نہیں کہ دنیا کے لئے معدنیات، جڑی بوٹی

اور غذائی ضرورت کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے بلکہ زمین کی آب و ہوا کو صاف اور متوازن بنائے رکھنے میں اس کا نہایت اہم کردار ہے۔اسی لئے اس جنگل کو دنیا کا پھیپھڑا بھی کہا جاتا ہے چونکہ آکسیجن کی کل پیداوار کا بیس فیصد یہیں سے پیدا ہوتا ہے۔

امریکی لوگ اور منطقۂ شمالی کے باشندے

ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق امریکہ میں کچھ ایسے باقیات دریافت ہوئے ہیں جن کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ یہاں انسان کم و بیش ۱۵۰۰۰ سالوں سے آباد ہے۔

امریکہ کے موجودہ لوگ بنیادی طور پر تین طرح کے ہیں ۔ ۱: جنگلی قبائل جو ایمیزون کے جنگل میں رہتے ہیں ۔ ۲: پندرہویں صدی عیسوی کے بعد آنے والے یورپین اور سیاہ فام لوگ۔ ۳: شمالی و جنوبی امریکہ میں آباد وہ لوگ جو ہزاروں سال سے یہاں آباد ہیں۔

ایمیزون جنگل میں ۴۰۰ کے قریب جنگلی قبائل ہزاروں سال سے آباد ہیں ،جن کی تعداد تقریباً دس لاکھ ہے، ہر قبیلے کا اپنا علاقہ، ثقافت اور ایک الگ زبان ہے۔ان قبائل کے لئے یہ جنگل ہی سب کچھ ہے جہاں وہ پیدا ہوتے ہیں، زندگی گزارتے ہیں اور یہیں پر اپنی آخری سانس لیتے ہیں۔ان میں بعض قبائل ایسے ہیں جو بالکل ننگے رہتے ہیں۔ان میں سے کچھ قبائل کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ آدم خور ہیں۔ یہاں پایا جانے والا ایک قبیلہ جس کا نام پیراہا ہے تہذیب

سے اتنا نابلد ہے کہ اس کے افراد دو سے زیادہ تک کی گنتی بھی نہیں جانتے۔ ڈاکٹر پیٹر گورڈن نے اس قبیلے پر تحقیق کرتے ہوئے بتایا کہ یہ لوگ اتنے کند ذہن ہیں کہ یہ نہ تو کوئی تصویر بنا سکتے ہیں اور نہ ہی سیدھی لکیر تک کھینچ سکتے ہیں۔ اس قبیلے میں کل دوسو افراد موجود ہیں۔ ان میں بعض قبائل ایسے بھی ہیں جنکے افراد قدوآور اور نیلی آنکھوں والے ہیں۔ ان قبائل میں بعض تو موجودہ دور کی ترقیات سے بالکل ہی ناواقف ہیں بلکہ باہر کے انسانوں سے ملنا بھی پسند نہیں کرتے۔ بہت سے قبائل ایسے ہیں جو ۱۵۰۰ صدی عیسوی کے بعد سے بیرونی دنیا کے رابطے میں آئے ہیں۔ اکثر و بیشتر قبائل مستقل طور پر دریا کے کنارے یا پہاڑی علاقوں میں گاؤں بنا کر رہتے ہیں جبکہ کچھ قبائل ایسے بھی ہیں جو خانہ بدوشی کی زندگی گذارتے ہیں۔ یہ قبائل مچھلی اور جانوروں کے گوشت کے علاوہ سبزی اور پھل بھی اگاتے ہیں۔

۱۶۰۰ صدی عیسوی میں ہسپانوی مشنری نے اس جنگل میں بسنے والے دیگر قبائل سے بالکل مختلف ایک سفید فام قبیلے سے ملاقات کا تذکرہ کیا تھا، ۱۱ جولائی ۱۹۲۵ء کو دی نیو یورک ٹائمس میں چھپنے والی خبر کے مطابق مہم جو ڈاکٹر الیکزینڈر ہملٹن رائس بیک نے بھی اپنی مہم کے دوران ایمیزون کے جنگل میں سفید فام نایاب قبیلے کو دیکھا تھا۔

دنیا کی دیگر اقوام اور ایمیزون کے دیگر قبائل کے درمیان نسلی تعلق تلاش کرنے کے لئے سائنس داں کافی تگ و دو کر رہے ہیں۔ بشریاتی اور جینیاتی شواہد

کی بنیاد پر ماہرین اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ زیادہ تر امریکیوں کا تعلق سائبیریا اور منگولیا سے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ تاریخ کے مختلف ادوار میں تین مختلف طبقات میں امریکہ میں داخل ہوئے تھے، جن میں پہلا طبقہ جس کا تعلق سائبریا سے تھا وہ برازیل میں آبسا تھا۔ جبکہ دوسرا اور تیسرا طبقہ جنوب میں آگے بڑھنے کی بجائے وسطی اور شمالی امریکہ میں ہی قیام پذیر ہو کر رہ گیا تھا۔

امریکہ اور سائبیریا و منگولیا کے درمیان نسلی تعلق کے متعلق مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں : ۲۱ جولائی ۲۰۱۵ کو (Science Daily) پر (Genetic studies link indigenous peoples in the Amaozon and Australasia) کے نام سے شائع ہونے والا مضمون۔

لیکن کوپن ہیگن یونیورسٹی کے سینٹر فار جیو جینیٹکس کی قیادت میں کی جانے والی ڈی این اے تحقیقات کے مطابق سائبیریا سے نقل مکانی تین الگ الگ طبقات میں نہیں بلکہ یکبارگی پیش آئی ہے۔

الغرض اس بات پر تقریباً سبھی محققین متفق ہیں کہ امریکیوں کے آباء و اجداد کا تعلق سائبیریا سے ہے، البتہ یہ لوگ سائبیریا سے کب، کہاں ہوتے ہوئے اور کس طرح آئے اس میں اختلاف ہے۔۔۔۔۔ اس تحقیق میں ایک حیران کن بات یہ بھی ہے کہ جنوبی امریکہ کے کچھ گروہوں کا موجودہ دور کے مقامی امریکیوں کی بنسبت آسٹریلیا، نیوگنی اور جزائر انڈمان کے مقامی لوگوں سے جینیاتی طور پر زیادہ قریبی تعلق ہے۔۔۔ چنانچہ یہ بات سائنس دانوں کے لئے ایک بڑی پہیلی

ہے کہ جینیاتی طور پر اتنا قریبی تعلق رکھنے والے لوگ آخر اتنے مختلف علاقوں میں کیسے پھیلے ہونگے۔

ملاحظہ فرمائیں: ۲۲ جولائی ۲۰۱۵ء کو سائنس جنرل اور نیچر کے حوالہ سے دی گارڈین کی ویب سائٹ پر شائع ہونے والا مضمون۔

https//:www.theguardian.com/science/2015/jul/22/one-wave-of-migration-from-siberia-populated-the-americas-dna-shows

لیکن یہ پہیلی تب سلجھ جاتی ہے جب ہم یہ مان لیں کہ ایمیزون، آسٹریلیا، نیوگنی اور جزائر انڈمان جیسے علاقوں کے علاوہ موجودہ سائبیریا میں آباد یہ لوگ در اصل منطقۂ شمالی میں واقع دریا کے آس پاس بسنے والے وہی لوگ تھے، جنہیں ذوالقرنین نے یکبارگی مختلف جگہوں پر منتقل کردیا تھا۔ جن میں سے کچھ کو تو برازیل میں بسایا (جس کا بڑا حصہ ایمیزون جنگل پر مشتمل ہے) اور دیگر لوگوں کو آسٹریلیا، نیوگنی اور جزائر انڈمان جیسے علاقوں میں آباد کردیا ہوگا۔

موجودہ تحقیقات کے مطابق ایمیزون کے قبائل اور منطقۂ باردہ شمالی میں واقع سائبیریا کے درمیان ربط ہونے کے بعد یہ بات بالکل قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ ایمیزون کا یہ جنگل بھی ذوالقرنین نے ہی اسی طرح بسایا ہوگا جس طرح کہ کانگو کا برساتی جنگل انٹارکٹکا کی سیاہ فام قوم کے لئے بسایا تھا۔

الغرض ایمیزون اور کانگو کے جنگل اور ان کے آس پاس منطقۂ قطب شمالی اور قطب جنوبی کی قوموں کا وجود اور ان دونوں منطقوں کا آبادی سے خالی ہوکر

برف سے ڈھنکا ہونا قرآنی آیات کی اس تشریح کی صداقت کے لئے کافی ہے کہ ذوالقرنین نے جس ''یسر'' کا وعدہ کیا تھا وہ یہی برساتی جنگل ہیں۔ اسی طرح جس خطرے کے پیش نظر ان قوموں کو وہاں سے ہٹایا گیا تھا اسے برف کی چادروں کے ذریعہ روک دینے والا بھی ذوالقرنین ہی ہے۔

لیکن کیا ہمارے پاس ایسے مزید کچھ شواہد و دلائل ہیں جن کی بنیاد پر ہم یہ بات حتمی طور پر کہہ سکیں کہ جس طرح مقناطیسی میدان اور سدین کا معمار ذوالقرنین ہے اسی طرح برساتی جنگلوں کا معمار بھی ذوالقرنین ہے۔

ایمیزون جنگل: قدرتی عجوبہ یا انسانی شاہکار

بیسویں صدی کے اختتام تک ایمیزون کے متعلق یہی سمجھا جاتا رہا کہ یہ جنگل لاکھوں کروڑوں سال سے اسی طرح آباد چلا آرہا ہے اور پندرہویں صدی عیسوی تک ہسپانوی اور پرتگالیوں کی آمد سے پہلے تک اس جنگل میں کوئی بھی منظم اور مہذب معاشرہ موجود نہیں تھا بلکہ یہاں پچھلے ہزاروں سال سے آدی باسی اور جنگلی انسان ہی بستے چلے آئے ہیں؛ لیکن جنگلوں کی کٹائی، ہوائی سفر، سیٹیلائٹ تصاویر اور لیڈار ٹکنالیوجی کی آمد کے بعد منظم قدیم انسانی آبادیوں پر دلالت کرنے والے ایسے بہت سارے کھنڈرات اور آثار قدیمہ دریافت ہوئے جس نے اس تصور کو غلط ثابت کر دیا کہ زمانۂ قدیم میں یہاں کسی منظم معاشرہ کا وجود نہیں تھا۔

لیڈار ٹکنالوجی

لیزر امیجنگ ٹکنالوجی پر مبنی لیڈار سسٹم کے ذریعہ بڑے بڑے علاقوں کو فوری اسکین

کیا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ اس تکنک کی مدد سے گنجان پیڑ پودوں کے نیچے پوشیدہ انسانی آثار و باقیات کو بھی معلوم کیا جاسکتا ہے۔اس تکنک کا استعمال کرتے ہوئے ماہرین آثار قدیمہ نے تقریبا ۸۱ ایسی آبادیاں کھوج نکالی ہیں جن میں ۷۲ فٹ بلند مخروطی شکل کے اہرام اور وسیع و عریض اسٹیج کے ٹیلے بھی تھے،اس کے علاوہ ایسے شواہد بھی ملے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ آبادیاں آپس میں سڑکوں سے جڑی ہوئی تھیں اور جہاں نہروں کے علاوہ آبی ذخائر اور پانی کا وسیع انتظام بھی موجود تھا۔

جیوگلیف

ہوائی سفر اور سیٹیلائٹ تصویر سازی کے بعد ایمیزون جنگل میں بولیویا اور برازیل کی سرحد پر کچھ مخصوص قسم کے گڑھے دریافت ہوئے ہیں، ان میں سے بعض مربع ،مستطیل یا گول ہیں، جبکہ دوسرے پیچیدہ ہندسی اعداد و شمار تشکیل دیتے ہیں۔ یہ سب گڑھے سڑکوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ جغرافیہ میں انہیں جیوگلیفس کہا جاتا ہے۔

۱۳ ہزار مربع کلومیٹر پر پھیلے ہوئے جیوگلیفس کا قطر سو سے تین سو میٹر تک کا ہے۔ سب سے چھوٹے کا قطر ۳۰ میٹر ہے۔ان کی گہرائی ایک سے دو میٹر ہے۔اب تک دوسو کے قریب جیوگلیفس دریافت ہو چکے ہیں اور مزید سینکڑوں کی تعداد میں دریافت ہونے کا امکان ہے۔ان جیوگلیفس کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ سب سطح مرتفع پر واقع ہیں۔

ان گڑھوں کی کھدائی کا صحیح زمانہ، اوران کا مقصد کیا تھا اسے ابھی تک سمجھا نہیں جا سکا ہے، کچھ مقامات پر کھدائی میں سیرامکس، پیسنے والے پتھر اور انسانی رہائش کے دیگر نشانات برآمد ہوئے ہیں۔ عام طور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کو دفاعی غرض سے بنایا گیا تھا۔

جیوگلیفس اور لیڈار ٹکنک کی مدد سے حاصل کی گئی تصاویر کے نتیجہ میں ظاہر ہونے والے آثار قدیمہ کی بنیاد پر کئی ماہرین کا اندازہ ہے کہ ایمیزون بیسن کے جنوبی کنارے پر دس سے پچاس لاکھ لوگ کسی شہر کی طرح منظم شکل میں مستقل طور پر آباد تھے۔

لیکن کیا واقعتاً یہ آثار قدیمہ ایمیزون کے جنگل میں شہریت کے حامل منظم اور مستقل طور پر آباد کسی معاشرے پر دلالت کر رہے ہیں جیسا کہ ماہرین ارضیات کا خیال ہے یا پھر کہانی کچھ اور ہے؟

آثار قدیمہ کی دریافت کے بعد یہاں دوسرا ایک سوال ایمیزون جنگل کی قدامت کے متعلق بھی پیدا ہو گیا ہے کہ کیا واقعتاً ایمیزون کروڑوں سال پرانا ہے جیسا کہ ارتقائی نقطۂ نظر رکھنے والے لوگوں کا خیال ہے یا پھر اس کی ابتدا مذکورہ بالا آثار کے تعمیر کے بعد کی ہے؟

حالیہ تحقیقات کے نتیجہ میں بہت سارے ایسے شواہد وحقائق کھل کر سامنے آئے ہیں جن کی بنیاد پر بہت سے سائنس دانوں کا یہ خیال ہے کہ ایمیزون کا یہ جنگل قدرتی طور پر وجود میں نہیں آیا بلکہ اسے انسانوں نے اپنی سمجھ بوجھ کا استعمال

کرتے ہوئے اگایا ہے۔

پھل اور سبزی جیسی غذائی اشیاء کی فراوانی، شرح پیداوار، کسی عام خوفناک جنگل کے بالمقابل انسانوں کی بود و باش کے قابل ہونا اور اس جیسی باتیں بذات خود اس بات کے دلائل ہیں کہ یہ جنگل کسی منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے۔ مذکورہ بالا خصوصیات تبھی پیدا ہو سکتی ہیں جبکہ اس جنگل کی آب و ہوا اور زمین میں بھی کسی خاص قسم کی صلاحتیں موجود ہوں چنانچہ اس جنگل کی مخصوص آب و ہوا کے علاوہ ایک بات جو ایمیزون جنگل کو دنیا کے دوسرے جنگلوں سے ممتاز کرتے ہوئے انسان کے ہاتھوں جنگل کی منصوبہ بندی پر دلالت کرتی ہے، وہ ہے اس کی زمین میں موجود ''نامیاتی کھاد''۔

Terra Preta نامیاتی کھاد

امیزون جنگل میں واقع برازیل، ایکواڈور اور پیرو کا ایک بہت بڑا علاقہ زمین پر سب سے زیادہ زرخیز مٹی کا حامل علاقہ ہے، جسے (Amazonian Dark Earth) بھی کہا جاتا ہے۔

مختلف سروے کے ذریعہ ٹیرا پریٹا والی مٹی کی تہہ کی گہرائی تقریباً ۲۵ انچ تک ناپی گئی ہے۔ ابھی تک اس بات کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکا ہے کہ ایمیزون جنگل کا کتنا علاقہ اس قسم کی مٹی کا حامل ہے؛ لیکن ایک اندازے کے مطابق اس جنگل کے دس فیصد یا اس سے بھی زیادہ علاقہ میں اس قسم کی مٹی ہونے کا امکان ہے۔

سالوں پر محیط سائنسی تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ کسی بھی قسم کے معدنیات پر مشتمل کھاد کے بغیر اس قسم کی مٹی سینکڑوں سالوں تک اپنی غذائیت اور زرخیزی کو برقرار رکھ سکتی ہے۔

نباتات کی افزائش کے لئے آس پاس کی مٹی کے بالمقابل اس قسم کی مٹی میں تین گنا زیادہ فاسفورس اور نو گنا زیادہ نائٹروجن ہوتا ہے۔ بایو چار کی بلند سطح کے علاوہ ٹیرا پریٹا میں اعلی نامیاتی سی، این، سی اے اور پی، اعلی کیشن تبادلہ کی صلاحیت اور اردگرد کی مٹی سے زیادہ پی ایچ کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

الغرض ٹیرا پریٹا معلوم مٹی کی اقسام میں سے کسی کے ساتھ بھی مطابقت نہیں رکھتی اور نہ ہی ہزاروں سال پر محیط اس علاقہ کی آب و ہوا کے حالات کے ساتھ منطبق ہوتی نظر آتی ہے۔

اب کیمسٹری کے اصول کے مطابق نظریاتی طور پر مٹی میں اس قسم کی صلاحیت خود بخود پیدا ہوجانا ناممکن ہے؛ کیونکہ ہر قدرتی مٹی کی ایک مخصوص حد ہوتی ہے جس کے مطابق وہ غذائیت کے ذخیرے کے طور پر کام کرتی ہے۔

۔۔۔۔تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ٹیرا پریٹا والی زرخیز مٹی کی منصوبہ بندی جنوبی امریکہ میں رہنے والی قدیم قوم نے کی ہے؟

بظاہر یہی جواب درست ہے؛ لیکن اگر یہ بات صحیح سمجھی جائے تو بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قدیم زمانہ کی قوم کو ٹیرا فارمنگ کی یہ عجیب و غریب ٹکنالوجی کس نے سکھائی؟ جبکہ بایو چار پر مبنی زراعت کے نظریہ سے دور جدید کے لوگ فی

الحال ہی واقف ہوئے ہیں اور اس میں بھی ابھی تک صحیح معنی میں سائنس دانوں کو کامیابی میسر نہیں آئی ہے۔

الغرض اس سوال کا تسلی بخش جواب تلاش کرنے میں سائنس داں ابھی تک سرگرداں ہیں کہ ایمیزون کی مٹی میں یہ حیرت انگیز خصوصیت کس طرح پیدا ہوئی ہے۔

ہاں اس سوال کا واحد حل ہے ذوالقرنین۔۔۔۔۔ہاں ذوالقرنین نے ہی یہ جنگل منطقۂ شمالی میں کسی بڑے خطرے کا سامنا کر رہی مؤمن وصالح قوم سے اپنی طاقت و اختیار کے مطابق ''یسر'' کا وعدہ کرنے کے بعد بنایا تھا، چنانچہ ایمیزون کا یہ سدا بہار جنگل جہاں ''من امرنا یسرا'' کی بہترین تعبیر پیش کر رہا ہے وہیں اس جنگل اور اس کے آس پاس بسنے والی قوموں کا منطقۂ شمالی کی قوموں سے نسلی تعلق کا انکشاف اس دعوے کو مزید پختہ بنا دیتا ہے۔

بہت ممکن ہے کہ ایمیزون کے برساتی جنگل کی مٹی کو زرخیز بنانے کے علاوہ ذوالقرنین نے دیگر عوامل بھی متحرک کئے ہوں، مثلاً ۴ جنوری ۲۰۲۱ء کو نیچر ڈاٹ کام پر شائع ایک مضمون کے مطابق بعض محققین کا خیال ہے کہ ایمیزون کے جنگل کو غذائیت فراہم کرنے میں ہزاروں کلومیٹر دور واقع افریقہ کے صحرا سے اٹھ کر آنے والی دھول کا اہم کردار ہے۔۔۔۔ناسا سیٹیلائٹ کے جمع کردہ اعداد وشمار اور تصاویر کے مطالعہ سے پتہ چلا ہے کہ جب صحارا میں آندھیاں چلتی ہیں تو لاکھوں ٹن مٹی اور ریت کے ذرات اڑ کر ایمیزون کے جنگل کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں ،

یہ مٹی کئی ٹن فاسفورس پر مشتمل ہوتی ہے جس کی وجہ سے ایمیزون کے جنگل کی مٹی زرخیز بن جاتی ہے۔۔۔۔۔افادیت، نفع اندوزی اور امداد باہمی کے قوانین کے تحت بنائی گئی خدا کی یہ دنیا ایسے حیران کن انتظامات سے بھری پڑی ہے۔۔۔۔۔ اور بہت ممکن ہے کہ ایمیزون اور صحارا کے بیچ اس طرح کا انتظام کرنے والا وہی ذوالقرنین ہو جس کے حیران کن کارناموں کی گواہی کے لئے مقناطیسی میدان اور برفانی سدین کی تعمیر کافی ہے۔

بین السدین رہنے والی قوم کون تھی؟

بین السدین قوم کا تعارف کرواتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا:

وَجَدَ مِنْ دُونِهِمَا قَوْمًا لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا ﴿۹۳﴾

مفسرین نے اس جملہ کا ترجمہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ذوالقرنین ایسی قوم سے ملے جو کسی بات کو سمجھ نہیں پاتی تھی۔یعنی وہ نہایت پسماندہ تھی اور بغیر ترجمان کے ان سے بات کرنا دشوار ہو رہا تھا۔

آیت کا سیاق و سباق بتلاتا ہے کہ یہاں ہم کلامی میں دشواری کا تذکرہ نہیں کیا جا رہا بلکہ ''قولاً'' سے کوئی اور بات بتلائی جا رہی ہے۔

قال یقول قولا: کا لغوی معنیٰ ''بولنا اور کہنا'' تو ہے ہی لیکن قرآن میں جا بجا یہ لفظ ''فیصلہ، معاملہ اور روش'' کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔مثلاً

فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ

رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَظْلِمُونَ ﴿۱۶۲ الأعراف﴾

یعنی انہیں جس روش کا حکم دیا گیا تھا اسے بدل دیا۔

وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۚ إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ﴿۲۳ الإسراء﴾

یعنی ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔

فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ ﴿۴۴ طه﴾

یعنی اس کے ساتھ نرم طبیعی سے پیش آؤ۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ﴿۷۰ الأحزاب﴾

یعنی اپنے اعمال میں راست روی اختیار کرو۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ''قول'' کا لفظ مخصوص قوانین کے تحت چلنے والے نظام کائنات کی اس مخصوص روش پر بھی اطلاق کیا ہے جس کے تحت ہر فعل و عمل کا ایک مخصوص انجام ہوتا ہے۔ مثلاً : وَإِذَا أَرَدْنَا أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا ﴿۱۶ الإسراء﴾

إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَن نَّقُولَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴿۴۰ النحل﴾

قَالَ رَبِّي يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۖ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۴ الأنبياء﴾

لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُم بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ ﴿۲۷ الأنبياء﴾

وَأَهْلَكَ إِلَّا مَن سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۖ وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ

إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ ﴿۲۷ المؤمنون﴾

أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ أَمْ جَاءَهُم مَّا لَمْ يَأْتِ آبَاءَهُمُ الْأَوَّلِينَ ﴿۶۸ المؤمنون﴾

وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ ﴿۸۲ النمل﴾

وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِم بِمَا ظَلَمُوا فَهُمْ لَا يَنطِقُونَ ﴿۸۵ النمل﴾

..... وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿۱۵۲ الأنعام﴾

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۵۱ القصص﴾

قَالَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَغْوَيْنَا أَغْوَيْنَاهُمْ كَمَا غَوَيْنَا تَبَرَّأْنَا إِلَيْكَ مَا كَانُوا إِيَّانَا يَعْبُدُونَ ﴿۶۳ القصص﴾

وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا وَلَٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿۱۳ السجدة﴾

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلَىٰ أَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۷ یس﴾

فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَا إِنَّا لَذَائِقُونَ ﴿۳۱ الصافات﴾

مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ﴿۲۹ ق﴾

یعنی کائنات کی ایک متعینہ روش ہے، اللہ عز وجل نے یہ کائنات ایک مخصوص طریقہ پر گامزن کی ہے، جس کے مطابق ہر فعل وعمل کا ایک مخصوص انجام ہے حتی کہ خالق کائنات خود اس کے انجام میں مداخلت نہیں کرتا۔ فکر وعمل اور ان

کے نتائج میں موجود حتمیت کو ہی ''لا مبدل لکلماتہ'' اور لا تبدیل لکلمات اللہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

کائنات کے اس طرز عمل کو موقع کی مناسبت سے کبھی قول، کبھی کلمات تو کبھی آیات سے تعبیر کیا گیا ہے۔

الغرض دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا مخصوص نتیجہ اور متعین انجام ہے۔ کائنات کی یہ ترتیب جہاں ایک بے پناہ قدرت کے حامل خالق کے وجود پر ایمان لانے کے لئے مجبور کرتی ہے وہیں افادیت، نفع اندوزی اور امداد باہمی کے تحت چلنے والا اس کا یہ نظام انسان کو اپنی ذمہداری اور اس کے متعلق پرسش کا احساس بھی دلاتا ہے۔

حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِن دُونِهِمَا قَوْمًا لَّا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا ﴿۹۳﴾

حتی کہ جب وہ دونوں بندشوں کے درمیان والی جگہ پہونچا تو اسے اگلی دونوں قوموں سے مختلف ایک ایسی قوم ملی جو ایسی نہیں تھی کہ کائنات کی روش کو سمجھ سکے۔

''لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا'': قریب نہیں ہوتے تھے کہ وہ کسی بھی (کائناتی) روش کو سمجھے۔

یعنی ذوالقرنین کی ملاقات ایک ایسی قوم سے ہوئی تھی جو اتنی سادہ لوح اور کم ذہن تھی کہ توحید رب اور حساب فی الآخرۃ پر دلالت کرنے والی آفاق وانفس کی کوئی بھی نشانی ان کو مقصد حیات سمجھنے کے لئے آمدہ نہیں کرتی تھی۔ حتی کہ ہر

طرف مبنی بر رحمت نظام ربوبیت سے گھرے ماحول میں بشکل عذاب وارد ہونے والے یاجوج وماجوج کی نشانی بھی انہیں کسی عبرت کے لئے نہیں ابھارتی تھی۔

ایک سوال

یہاں ایک نہایت ہی اہم سوال یہ ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ پہلی دونوں قوموں کے متعلق تو فرمایا کہ جو ظالم ہیں انہیں اخروی عذاب بھی بھگتنا ہوگا اور بھی ہم انہیں سزا دینگے اور جو مؤمن وصالح ہیں انہیں آخرت میں تو بدلہ ملیگا ہی لیکن ہم بھی ان کے ساتھ آسانی کا معاملہ کرینگے۔لیکن بین السدین رہنے والی قوم کے متعلق نہ اللہ تعالیٰ نے کوئی انذار وتبشیر والی بات کہی اور نہ ہی ذوالقرنین نے کسی جزاوسزا کا اعلان کیا بلکہ ان کی درخواست پر سد کے بجائے ردم بنادی، اور ردم بھی ایسی کہ قیامت تک اسے کچھ بھی نہ ہو! حالانکہ مؤمن نہ ہونے کا تقاضہ تو یہ تھا کہ انہیں کسی عذاب میں مبتلا کردیا جاتا تو پھر ذوالقرنین نے ان کا مطالبہ پورا کرتے ہوئے ردم کی تعمیر کا اتنا بڑا کارنامہ انجام دیکر ان کی خدمت کیوں کی، حتی کہ ''ردم'' کی تعمیر کے بعد اسے ایک رحمت بھی کہا جارہا ہے۔آخر ایسا کیوں؟

دراصل بین السدین رہنے والی یہ قوم اپنی سادہ لوحی اور کم عقلی کی بنا پر مرفوع القلم یا غیر مکلف کے درجہ میں تھی، یہی بات ''وَجَدَ مِنْ دُونِهِمَا قَوْمًا لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا ﴿۹۳﴾'' کے ذریعہ معلوم ہورہی ہے۔

''مِنْ دُون'' کی لغوی تحقیق کے دوران ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ لفظ اختلاف اور تفاوت کو ظاہر کرتا ہے۔یعنی کائناتی روش کو سمجھنے کے معاملہ میں بین

السدین رہنے والی قوم کی عقلی سطح پہلی دونوں قوموں کے مقابلہ کم تھی، چنانچہ پہلی دونوں قومیں تو معیاری عقل کی حامل ہونے کی وجہ سے مکلف تھیں لیکن یہ قوم غیر مکلف تھی۔ اسی لئے پہلی دونوں قوموں کے متعلق جزاوسزا کا تذکرہ تو کیا گیا لیکن یہ قوم مؤمن نہ ہونے کے باوجود سزا کا ذکر تو دوران کی درخواست پر سد کے بجائے پائیدار ردم بنا کر اسے ''رحمۃ من ربی'' سے بھی تعبیر کیا گیا۔

اس باب میں مزید تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے کہ توحید رب کے اقرار اور حساب فی الآخرۃ کی ذمہداری کے احساس کے لئے صرف آفاق و انفس کی نشانیاں کافی ہیں یا نبوت ورسالت بھی ضروری ہے۔ کس قسم کی سادہ لوحی اور کم عقلی پابندی شرع کو ساقط کر دیتی ہے۔ کونسی باتیں جہنم میں لے جانے والی ہیں، جنت کے حقدار ہونے کے لئے کیا شرائط ہیں اور اعراف کی حقیقت کیا ہے۔۔۔۔۔۔ ان شاء اللہ ''اصحاب کہف'' پر لکھی گئی ''زور دلیل'' نامی کتاب میں ان سوالات پر گفتگو کرنے کی کوشش کی جائیگی۔

وہ ناسمجھ قوم آج کہاں ہے؟

اس سوال کا جواب تو ''بین السدین'' کے لفظ سے ہی واضح ہو چکا ہے کہ یہ قوم جنوبی امریکہ میں واقع برازیل جیسے کسی ملک میں ہی رہتی ہوگی۔ اب برازیل کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ اس کا ایک بڑا حصہ ایمیزون جنگل پر مشتمل ہے اور ہم پچھلے صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ ایمیزون اور اس جیسے برساتی جنگل ذوالقرنین کے وہ کارنامے ہیں جو انہوں نے شمالی اور جنوبی منطقوں کے لوگوں کے لئے تعمیر

کئے تھے۔۔۔۔۔۔تو کیا یہ ناسمجھ قوم بھی منطقۂ شمالی کی قوم کے ساتھ ہی ایمیزون کے جنگل یا اس کے آس پاس ہی رہتی ہے؟

بین السدین قوم نے ذوالقرنین سے یاجوج و ماجوج کی شکایت کرتے ہوئے جس چیز کو افساد فی الارض سے تعبیر کیا تھا اسے اگر اسے ''خرجا'' کے لفظ کے ساتھ جوڑ کر دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یاجوج و ماجوج کے فساد فی الارض سے مراد کاشت کا بگاڑ اور فصلوں کی تباہی تھا۔یعنی اس قوم کا کہنا یہ تھا کہ اگر سد وغیرہ کے ذریعہ کسی طرح یاجوج و ماجوج کو روک دیا جاتا ہے تو فصلیں تباہ ہونے سے بچ جائیگی اور پیداوار ٹھیک سے ہو پائینگی، اگر ایسا ہوجاتا ہے تو ہم آپ کو پیداوار کا ایک حصہ مستقل طور پر دینے کو تیار ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔گویا وہ قوم اس وقت کاشت تو کیا کرتی تھی لیکن یاجوج و ماجوج کے ذریعہ پیدا ہونے والی تیز حرارت کی وجہ سے کامیابی کے ساتھ فصلیں نہیں اگا پاتے تھے۔اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ اس وقت ایمیزون کے اس قدر عظیم الشان جنگل کا وجود بھی نہیں تھا۔

اب جب منطقۂ شمالی کی قوم کے لئے ایمیزون جیسے جنگل آباد کئے گئے تو وہاں پہلے سے آباد ''ناسمجھ قوم'' کو بھی اس سے فائدہ ہونے لگا۔۔۔۔۔لہٰذا منطقۂ شمالی کی قوموں کے ساتھ مگر کسی فاصلہ پر یہ ناسمجھ قوم بھی ایمیزون کے جنگل میں ہی رہتی ہے۔۔۔مزید تحقیقات کے ذریعہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ایمیزون کے جنگل میں رہنے والی قوموں میں کس کا تعلق ''ناسمجھ'' قوم سے ہے اور کس کا منطقۂ شمالی سے۔

موجودہ وقت میں جنوبی امریکہ کے نو ممالک تک پھیلے ہوئے ایمیزون جنگل میں تقریباً تین کروڑ لوگ آباد ہیں، ان میں سے قریباً ۹ فی صد یعنی ۴۵ لاکھ وہ قبائلی ہیں جو ہزاروں سال سے اس جنگل میں رہتے چلے آئے ہیں۔ یہ لوگ چار سو سے پانچ سو قبائل میں بنٹے ہوئے ہیں، ان میں سے ۵۰ سے ۸۰ کے قریب ایسے قبائل ہیں جو باہری انسانوں سے ملنا جلنا بالکل بھی پسند نہیں کرتے، ان میں سے کوئی بھی ایمیزون کا جنگل چھوڑ کر باہر جانا پسند نہیں کرتا، دنیا کی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو قریباً ہر تہذیب سے وابستہ بڑی سے بڑی آبادیاں نقل مکانی پر مجبور ہوئیں لیکن یہ قوم ہزاروں سال سے یہاں ویسی کی ویسی آباد ہے، بہت ممکن ہے کہ ان قبائل کا تعلق اسی ناسمجھ قوم سے ہو جو یاجوج و ماجوج کی طرف سے ہونے والے خطرناک نقصان کے باجود وہ اپنے علاقہ کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھی۔

ان قبائلیوں کے علاوہ یہاں سیاہ فام لوگوں کی بھی ایک بڑی تعداد نیز دیگر

نسل کے لوگ بھی یہاں آباد ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان میں کون کب اور کہاں سے آیا ہے۔

یاجوج وماجوج کا خروج

اب ہمارے سامنے تین اہم سوالات ہیں۔ یاجوج وماجوج کہاں سے نکلینگے، کب نکلینگے اوران کے نکلنے پر کیا ہوگا؟

یاجوج وماجوج کا خروج کہاں سے ہوگا؟

قَالَ هَٰذَا رَحْمَةٌ مِّن رَّبِّي ۖ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَّاءَ ۖ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّي حَقًّا ﴿۹۸﴾

اس نے کہا کہ یہ میرے پروردگار کی طرف سے ایک رحمت ہے، لیکن جب میرے رب کا وعدہ آنے کو ہوگا تو اسے پیوند خاک بنا دے گا اور میرے رب کا وعدہ ثابت ہوکر رہیگا۔

یعنی ذوالقرنین نے اپنی خداداد قدرت کے بل پر بنائی ردم کی افادیت اور پائداری کے متعلق امید ظاہر کرتے ہوئے فرمایا کہ اسے قیامت تک کچھ بھی نہیں ہوگا، ہاں جب قیامت بالکل قریب ہوجائیگی تو اللہ تعالیٰ اسے تہس نہس فرمادینگے۔

﴿۹۸﴾ وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ ۖ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا ﴿۹۹﴾ وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكَافِرِينَ عَرْضًا ﴿۱۰۰﴾ الَّذِينَ كَانَتْ أَعْيُنُهُمْ فِي غِطَاءٍ عَن ذِكْرِي وَكَانُوا لَا يَسْتَطِيعُونَ سَمْعًا ﴿۱۰۱﴾ ﴿الکھف﴾

عام طور پر مفسرین نے ''ھم'' ضمیر کا مرجع لوگوں کو مان کر اس آیت کا مصداق میدان محشر کو قرار دیتے ہوئے کچھ اس طرح ترجمہ کیا ہے:

اور اس دن ہم لوگوں کو چھوڑ دینگے کہ وہ (سمندر کی موجوں کی طرح) ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوں اور صور پھونکا جائیگا اور ہم سب انسانوں کو ایک ساتھ جمع کرینگے۔ وہ دن ہوگا جب ہم کافروں کے سامنے جہنم کو لائینگے۔۔۔۔

لیکن ''ھم''، ضمیر کا مرجع انسان نہیں بلکہ یاجوج و ماجوج ہیں، اور یہاں میدان حشر کی منظر کشی نہیں بلکہ ردم میں یاجوج و ماجوج کی حالت محصوری اور مابعد صور انکی کیفیت ورود کا بیان ہے۔

ترجمہ کچھ اس طرح ہوگا:

اور اس کے بعد ہم نے یاجوج و ماجوج کو اپنے اپنے اندر موجزن چھوڑ دیا اور (حتیٰ کہ) جب صور پھونکا جائیگا تو ہم انہیں بالکل اکٹھا کر دینگے۔ اور اس وقت (یعنی یاجوج و ماجوج کے زمین پر آتے ہی ان سے ہونے والی خطرناک تباہی کے ذریعہ) ہم ان کافروں کے سامنے واضح انداز میں جہنم کی نمائش کرینگے جن کی نگاہیں ہماری نشانی سے پردہ میں تھیں اور وہ کوئی بات سن نہیں سکتے تھے۔

یَمُوجُ: موج کا معنی ہے لہر۔ جوش اور حرکت و طاقت کا معنی اس کی طبیعت میں شامل ہے، اسی لیے کہا جاتا ہے۔ ماج البحر: سمندر کا موجزن ہونا، تلاطم خیز ہونا ۔ ماج القوم: لوگوں کا جوش میں آنا، معاملات کا مضطرب اور دیگرگوں ہونا۔ ماج الفتنۃ: فتنے کا زوروں پر ہونا۔ موجۃ الحر: گرمی کی لہر (شدت)۔ موجۃ الشباب:

جوانی کا جوش۔

یعنی آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ یاجوج و ماجوج مقناطیسی میدان میں پھنس جانے کے بعد اپنے اپنے ہم جنس افراد میں متلاطم ہیں لیکن وہ اکٹھے ہوکر اپنے اصل روپ میں نہیں آسکتے۔ہاں جب صور پھونکا جائیگا تو ردم کے ٹوٹ جانے کے نتیجہ میں جیسے ہی مقناطیسی میدان ختم ہوگا ویسے ہی یاجوج و ماجوج زمین پر آکر اکٹھے ہوجائینگے (فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا)اور اس کے بعد وہ تباہی رونما ہوگی کہ کافر اسے دیکھ کر سمجھ جائیگا کہ جہنم کا حال کیا ہوگا۔

ماج یموج سے یاجوج و ماجوج کو متصف کرنا اور تابکار حلقہ میں موجود باردار ذرات کا لہروں کی صورت انتہائی تیز رفتاری اور جوش کے ساتھ متحرک رہنا، اچھلتے رہنا اور اسپرنگ کی شکل میں گردش کرنا پھر اس بات کو مؤکد کرتا ہے کہ یہی ذرات یاجوج و ماجوج کی بدلی شکلیں ہیں۔

چنانچہ یہی بات سورۂ انبیاء میں اس طرح بیان کی گئی ہے۔

حَتَّىٰ إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُونَ ﴿٩٦﴾ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا يَاوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِي غَفْلَةٍ مِنْ هَٰذَا بَلْ كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿٩٧﴾ ﴿الأنبياء﴾

ترجمہ: یہاں تک کہ جب یاجوج و ماجوج کھول دئے جائینگے، حال یہ ہوگا کہ وہ رونما ہونے والی ہر بلند جگہ سے اکٹھا ہوکر (یا اپنی اصل حالت میں لوٹ کر) نکلتے چلے آئینگے۔اور اس طرح سچے وعدے کا وقت قریب ہو چکا۔تو کافروں کی نگاہیں

چکا چوند ہو جائینگی، (کہنے لگینگے) ہائے افسوس بلا شبہ ہم تو اس بات سے غفلت میں ہی تھے بلکہ ہم ظالم تھے۔

سبھی اہل معاجم و تفاسیر نے ''وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُونَ'' کا ترجمہ تقریباً ایک جیسا اور کچھ اس طرح کیا ہے۔ ''اور وہ ہر اونچی جگہ سے تیزی سے چلے آئینگے۔

وفی حدیث یأجُوجَ مأجوجَ: وهم مِن كل حَدَب يَنْسِلُون؛ يريد: يَظْهَرُون من غَلِيظِ الأَرض ومُرْتَفِعها.

وقال الفرَّاءُ: مِنْ كُلّ حَدَبٍ يَنْسِلُونَ، مِنْ كُلِّ أَكَمَةٍ، ومن كل مَوْضِع مُرْتَفِعٍ، والجَمْعُ أَحْدابٌ وحِدابٌ. لسان العرب

حدب کیا ہے ؟

الحَدَبُ ما ارتفع من الأرض۔ مختار الصحاح

حَدَبُ الظَّهْرِ :- : خُروجُ نُتوءٍ فيهِ.حَدَبُ الماءِ :-: ما ارْتَفَعَ مِنْ مَوْجِهِ.ما ارْتَفَعَ وَغَلُظَ مِنَ الأَرْضِ. الغنی

''حدب'' کے معنی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کی اونچی جگہ یا ٹیلہ کو حدب نہیں کہا جا سکتا بلکہ ''حدب'' کسی ایسی ابھری ہوئی جگہ، ٹیلہ یا بلند علاقہ پر بولا جائیگا جو پہلے ظاہر اور نمایاں نہ ہو بلکہ بعد میں نمایاں ہوا ہو۔ چنانچہ مجازاً ریت سے بنا ٹیلہ، پانی کی موج اور کبڑے شخص کو بھی حدب اور احدب کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہ چیزیں بھی بالطبع ابھری ہوئی یا بلند نہیں ہوتیں بلکہ بعد میں اس طرح بنتی

ہیں یا ہو جاتی ہیں۔

اب وہ نمایاں ہونے والی جگہ کونسی ہے جو سطح زمین پر پہلے ظاہر نہیں تھی؟

سائنسدانوں کی تحقیق کے مطابق منطقۂ باردہ شمالی و جنوبی کے ہر دو علاقے کروڑوں ٹن وزنی برف کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ ان دونوں علاقوں کی برف مسلسل ٹوٹ پھوٹ کر پگھلتی جارہی ہے۔ جیسے جیسے برف کی یہ موٹی چٹانیں ختم ہوتی جائینگی تو اس کے نیچے سے دبے ہوئے علاقے کئی فٹ تک بلند ہوتے جائینگے۔ بالآخر ایک وقت ایسا آنے والا ہے جب یہ برف مکمل طور پر ختم ہو جائیگی اور انٹارکٹکا اور گرین لینڈ سمیت وہ بہت سے جزائر بھی نمایاں اور بلند ہو جائینگے جو منطقۂ شمالی میں واقع ہیں۔ یہی وہ بلند یا رونما ہونے والے اونچے زمینی علاقے ہیں جنہیں قرآن نے ''حدب'' سے تعبیر کیا ہے۔

دوسری جانب ہم یہ بات جانتے ہیں کہ خط استواء کے آس پاس موجود مقناطیسی میدان کے خطوط یاجوج و ماجوج کو وہاں ٹھہر کر اپنی اصل حالت میں لوٹنے کا موقع نہیں دیتے اور جو وہاں سے بچ نکلتے ہیں وہ قطبین کے اس علاقوں میں پھنس جاتے ہیں جہاں شمالی اور جنوبی روشنیاں (Aurora lights) نظر آتی ہیں۔ چنانچہ قیامت سے پہلے ایک وقت وہ آئیگا جب مقناطیسی میدان کے خطوط کی یہ بندش ختم ہو جائیگی اور یاجوج و ماجوج اس قید سے آزاد ہو کر سب سے پہلے منطقۂ شمالی و جنوبی میں برف پگھلنے پر رونما ہونی والی زمین پر وارد ہونگے، یہاں وہ اپنا اصلی روپ دھار کر پوری زمین پر پھیل جائینگے۔

''وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُونَ ﴿۹۶﴾''

نسل، ینسل، نسولا (ن): کسی چیز کا دوسری چیز سے جدا ہونا۔ نسل ریش الطائر : پرندے کے پر جھڑنا۔ نسل الصوف : جانور کا اون جدا ہونا۔ نسل الماشی: پیدل چلنے والے کا تیز رفتار ہونا۔

نسل، ینسل، نسلا (ض)۔'' نسل فلان کسی کی نسل بڑھنا۔نسل بولد: بچہ جننا، بچے کا باپ بننا۔ نسل الحیوان نسلاً : جانور کی نسل بڑھا کر اس سے فائدہ اٹھانا۔انسل الشیٔ : بہت نسل والا ہونا۔تناسل القوم : نسل بڑھنا ،لوگوں کا باہم نسل پیدا کرنا، ایک دوسرے سے ملکر نسل پیدا ہونا۔

تقریباً سبھی مفسرین ومترجمین نے ''یَنْسِلُونَ'' کا معنی تیز رفتاری کا کیا ہے۔ تیزی کا مفہوم اس کے معنی میں لازمی جز کی حیثیت رکھتا ہے؛ لیکن یہ اس کا موضوع لہ معنی نہیں ہے۔ ''نسل'' کا موضوع لہ معنی ہے ''مناسب ماحول ملنے پر کسی بے جان یا مردہ چیز میں زندگی آجانا''۔ مثلاً مرد عورت یا جانوروں کے آپسی تعلق کے نتیجہ میں پے در پے بچوں کی پیدائش ہونا۔ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِن سُلَالَةٍ مِّن مَّاءٍ مَّهِينٍ ﴿۸ السجدۃ﴾

سورۂ یس کی آیت وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُم مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنسِلُونَ ﴿۵۱ یس﴾ میں وارد ''یَنْسِلُونَ'' کی وضاحت سورۂ معارج کی آیت يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا كَأَنَّهُمْ إِلَىٰ نُصُبٍ يُوفِضُونَ ﴿۴۳ المعارج﴾ اور سورۂ ق کی آیت يَوْمَ تَشَقَّقُ الْأَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا

ذَٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيرٌ ﴿۴۴ ق﴾ کے ذریعہ ہورہی ہے کہ انسان روز محشر زمین سے تیزی سے نکلتے ہوئے اپنے رب کی طرف دوڑے چلے آئینگے۔۔۔۔لیکن زمین سے نکل کر تیزی سے بھاگنے کا یہ معنی نہیں کہ کوئی مردہ قبر میں سویا ہوا اور اٹھ کر بھاگنے لگے، نہیں بلکہ جب صور پھونکا جائیگا تو گلی سڑی ہڈیوں یا ذرات کی شکل میں بکھرے انسان کے اندر جان آجائیگی۔صور پھونکنے کا محض یہ مطلب نہیں کہ کوئی سنکھ بجایا جائیگا اور لوگ زندہ ہوجائینگے بلکہ ایک مخصوص عمل سے گذارا جائیگا جس کی بنیاد پر انسان دوبارہ زندہ ہوجائینگے۔یہی بات مذکورہ بالا آیتوں کے علاوہ ''وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُبَارَكًا فَأَنْبَتْنَا بِهِ جَنَّاتٍ وَحَبَّ الْحَصِيدِ ﴿۹﴾ وَالنَّخْلَ بَاسِقَاتٍ لَهَا طَلْعٌ نَضِيدٌ ﴿۱۰﴾ رِزْقًا لِلْعِبَادِ ۖ وَأَحْيَيْنَا بِهِ بَلْدَةً مَيْتًا ۚ كَذَٰلِكَ الْخُرُوجُ ﴿۱۱﴾ ق﴾'' میں بیان کی گئی ہے، یعنی جس طرح مخصوص قسم کی زمین پر مخصوص قسم کا پانی برستا ہے تو اس کے نتیجہ میں ریزہ ریزہ ہوچکی نباتات و پیڑ پودے دوبارہ اگ کر ہرے بھرے ہوجاتے ہیں، اسی طرح قیامت کے دن مخصوص قسم کی عملیت نفخ کے نتیجہ میں ذرات کی شکل بکھرے مردہ انسان میں بھی جان پڑ جائیگی۔

اعلی توانائی کے حامل ذرات میں بدل کر زمین کی طرف آنے والے یاجوج و ماجوج زمین پر پہونچ کر اپنے آپ کو اصلی حالت میں بدل لیتے تھے؛ لیکن مقناطیسی میدان بن جانے کے بعد انہیں اوپر یہ موقع نہیں مل پاتا کہ وہ آپس میں جڑ کر اپنے اصل روپ میں لوٹ سکیں۔مردہ انسان کی سی حالت میں پھنسے

یاجوج و ماجوج جیسے ہی زمین پر وارد ہونگے تو انہیں اپنے آپ کو دوبارہ اصلی حالت میں لے آنے کا مناسب ماحول مل جائیگا۔ چنانچہ وہ سب سے پہلے قطبی علاقوں پر وارد ہونگے اور وہاں سے ساری روئے زمین پر پھیل کر پھر وہی تباہی مچائینگے جو کبھی مچایا کرتے تھے۔اس طرح یاجوج و ماجوج زمین کی دونوں جانب موجود مقناطیسی قطب سے نکل کر زمین کو چاروں اور سے گھیر لینگے اور اپنی طبیعی خصوصیت کی بنا پر انسانوں کے لئے تباہی کا وہ سما پیدا کرینگے کہ خدا کی پناہ۔

الحاصل جس طرح انسان اور جاندار بے جان عناصر سے بنے نطفہ اور عورت کے بیضہ کو مناسب ماحول ملنے پر وجود میں آتے ہیں۔

جس طرح ذرات کی شکل بکھرے مردہ انسان کو صور کے ذریعہ مناسب ماحول فراہم کرا کر دوبارہ زندگی بخشی جائیگی۔

اسی طرح اپنے آپ کو بے جان ذرات کی شکل میں بدل کر زمین کی طرف آنے والے یاجوج و ماجوج جب مقناطیسی میدان کی قید سے آزاد ہو کر زمین پر آپہونچینگے تو دونوں آپس میں ملکر دوبارہ اپنی اصلی حالت میں آجائینگے۔

اس طرح یاجوج و ماجوج کی اصل ''یاجوج و ماجوج بہ'' ہونے کی جو بات لغوی اور صرفی تحقیق کے دوران کی گئی تھی وہ مزید مؤکد ہو جاتی ہے۔کہ ''ماجوج بہ'' دراصل کوئی ایسی چیز ہے جس کے ساتھ ملنے پر ''یاجوج'' انتہائی تیز روشنی اور حرارت کو خارج کرتے ہیں۔

''وھم'' میں واو حالیہ ہے۔

لہٰذا اب آیت حَتّٰىٓ إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُونَ ﴿۹۶﴾ کا ترجمہ اس طرح ہوگا۔ یہاں تک کہ جب یاجوج و ماجوج کھول دئے جائینگے، حال یہ ہوگا کہ وہ ابھر کر نمایاں ہونے والی ہر جگہ سے زندگی پاکر تیزی سے نکلتے چلے آئینگے۔

یاجوج وماجوج اس وقت کہاں ہیں؟

''ردم'' ''فَمَا اسْطَاعُوا أَنْ يَظْهَرُوهُ وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا'' اور ''مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُونَ'' کے جملوں سے یہ بات حتمی طور پر معلوم ہوتی ہے کہ یاجوج وماجوج مقناطیسی میدان میں پھنس چکے ہیں۔ بلکہ ''نقب'' اور ''حدب'' کے لفظوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یاجوج وماجوج آج بھی نارتھ پول اور ساؤتھ پول کے اوپر موجود ہیں، چنانچہ جیسے ہی مقناطیسی میدان ختم ہوگا تو سب سے پہلے انہیں وہیں سے زمین پہ وارد ہونے کا موقع ملیگا۔ اگر یہاں نہ ہوتے بلکہ مقناطیسی میدان کے ختم ہونے پر خلا سے ہی سیدھے آنے کی بات ہوتی تو وہ سب سے پہلے خط استواء کے آس پاس ہی نمودار ہوتے۔

جو کوئی ''وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا'' ''وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ'' اور ''مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُونَ'' کی جھلک دیکھنا چاہے وہ قطبی روشنیوں کو دیکھ کر اندازہ لگا سکتا ہے۔۔۔۔کہا جاتا ہے کہ بہت سے باردار ذرات قطبین کے علاقوں کی طرف مڑ جاتے ہیں اور وہاں فضائی غلاف میں موجود

نائٹروجن اور آکسیجن کے ساتھ تعامل کرتے ہوئے ’’قطبی روشنیوں‘‘ کے وجود میں آنے کا سبب بنتے ہیں۔

درحقیقت منطقۂ شمالی اور منطقۂ جنوبی کے علاقوں میں ٦٦ سے ٦٩ عرض بلد پر ایک دائرے کی شکل میں نظر آنے والی یہ روشنیاں (Aurora lights) بھی سائنس دانوں کے لئے ایک معمہ ہیں۔ مزید تحقیق کی ضرورت ہے

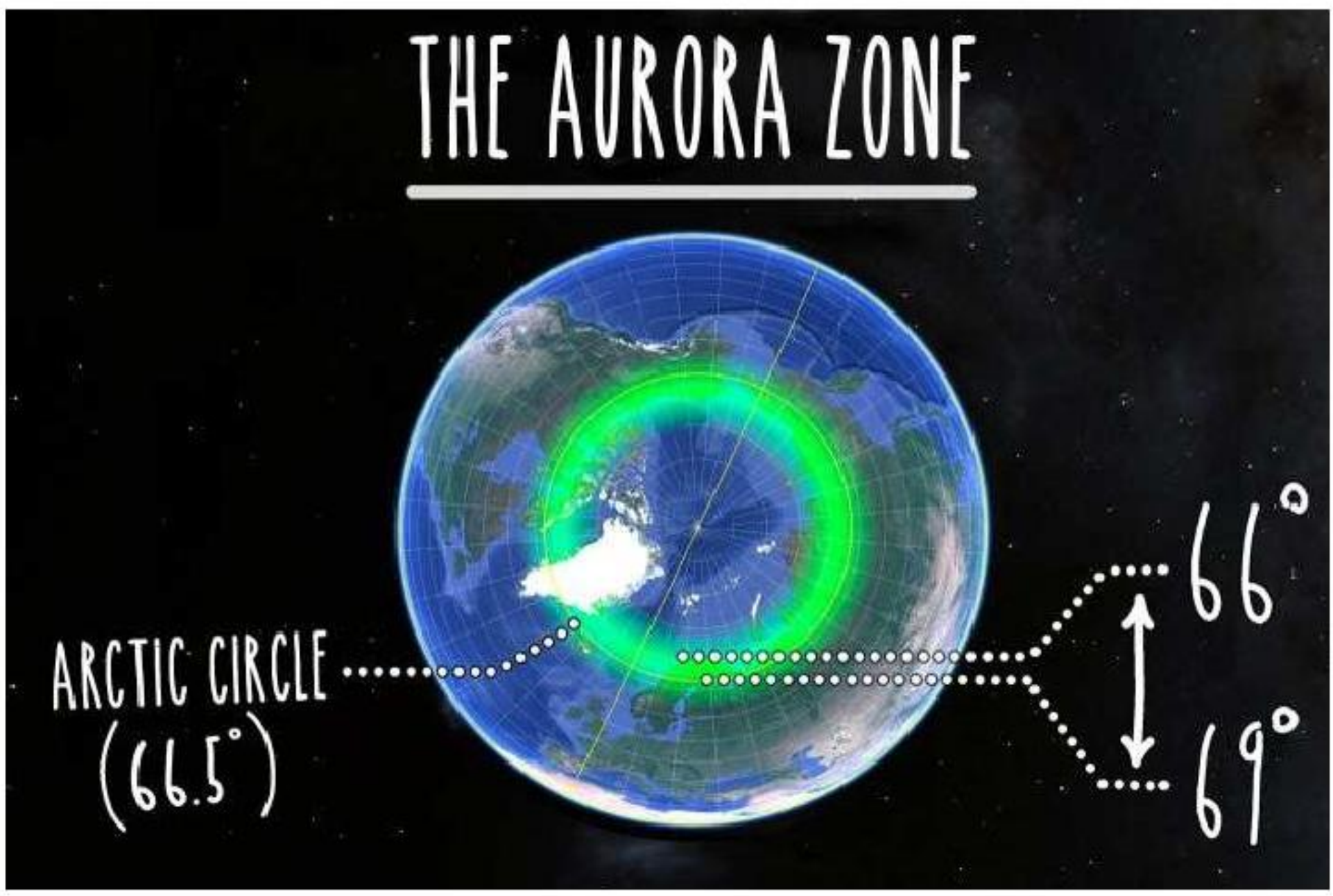

کہ کیا واقعتا باردار ذرات کے گیسی عناصر کے ساتھ ملنے پر یہ روشنیاں وجود میں آتی ہیں یا معاملہ کچھ اور ہے۔

الحاصل

گذشتہ ستر سالوں کے دوران مقناطیسی میدان پر کی گئی سائنسی تحقیقات میں اگر کوئی ایسی چیز دریافت ہوئی ہو جس پر یاجوج و ماجوج کا اطلاق کیا جا سکے تو وہ ہے، اعلی توانائی کے حامل وہ ذرات جو ریڈی ایشن بیلٹ میں موجود ہیں۔

۱۔ توانائی کے حامل ذرات میں تبدیل ہو کر غیر معمولی تیز رفتاری کے ساتھ آنے کی جو بات یاجوج و ماجوج کے لفظ میں پائی جاتی ہے وہی بات باردار ذرات میں بھی موجود ہے۔ بیلٹ میں موجود بعض ذرات قریب قریب روشنی کی رفتار سے حرکت کرتے ہیں۔ جو تقریباً ۱۸۶۰۰۰ میل فی سیکنڈ ہے۔

۲۔ ''یموج'' کے لفظ سے متلاطم اور لہر دار حرکت کا جو مفہوم ردم میں پھنسے یاجوج و ماجوج کے متعلق معلوم ہوتا ہے وہی بات باردار ذرات میں بھی موجود ہے۔۔۔۔

جدید تحقیقات سے ایک حیران کن بات یہ سامنے آئی ہے کہ اس بیلٹ میں پائے جانے والے الیکٹرون کی حرکت عام طبیعیات کے قانون کے برخلاف تین رخی ہے۔

ریڈی ایشن بیلٹ کے علاوہ دوسری جگہوں پر مشاہدے میں آنے والے باردار الیکٹرون اور پروٹون کے مقابلے مقناطیسی میدان میں موجود یہ ذرات صرف رفتار کی تیزی اور مختلف الجہات حرکت میں ہی مختلف نہیں بلکہ توانائی کے

اعتبار سے بھی حیران کن حد تک مختلف ہیں۔

۳۔ ''ردم'' یعنی دو طرفہ روک میں پھنس جانے کی جو بات یاجوج و ماجوج میں ہے وہی بات مقناطیسی میدان میں موجود باردار ذرات کی بھی ہے، چنانچہ سائنس داں بھی ان باردار ذرات کے متعلق یہی کہتے ہیں کہ یہ ان بیلٹوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔

۴۔ حدب سے اوپر یعنی قطبین کی طرف مڑ جانے کی جو بات یاجوج و ماجوج میں پائی جاتی ہے وہی بات قطبی روشنی وجود میں لانے والے باردار ذرات میں بھی پائی جاتی ہے۔

۵۔ اگر زبردست توانائی کے حامل یہ ذرات زمین پر آجاتے ہیں تو پانی کو بخارات بنا کر اڑا دینے والی ٹھیک وہی تباہی پھیلا سکتے ہیں جیسی کہ یاجوج و ماجوج کے متعلق بتلائی گئی ہے۔

الغرض نامعلوم سرچشمہ سے آنے والے یہ ذرات جن خصوصیات کے حامل ہیں، ایسی خصوصیات یاجوج و ماجوج کے علاوہ کہیں اور نہیں دیکھی گئیں۔

یہ بات تو طے شدہ ہے کہ یہ باردار ذرات عام اصولوں سے ہٹ کر ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان باردار ذرات میں اس کے علاوہ بھی کچھ ایسی بات ہو جو کسی بھی وجود کو اس کی مخصوص شکل وصورت میں ڈھالنے کے لئے ضروری ہو۔

اب اگر یہ باردار ذرات یاجوج و ماجوج کی تبدیل شدہ حالت ہی ہے

جیسا کہ دلائل اس بات کی شہادت بھی دے رہے ہیں تو اب اس بات پر مزید غور و خوض اور تحقیق کی ضرورت ہے کہ ان ذرات کے مقناطیسی میدان میں پھنس جانے کی سائنسی توجیہ کیا ہے۔

ظہر، نقب، موج، نسل اور جمع جیسے الفاظ کے معانی، ان کی مخصوص تراکیب استعمال کے ساتھ ردم کی تعمیر میں استعمال ہوئے مواد اور ان کے اثرات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سوال کو آسانی سے حل کیا جا سکتا ہے۔

یاجوج و ماجوج کے نکلنے پر کیا ہوگا؟

سورۂ کہف کی آیت نمبر ۹۴ قَالُوا يَاذَا الْقَرْنَيْنِ إِنَّ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلَىٰ أَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿۹۴﴾ میں جنوبی امریکہ کی اس قوم نے ذوالقرنین سے شکایت کرتے ہوئے کہا تھا کہ یاجوج اور ماجوج زمین میں بگاڑ پیدا کرتے رہتے ہیں۔

ماقبل میں ''افساد اور خرج'' کی لغوی تحقیق کے دوران ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس قوم نے جس بات کو زمین میں بگاڑ سے تعبیر کیا تھا وہ انسانوں کی ہلاکت و خونریزی نہیں تھی بلکہ کھیتی باڑی کی بربادی تھی۔۔۔۔اب سوال یہ ہے کہ یاجوج و ماجوج ایسا کیا کرتے تھے کہ جس کی وجہ کاشت برباد ہو جایا کرتی تھی تاکہ ہم یہ اندازہ لگا سکیں کہ قرب قیامت یاجوج و ماجوج کے نکلنے پر روئے زمین کی حالت کیا ہوگی۔

یاجوج و ماجوج کی لغوی تحقیق سے ہم یہ بھی جان چکے ہیں کہ وہ تیز روشنی اور شدید

حرارت کے حامل ایسے ذرات پر مشتمل ہیں جو انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔ظاہر سی بات ہے ایسا وجود پانی کو بھاپ بنا کر آناً فاناً اڑاتا چلا جائیگا۔

بعض سائنس دانوں کے اندازے کے مطابق زمین پر کبھی ایسے حالات پیدا ہوتے ہیں جب مقناطیسی قطب کچھ عرصہ کے لئے غائب ہوجاتے ہیں ۔۔۔۔اس بات میں کس قدر سچائی ہے یہ الگ بات لیکن یہ بات طے ہے کہ چاہے صرف مقناطیسی قطب غائب ہوں یا سارا کا سارا مقناطیسی میدان بہر صورت یاجوج و ماجوج قطبین سے رونما ہونگے۔نیز ''حدب'' پر کی گئی بحث سے یہ بات بھی واضح ہوچکی ہے کہ مقناطیسی میدان کے ختم ہونے سے پہلے دونوں علاقوں کی برف ختم ہوجائیگی۔ برف ختم ہونے کے کچھ عرصہ بعد ہی مقناطیسی میدان یا مقناطیسی قطب کے علاقے ختم ہونے پر یاجوج و ماجوج نکل پڑینگے۔

اب سوچیں کہ مقناطیسی میدان کی صورت میں موجود حفاظتی ڈھال اور آب و ہوا کو اعتدال پر رکھنے والی برف کے ختم ہوجانے کے نتیجہ میں انسان کس قدر چوطرفہ حالات کی لپیٹ میں آجائیگا کہ کہیں بھی اس کو جائے پناہ نہیں ملیگی۔

جب یاجوج و ماجوج اس مقناطیسی قطب سے کھول دئے جائینگے تو اپنی طبیعی خصوصیت کی بنا پر (جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے) سمندروں کے پانی میں ہلچل برپا کردینگے، ندی، نالوں، نہروں اور تالابوں کے پانی کو بھاپ بنا کر اڑادینگے۔یعنی یاجوج و ماجوج پانی کو اُجاج بنادینگے۔آکسیجن کی بہت بڑی مقدار کی کھپت پوری کرنے والے ایمیزون اور کانگو جیسے برساتی جنگل خشک ہوتے

چلے جائینگے۔اب ذرا اندازہ لگائیں کہ اس وقت لوگوں کا کیا حشر ہوگا! بارش بے ہنگم ہوجائیگی، فصلیں تباہ ہوجائینگی، آب وہوا انسانی بود وباش کے قابل نہیں رہیگی ،گرمی کی شدت بڑھ جائیگی اور روئے زمین کا ہرا بھرا اور خوشگوار نظام بگڑتا چلا جائیگا۔

یاجوج وماجوج اور نمک کی جھیلیں (Salt flats)

براعظم امریکہ کے اوٹاہ، بولیویا، ارجینٹینا، چلی اور افریقہ میں بوسوانا، نامیبا اور ٹیونیشیا کے ہزاروں مربع کلومیٹر پر پھیلی خشک جھیلوں میں لاکھوں ٹن نمک موجود ہے،نمک کی اتنی بڑی مقدار اپنی ابتدا کے اعتبار سے سائنس دانوں کے لئے ایک معمہ ہے۔کہا جاتا ہے کہ کبھی ان علاقوں کا درجۂ حرارت کافی بڑھا ہوا رہتا تھا، اسی دوران پانی کی جھیلیں خشک ہوکر نمک کو پیچھے چھوڑ گئیں۔

ہمارے نقطۂ نظر سے بظاہر اس کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں ، یاتو یہ جھیلیں سدین کی تشکیل کے وقت وجود میں آئی ہیں یا پھر یہ یاجوج وماجوج کے اثر کا نتیجہ ہوسکتی ہے، جو اپنی طبیعی خصوصیت کی بنا پر پانی کو بھاپ بنا کر اڑا دیتے ہیں۔۔۔ اگر مؤخر الذکر بات درست ہے تو ہم اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قرب قیامت یاجوج وماجوج کے نکلنے پر زمین کا کیا حشر ہوگا۔

الغرض موافق حیات حالات برقرار رکھنے والا نظام ربوبیت جسے ہم لائف سپورٹ سسٹم کہہ سکتے ہیں وہ درہم برہم ہوجائیگا۔کافر بے بس ہوکر پکار اٹھیگا:

يَاوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِي غَفْلَةٍ مِنْ هَذَا بَلْ كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿٩٧﴾ ﴿الأنبياء﴾

ہماری خیر نہیں، ہم تو اس بات سے غفلت میں ہی پڑے رہے، نہیں بلکہ ہم ظالم ہی تھے۔ ۔۔۔بے بس کر دینے والے ان حالات کو دیکھ کر انسان کے سامنے اللہ کی خلاقیت و ربوبیت حتمی طور پر عیاں ہو جائیگی، انسان جان لے گا کہ زمین کے نظام حیات کو برقرار رکھنے والے خالق کائنات کی ربوبیت و رحمت کے جن قوانین کو ہم اس سے پہلے سحر مستمر اور معمول کے واقعات میں گردانتے ہوئے یہ کہتے چلے آئے تھے کہ ما یھلکنا الا الدھر وہ سب کا سب غلط تھا۔ اس طرح وہ ایمان تو لے آئینگے لیکن اب ان کے ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

آیئے اس بات کو مزید وضاحت سے دیکھتے ہیں۔

انسانی زندگی کی منصوبہ بندی اور نظام ربوبیت کی طرف توجہ دلانے والی جن نشانیوں پر اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ توجہ دلائی ہے ان میں سے ایک پانی ہے۔ حتی کہ ایک آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ ﴿۳۰ الأنبياء﴾ ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے تقویت دی ہے ۔تو بھلا وہ کیوں ایمان نہیں لاتے۔

چنانچہ آج ہم جانتے ہیں کہ انسانی جسم کا ساٹھ فیصد حصہ پانی پر مشتمل ہوتا ہے۔ گویا پانی نہیں تو زندگی نہیں۔

اب سورۂ فرقان، سورۂ فاطر اور سورۂ واقعہ کی آیتیں ملاحظہ فرمائیں!

وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ ﴿۵۳ الفرقان﴾

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهُ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ

﴿۱۲ فاطر﴾

أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ﴿٦٨﴾ أَأَنْتُمْ أَنْزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُونَ ﴿٦٩﴾ لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ﴿٧٠﴾ ﴿الواقعة﴾

بھلا تم نے اس پانی پر غور نہیں کیا جسے تم لوگ پیتے ہو!۔ کیا تم نے اسے بادل سے اتارا ہے یا ہم ہی اسے برسانے والے ہیں۔ اگر ہم چاہتے تو اسے اُجاج (یعنی ایسا کھارا) بنا دیتے کہ تم پی نہیں سکتے تو بھلا کیوں شکر ادا نہیں کرتے۔

جس طرح سطح ارض پر ''اُجاج'' یعنی کھارے پانی کی بہتات ہے، اگر اللہ چاہتا تو تمام دریاؤں سمیت برساتی پانی بھی کھارا بنا دیتا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے نظام ربوبیت ورحمت کے تحت اسے ''اُجاج'' نہ بنا کر پینے اور کھیتی باڑی کے قابل بنا رکھا ہے۔

جس مقصد امتحان کے تحت یہ کارخانۂ جہاں قائم ہے، ''الساعۃ'' دراصل اسی نظام رحمت وربوبیت کے خاتمہ کا نام ہے، لیکن واقعۂ ساعت (جسے عرف عام میں غلط طور پر قیامت کہا جاتا ہے اس) سے پہلے ایک زمانہ قرب ساعت کے نام سے موسوم ہے، اس قرب ساعت کی نشانیوں میں جس نشانی کو اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ اہمیت دی ہے وہ ہے خروج یاجوج و ماجوج۔ خروج یاجوج و ماجوج دراصل اسی نظام رحمت وربوبیت کے خاتمہ کی ابتدا ہوگی جس پر حیات انسانی کا کارواں رواں دواں ہے۔ چنانچہ زمانۂ قرب ساعت کی نشانیوں میں یاجوج و ماجوج کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہونے کی وجہ یہی ہے کہ اس کا

نشانہ وہی پانی ہوگا جس پر حیوانی زندگی کی بقا کا مدار ہے یعنی رحمت خداوندی نے جس پانی کو اپنے نظام ربوبیت کے تحت اُجاج نہیں بننے دیا وہی پانی مہلت امتحان ختم ہونے پر یاجوج وماجوج کی وجہ سے اُجاج بنتا چلا جائیگا۔

پانی پر ہونے والے اس اثر کے تباہ کن انجام سے صرف نباتی اور حیوانی زندگی ہی متأثر نہیں ہوگی بلکہ آکسیجن کی گھٹتی جارہی مقدار زمین پر موجود عمارتوں اور پتھر جیسے جمادات کو بھی بھربھرا بنا کر مٹی بنادینگے۔

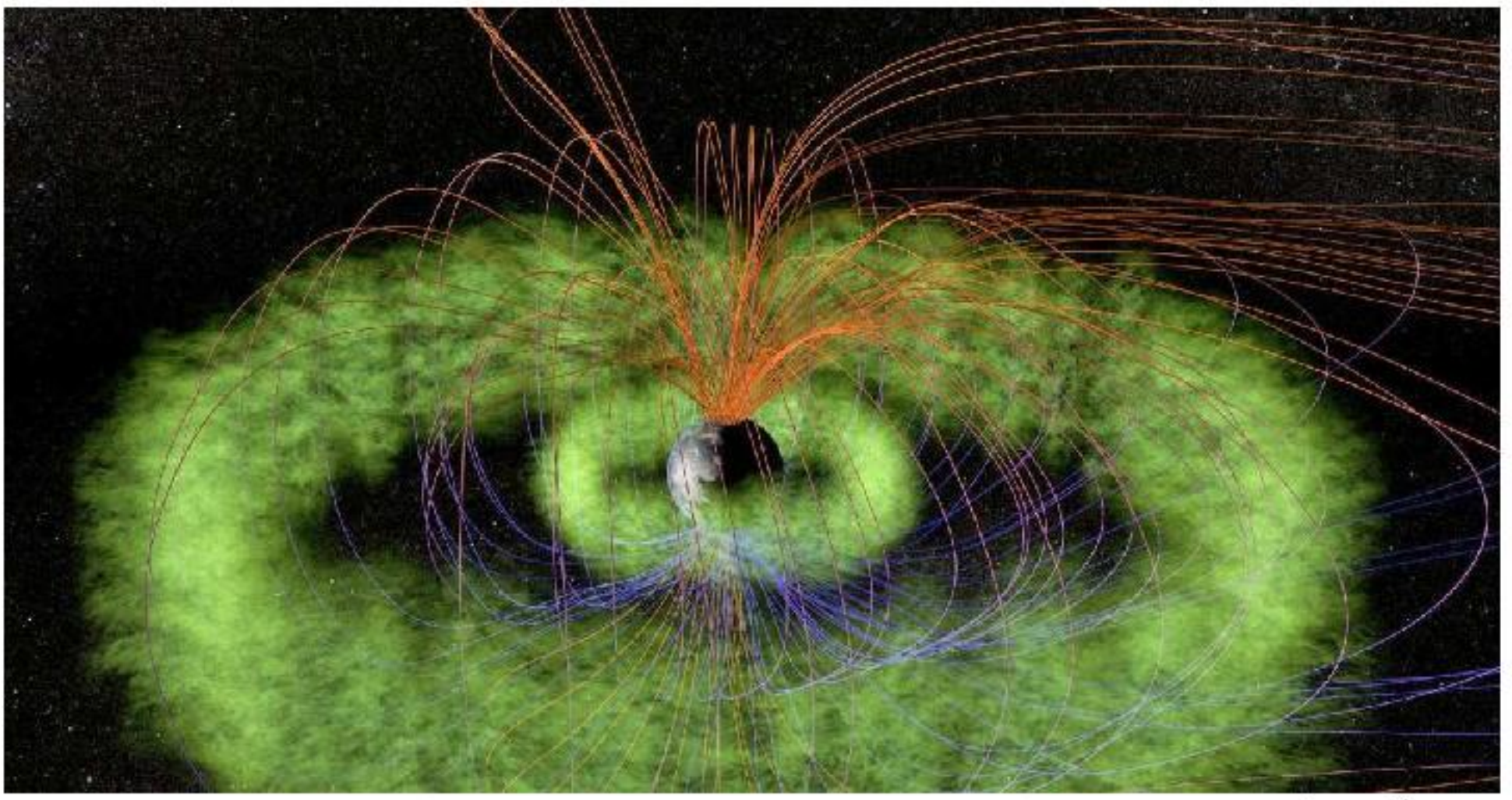

امریکی سائنسی ادارے ناسا کی جانب سے جاری کردہ باردار ذرات کی خیالی تصویر جس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یاجوج وماجوج نے زمین کو چاروں طرف سے کیسے گھیر رکھا ہے۔

ملاحظہ فرمائیں کہ قرآن نے سورۂ کہف کی ابتدائی آیات میں خروج یاجوج وماجوج سے قبل اور بعد انسانی زندگی کا مقصد اور انجام زندگی کو کن الفاظ میں بیان کیا ہے۔

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ﴿۷﴾ وَإِنَّا لَجَاعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيدًا جُرُزًا ﴿۸ الکھف﴾

یاجوج وماجوج کا خروج کب ہوگا؟

نظام شمسی اس منظم کائنات کا ایک حصہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بڑی منصوبہ بندی سے رواں دواں رکھا ہے۔نظام شمسی کو۔۔۔۔ہاں نظام شمسی کو اس صلاح و فلاح اور نظم ونسق کے ساتھ برقرار رکھنے کا بار انسان نے اپنے سر اٹھایا ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے کچھ اصولوں کا پابند بناتے ہوئے اس عظیم الشان نظام شمسی کی ''امانت'' کا بوجھ انسان کے سپرد کیا ہے۔

إِنَّا عَرَضْنَا الأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الإِنسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولاً ﴿۷۲،الأحزاب﴾

اگر قرآنی فلسفۂ کائنات پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ زمین وآسمان یعنی نظام شمسی کی صلاح اور نظم ونسق کے ساتھ قائم رہنے کا مدار انسان کے اعمال ہیں،یعنی انسان کے ایمان وعمل کے اچھے برے نتائج کا دائرۂ اثر صرف انفرادی،معاشرتی،ملکی یا زمینی سطح تک محدود نہیں رہتا بلکہ پورے نظام شمسی کو متأثر کرتا ہے۔اس بات پر قرآن کی بہت ساری آیتیں شاہد ہیں۔

تَكَادُ السَّمَاوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلَائِكَةُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَنْ فِي الْأَرْضِ أَلَا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿۵الشوری﴾

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ ﴿۷۱،المؤمنون﴾

انسانی ایمان وعمل اور نظام شمسی کا صلاح وفساد علت ومعلول کی طرح باہم اس قدر مربوط ہے کہ انسان کے گناہوں کے فوری نتیجے میں زمین وآسمان تہ وبالا

ہوجائیں ؛ لیکن اگر اللہ عز وجل وعدۂ مہلت کے علاوہ عفو و درگذر اور رحمت و مغفرت کا معاملہ نہ فرماتا تو یہ نظام ہستی کب کا عذاب کی لپیٹ میں آچکا ہوتا۔

الغرض نظام شمسی کی یہ دنیا تب تک صلاح وفلاح کے ساتھ رواں دواں رہیگی جب تک روئے زمین پر نیک انسانوں کا غلبہ رہیگا ؛ لیکن جب کفر وسرکشی کے ساتھ بداعمالیوں کا دور دورہ بڑھتا جائے گا تو پھر یہ دنیا بھی تباہی و بربادی کی طرف اسی قدر تیزی سے بڑھتے ہوئے اس آیت کی تفسیر کرتی چلی جائیگی ۔ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ ﴿۴۱ الروم﴾

بالآخر انسان سپرد کردہ امانت کا نظم ونسق برقرار رکھنے میں ناکام ہوکر کفر و طغیان اور ظلم واسراف کے ذریعہ بر و بحر میں ایسا بگاڑ پیدا کردے گا کہ پھر وہ اللہ کی رحمت ومغفرت کے لائق نہیں رہیگا، مقصد امتحان کے تحت ملی مہلت کا وقت ختم ہوکر وعدۂ ساعت کا وقت قریب آچکے گا اور اس طرح انسانی کرتوت کے نتیجہ میں پیدا شدہ عوامل کے سیدھے نتیجہ کے طور پر یاجوج وماجوج کھل کر رونما ہوجائینگے۔

کیا خروج یاجوج وماجوج کے بعد ایمان یا نیک عمل قابل قبول نہیں ہوگا؟

ایک رب کے اقرار کے ساتھ اخروی حسابدہی کے احساس پر فکر وعمل کو استوار کرنا انسانی زندگی کا بنیادی مقصد ہے۔

اگر فکر وعمل کے اس نظم ونسق میں انسان کامیاب رہتا ہے تو اس سے صرف آخرت ہی نہیں سنورتی بلکہ دنیا میں بھی توازن قائم رہتا ہے۔

لیکن خالق کائنات نے انسان سے فکر وعمل کی استواری کا یہ تقاضہ غیب

میں رہکر کیا ہے کیونکہ یہ زندگی انسان کے لئے ایک امتحان ہے۔

لیکن غیب میں رہکر ایمان وعمل کے تقاضہ کا یہ مطلب نہیں کہ بنا کسی دلیل کے بس ادعائی انداز میں ایک خدا کو مان کر اخروی حساب کے لئے تیاری کرنے کو کہہ دیا گیا ہو کہ یہ یہ مانو اور ایسا ایسا کرو ورنہ جہنم کے لئے تیار رہو۔نہیں بلکہ آفاق وانفس کی نشانیوں میں بار بار غور کرنے کی دعوت دیتے ہوئے کہا گیا ہے انسان ان چیزوں کو دیکھ کر کیوں غور نہیں کرتا کہ بھلا یہ سب بنا کسی کے بنائے وجود میں آ گیا ہے، کیا یہ سب بیکار ہی پیدا کر دیا گیا ہے کہ ان کا کوئی حساب کتاب نہیں ہوگا۔

اب چونکہ زندگی کا مقصد امتحان ہے اس لئے انبیاء ورسل علیہم السلام کے ذریعہ جو نشانیاں بتلائی گئیں یا آفاق وانفس کی جن نشانیوں میں غور کرنے کو کہا جا رہا ہے وہ بلا شبہ انسان کو یقین کی اس منزل تک پہونچا دیتی ہیں جہاں کفر وشرک کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہتی، حتی کہ قیام ساعت اور اخروی حساب ہی کا انکار بھی ممکن نہیں رہتا؛ لیکن یہ نشانیاں عین الیقین کا فائدہ نہیں دیتیں۔ کیونکہ اگر خدا خود اپنے آپ کو ظاہر کر دے یا نزول ملائکہ جیسی ایسی نشانیاں بتلائی جائیں جن سے براہ راست خالق کائنات کے وجود کا عین الیقین پیدا ہو جائے تو پھر امتحان کا مقصد باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ قرآن میں جن نشانیوں کے پیش کرنے سے منع کیا گیا ہے ان کا تعلق اسی قسم کی نشانیوں سے ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

وَقَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوعًا ﴿٩٠﴾ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِنْ نَخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا ﴿٩١﴾ أَوْ تُسْقِطَ

السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ﴿٩٢﴾ أَوْ
يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِنْ زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ وَلَنْ نُؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ
تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَقْرَؤُهُ ۗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا
﴿٩٣﴾ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَبَعَثَ
اللَّهُ بَشَرًا رَسُولًا ﴿٩٤﴾ قُلْ لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ
لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَسُولًا ﴿٩٥﴾ قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي
وَبَيْنَكُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا ﴿٩٦﴾ ﴿الإسراء﴾

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ
نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۗ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ فَإِذَا جَاءَ أَمْرُ
اللَّهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُونَ ﴿٧٨﴾ اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ
الْأَنْعَامَ لِتَرْكَبُوا مِنْهَا وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿٧٩﴾ وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوا
عَلَيْهَا حَاجَةً فِي صُدُورِكُمْ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُونَ ﴿٨٠﴾ وَيُرِيكُمْ
آيَاتِهِ فَأَيَّ آيَاتِ اللَّهِ تُنْكِرُونَ ﴿٨١﴾ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْهُمْ وَأَشَدَّ قُوَّةً وَآثَارًا
فِي الْأَرْضِ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٨٢﴾ فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ
رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ
يَسْتَهْزِئُونَ ﴿٨٣﴾ فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَحْدَهُ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا
بِهِ مُشْرِكِينَ ﴿٨٤﴾ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا ۖ سُنَّتَ اللَّهِ
الَّتِي قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِهِ ۖ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكَافِرُونَ ﴿٨٥﴾ ﴿غافر﴾

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ ۚ قُلْ إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَىٰ أَنْ يُنَزِّلَ آيَةً

وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۷ الأنعام﴾

یہی وہ مقصد امتحان ہے جس کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کسی ایسی نشانی دینے سے منع کر دیا گیا تھا جس سے عین الیقین پیدا ہو۔ وَإِن كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَن تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُم بِآيَةٍ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَىٰ ۚ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿۳۵ الأنعام﴾

مذکورہ بالا آیتوں میں یہ بات واضح طور پر بتلائی گئی ہے کہ جس دن کوئی ایسی نشانی ظہور پذیر ہو جائے جس کے بعد خالق کائنات کے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے تو اس کے بعد کسی کافر کا ایمان لانا قابل قبول نہیں ہوگا۔

جن نشانیوں کو دیکھنے کے بعد خدا کے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی ان میں سے ایک ''خدا کی ایسی پکڑ ہے جسے دیکھ کر انسان کے سامنے اپنی بے بسی واضح ہو جاتی ہے''۔ چنانچہ سورۂ غافر میں ''فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَحْدَهُ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهِ مُشْرِكِينَ ﴿۸۴﴾ فَلَمْ يَكُ يَنفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا ۖ سُنَّتَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِهِ ۖ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكَافِرُونَ ﴿۸۵﴾ ﴿غافر﴾'' کے ذریعہ یہی بات کہی گئی ہے۔

اور یہی اصول سورۂ انعام میں اس طرح مذکور ہے۔ هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا أَن تَأْتِيَهُمُ الْمَلَائِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ رَبُّكَ أَوْ يَأْتِيَ بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ ۗ يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنفَعُ نَفْسًا إِيمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِن قَبْلُ أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيمَانِهَا خَيْرًا ۗ قُلِ انتَظِرُوا إِنَّا مُنتَظِرُونَ ﴿۱۵۸ الأنعام﴾

اب سوال یہ ہے کہ وہ کونسی نشانی ہے جس کے ظہور کے بعد ایمان اور نیک عمل قابل قبول نہیں ہوگا؟ سورۂ انعام میں وارد اس اجمال کو قرآن نے سورۂ انبیاء کی مذکورہ ذیل آیتوں میں واضح کیا ہے۔

إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ ﴿٩٢﴾ وَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ ۖ كُلٌّ إِلَيْنَا رَاجِعُونَ ﴿٩٣﴾ فَمَن يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهِ وَإِنَّا لَهُ كَاتِبُونَ ﴿٩٤﴾ وَحَرَامٌ عَلَىٰ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿٩٥﴾ حَتَّىٰ إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ وَهُم مِّن كُلِّ حَدَبٍ يَنسِلُونَ ﴿٩٦﴾ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا يَا وَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا بَلْ كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿٩٧﴾

سورہ انبیاء کی ان آیات میں انبیاء علیہم السلام وغیرہ کے مختلف احوال بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کا مقصد اور انجام کار بتلاتے ہوئے فرمایا کہ

بلاشبہ تم سب ایک ہی امت تھے، (تمام لوگوں کے لئے ایک ہی حکم تھا کہ) میں تمہارا رب ہوں لہٰذا میری ہی پرستش کرنی ہے۔

(لیکن) لوگ حکم عدولی کرتے ہوئے مختلف گروہ میں بٹ گئے، (حالانکہ آپسی تفرقہ میں پڑ کر گمراہ ہونے کے بجائے یہ مقصد یاد رکھنا چاہیے تھا کہ) سب کو میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے، (اور اپنے کئے کا حساب دینا ہے)۔

(اس تفرقہ اور گمراہی کا لازمی انجام تو یہ تھا کہ سب کو اپنے کیے کا بدلہ مل جاتا؛ لیکن

اللہ نے مزید مہلت دی۔ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۱۹﴾ یونس

سو جو نیک اعمال بجالائیگا درآنحالیکہ کہ وہ مؤمن بھی ہو تو اس کے عمل کو اکارت نہیں کیا جائیگا اور اس کو ہم لکھتے جارہے ہیں۔

(لیکن مہلت کا یہ وعدہ) ان لوگوں پر حرام ہے جن کو ہم نے ہلاک کردیا ہے کیونکہ وہ لوگ (ایمان کی طرف) لوٹ کر آنے والے ہی نہیں تھے۔

(یہ مہلت کا موقع بھی تب تک جاری ہے) حتی کہ جب یاجوج اور ماجوج کھول دئے جائیں گے۔ چنانچہ وہ ہر رونما ہونے والی بلند جگہ کی ہر طرف سے نکلتے چلے آئینگے، اور (اس طرح) سچے وعدے کا وقت قریب ہو چکا ہوگا۔ تو کافروں کی نگاہیں کھلی کی کھلی رہ جائینگی (کہنے لگیں گے) ہائے ہماری خیر نہیں، ہم تو اس بات سے غفلت میں ہی پڑے رہے، (غفلت میں نہیں) بلکہ ہم ظالم ہی تھے۔

علماء مفسرین کے نزدیک سورہ انبیاء کی مذکورہ بالا آیات اور خاص کر ''وَحَرَامٌ عَلَىٰ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿۹۵﴾'' کے ترجمہ وتفسیر کو سمجھنے سمجھانے میں بہت زیادہ اختلاف واضطراب نظر آتا ہے۔ حتی کہ نحاس نے اس آیت کو مشکلات قرآن میں شمار کیا ہے۔ قال النحاس: والآية مشكلة۔ القرطبی

چنانچہ کوئی ''حرام'' کو واجب یا ممتنع کے معنی میں لیتا ہے۔ تو کوئی ''لا یرجعون'' کی ''لا'' کو زائد گردانتا ہے۔

۱۔ بعض حضرات نے ''حرام'' کو ''ممتنع'' کے معنی میں لیکر اور ''لا'' کو زائدہ مان کر آیت کا جو ترجمہ کیا ہے وہ کچھ اس طرح ہے: جو بستی اور اس کے لوگ ہم نے ہلاک کر دئے ہیں ان کے لئے محال ہے کہ وہ پھر لوٹ کر دنیا میں آجائیں۔

۲۔ بعض نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ جن لوگوں کو ہم نے ہلاک کر دیا ہے ان کے لئے منع ہے کہ وہ توبہ کریں۔ یعنی وہ توبہ کرنے والے نہیں ہیں۔

۳۔ کسی کا کہنا ہے کہ یہاں عربی کے معروف اسلوب کے مطابق اھلکنٰھا کے بعد ایک جز حذف ہے، گویا عبارت ہے: و حرام علی قریة اھلکنٰھا ان یرجعوا أنھم لا یرجعون۔

ان تمام اقوال کے مطابق آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ مرنے کے بعد توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، اگر کوئی دنیا میں آکر عمل صالح کرنا چاہے تو اس کا موقع نہیں ملیگا، اب تو صرف اخروی زندگی ہی ہے۔

دوسرا یہ کہ کسی بستی کے لئے ایمان میں داخلہ حرام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بد اعمالیاں، زیادتیاں اور حق سے پیہم روگردانیوں کی وجہ سے ان میں قبول ایمان کی استعداد ختم ہو جاتی ہے۔ پھر دوبارہ ایمان لے آنے کی توفیق نہیں ملتی۔

لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود کسی بھی طرح اس آیت کا اگلی پچھلی آیتوں سے نہ کوئی ربط معلوم ہوتا ہے اور نہ ہی الفاظ کا صحیح معنی ادا ہوتا نظر آتا ہے؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام حضرات مفسرین ''حرام'' اور ''لا یرجعون'' کو مبتدا و خبر سمجھ کر تفسیر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں حالانکہ اس کا عطف ''فَمَنْ یَعْمَلْ مِنَ

الصَّالِحَاتِ ''پر ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے لوگو گمراہی اور کفر کا راستہ اختیار کر لینے کے باوجود اب بھی تمہیں اختیار ہے۔

چنانچہ جو شخص ایمان لا کر نیک عمل بجالائیگا تو اس کے عمل کو ضائع نہیں ہونے دینگے بلکہ ہم اسے لکھتے جا رہے ہیں۔

(لیکن نیک عمل کو لکھنے اور اس پر بدلہ کا یہ وعدہ) ان لوگوں کے لئے حرام ہے جن کو ہم نے ہلاک کر دیا ہے، کیونکہ وہ ایمان کی طرف لوٹ کر آنے والے تھے ہی نہیں۔

أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ دراصل ''حَرَامٌ '' کی علت ہے۔یعنی چونکہ وہ لوگ دوبارہ ایمان لانے والے تھے ہی نہیں تو اب ان کے اچھے برے اعمال کو لکھنے نہ لکھنے کا کوئی مطلب نہیں۔

اہلاک اور لا یرجعون کا کیا مطلب ہے ؟

قرآن میں اِہلاک اپنے حقیقی معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور مجازی معنی میں بھی۔ أهلك، يهلك، إهلاك کا معنی ہے موت دینا، چاہے وہ طبیعی موت ہو یا پھر قتل یا عذاب کی صورت میں۔جبکہ مجازاً ایسے شخص کے لئے بھی اِہلاک کا لفظ مستعمل ہے جو ہٹ دھرمی اور اعمال شنیعہ کی ایسی حد پار کر لیتا ہے جس کے بعد اسے توبہ کی توفیق نہیں ملتی۔جس پر توبہ کا دروازہ بند ہو جائے وہ جیتے جی اس ہلاک شدہ آدمی کی طرح ہے جو دوبارہ دنیا میں آ کر ایمان نہیں لا سکتا۔ایسے ہی لوگوں کو قرآن نے

''صم بکم عمی'' کہہ کر بار بار ''لا یؤمنون اور لا یرجعون'' سے متصف کیا ہے۔

اب ایسے لوگوں کا دنیا میں رہنا یا نہ رہنا کوئی معنی نہیں رکھتا، چنانچہ یا تو انہیں عذاب کے ذریعہ ہلاک کر دیا جاتا ہے یا پھر طبیعی موت تک چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جس طرح عذاب سے مار دئے گئے لوگ دوبارہ زندہ ہو کر ایمان نہیں لا سکتے اسی طرح مؤخر الذکر کے زندہ رہ جانے کا بھی کوئی مطلب نہیں کیونکہ وہ بھی دوبارہ کبھی ایمان نہیں لائینگے۔۔۔۔۔۔۔ لہٰذا اب ان کے کسی اچھے عمل کو لکھنے کا بھی کوئی معنی نہیں، چونکہ روز حساب ان کی نیک عملی کا کوئی وزن نہیں ہوگا، بلکہ ان کے لئے سیدھے جہنم جانے کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔

وَحَرَامٌ عَلَى قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿۹۵﴾

ترجمہ: اور یہ بات (یعنی نیک عمل کے بدلہ اور اس کو لکھنے کا یہ وعدہ) ان لوگوں پر حرام ہے جنہیں ہم ہلاک کر چکے ہیں کیونکہ وہ لوٹ کر آنے والے نہیں ہیں ۔

''حرام'' ھٰذا مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ اب اصل عبارت ہوگی: وَھٰذا (الکتابة للعمل و الجزاء علیه) حَرَامٌ عَلَى قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا۔

اور ''وأنهم'' میں حرف تاکید ''أن'' وسط کلام میں (یعنی لام حرف علت محذوف کے بعد) واقع ہونے کی وجہ سے مفتوح ہے۔ ''أنهم لا یرجعون'' دراصل تفسیر یا علت ہے ''أهلكنا'' کی۔ مذکورہ ذیل مثالوں پر غور فرمائیں۔

كَذَٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ فَسَقُوا أَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۳۳ یونس﴾

إِنِّي جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوا أَنَّهُمْ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿۱۱۱ المؤمنون﴾

أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنَ الْقُرُونِ أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿۳۱ يس﴾

جس طرح ان مثالوں میں ''أَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ'' ۔'' أَنَّهُمْ هُمُ الْفَائِزُونَ '' اور'' أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُونَ'' بالترتیب'' حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ '' ۔'' جَزَيْتُهُمْ '' اور'' أَهْلَكْنَا '' کی تفسیر یا علت ہے اسی طرح '' أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ '' '' حَرَامٌ '' کی علت ہے۔۔۔۔أَنَّهُم دراصل لأَنَّهُم ہے۔

دوبارہ ان آیتوں کا مفہوم سمجھتے ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے آخری امت کو متنبہ کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی فرمایا کہ

آج جو یہ تم لوگ کافر ومشرک ، یہود ونصاری ، مجوس وصابی جیسے گروہ میں بٹے ہوئے ہو، یہ سب ایک ہی امت تھے۔

سب کے لئے ایک ہی پیغام تھا کہ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ورب ہے ؛ لہٰذا اسی کی عبادت کی جائے۔

لیکن لوگ ہوا پرستی ، عناد ونفرت ، تکبر وغفلت جیسی وجوہات کی بنا پر اصل راہ سے ہٹ کر آپس میں بنٹ کر اصل راہ سے دور ہوتے چلے گئے۔

حالانکہ لوگوں کو اصل مقصد مدنظر رکھنا چاہیے تھا کہ موت کے بعد اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، جہاں اپنی اپنی ذمہداری اور اچھے برے اعمال کا حساب دینا ہے۔

لیکن اے لوگو! تفرقہ، گمراہی اور کفر کا راستہ اختیار کر لینے کے باوجود اب بھی تمہارے لئے موقع ومہلت برقرار ہے۔

چنانچہ جو شخص دوبارہ ایمان لاکر نیک عمل کرتا رہیگا تو اس کے عمل کو ضائع نہیں ہونے دینگے بلکہ ہم اسے لکھتے جارہے ہیں اور یوم حساب جنت میں بہترین بدلا دیا جائیگا۔

لیکن جس شخص نے طغیان وسرکشی کی تمام حدود پار کر کے اپنے اوپر توبہ کا دروازہ بند کرلیا ہے، اس کے لئے یہ مہلت حرام ہے۔ یعنی اسے یہ اختیار حاصل نہیں۔

ایمان وعمل کا یہ اختیار بھی تب تک برقرار ہے جب تک یاجوج اور ماجوج نکل نہیں جاتے، جب یاجوج اور ماجوج کھول دئے جائینگے تو اس کے بعد ایمان لانے یا اچھے عمل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ یاجوج وماجوج کے خروج کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے حالات کو دیکھ کر ہر کافر پکار اٹھیگا کہ ہم مارے گئے، ہم تو اس بات سے غفلت میں ہی پڑے رہے، یقیناً ہم غلطی پر تھے۔

مذکورہ ذیل آیات پر غور فرمائیں:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُم بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ﴿۱۰۵﴾ ذَٰلِكَ جَزَاؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوا وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَرُسُلِي هُزُوًا ﴿۱۰۶﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا

﴿۱۰۷﴾ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿۱۰۸﴾ ﴿الکھف﴾

ان آیات کو دھیان میں رکھتے ہوئے سورۂ انبیاء کی آیات کو دوبارہ دوہرائیں!

فَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهِ وَإِنَّا لَهُ كَاتِبُونَ ﴿۹۴﴾ وَحَرَامٌ عَلَى قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿۹۵﴾

جو بات سورہ کہف کی آیت نمبر ۱۰۴، ۱۰۵ اور ۱۰۶ میں بیان کی گئی ہے، وہی بات وَحَرَامٌ عَلَى قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿۹۵﴾ میں بیان ہوئی ہے۔

یعنی جو لوگ ایمان لا کر نیک عمل کرتے ہیں ان کا ہر عمل لکھا جا رہا ہے اور روز قیامت ان اعمال کا وزن کر کے اسی کے مطابق جزا دی جائیگی لیکن جو کافر سرکشی وطغیان کو اپنی طبیعت میں شامل کر لیتے ہیں اور اللہ کی نشانیوں اور رسل علیہم السلام کا مذاق اڑاتے ہیں تو ایسے لوگوں کے اچھے اعمال بھی نہیں لکھے جائینگے اور روز قیامت ان کے اعمال کا کوئی وزن اور بدلہ نہیں دیا جائیگا۔

تنبیہ: یاد رہے کہ قرآن کا یہ انداز بیان محض ایک تخویفی ہے، ورنہ انسان کا ہر عمل محفوظ کیا جا رہا ہے۔

ایمان وعمل کی مہلت کب تک؟

حَتَّى إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُونَ ﴿۹۶﴾ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا يَا وَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِي غَفْلَةٍ مِنْ هَذَا بَلْ كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿۹۷﴾ ﴿الانبیاء﴾

حتیٰ انتہا کو بتلاتا ہے، سورۂ انعام کی آیت يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا

يَنفَعُ نَفْسًا إِيمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِن قَبْلُ أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيمَانِهَا خَيْرًا قُلِ انتَظِرُوا إِنَّا مُنتَظِرُونَ ﴿۱۵۸ الأنعام﴾ کے مطابق اس کا معنی یہ ہوگا کہ مؤمن کو اس کے عمل کا بدلہ اور عام کافر کے لئے ایمان لے آنے کی مہلت تب ختم ہوجائیگی جب یاجوج اور ماجوج کھول دئے جائینگے۔ جب یاجوج و ماجوج نکل آئینگے تو ان کی وجہ سے ہونے والی تباہ کاری کو دیکھ کر وہ پکار اٹھینگے کہ اب ہمارا کیا ہوگا! ہم نے اللہ کا انکار کر کے اپنے آپ پر ہی ظلم کیا ہے۔۔۔۔۔یعنی جو لوگ آفاق و انفس کی نشانیوں کو دیکھ کر اللہ کی ربوبیت، خالقیت اور رحم و کرم والے معاملے کو سمجھ کر ایمان لے آنے کی بجائے ان نشانیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے انہیں سحر مستمر سمجھ رہے تھے، خالق کائنات کے نظام ربوبیت اور تکوینی امور کو فطرت کے اندھے بہرے قوانین کی کارفرمائی کا نام دیکر اللہ کا انکار کرتے آرہے تھے وہ یاجوج و ماجوج کی ہولناکی والی نشانی کو دیکھ کر اللہ کی ربوبیت، خالقیت اور رحمانیت پر ایمان لے آئینگے، لیکن اس وقت وہ قابل قبول نہیں ہوگا۔

جو لوگ کفر کی ایسی حد کو پہونچ جاتے ہیں جس کے بعد ایمان کی توفیق نہیں ملتی، انہیں قرآن نے بار بار صم، بکم، عمی بتلاتے ہوئے کہا ہے کہ انہیں نصیحت اور انذار و تبشیر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں چونکہ وہ لوگ اب ایمان لانے والے نہیں ہیں ۔صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ۔

لیکن رحمت و مہلت کا یہ موقع اللہ تعالیٰ محض کفر کرنے پر نہیں چھین لیتا بلکہ اس کے لئے بہت ساری شرائط ہیں، جنہیں مذکورہ ذیل آیات میں دیکھا جا سکتا

ہے۔

وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَعْلُومٌ ﴿۴ الحجر﴾

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ حَتَّىٰ يَبْعَثَ فِي أُمِّهَا رَسُولًا ﴿۵۹ القصص﴾

وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا لَهَا مُنْذِرُونَ ﴿۲۰۸ الشعراء﴾

ذَٰلِكَ أَنْ لَمْ يَكُنْ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا غَافِلُونَ ﴿۱۳۱ الأنعام﴾

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ ﴿۱۱۷ هود﴾

وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۲۱ السجدة﴾

وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا ﴿۱۶ الإسراء﴾

وَتِلْكَ الْقُرَىٰ أَهْلَكْنَاهُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَوْعِدًا ﴿۵۹ الكهف﴾

وَكَأَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ أَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ﴿۴۸ الحج﴾

وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرَىٰ إِلَّا وَأَهْلُهَا ظَالِمُونَ ﴿۵۹ القصص﴾

الغرض سورۂ انبیاء آیت نمبر ۹۶ اور ۹۷ کے ذریعہ وہ اجمال دور ہوجاتا ہے جو سورہ انعام کی آیت نمبر ۱۵۸ میں تھا کہ وہ کونسی نشانی ہے جس کے ظہور کے بعد ایمان وعمل کی جزا کا وعدہ ختم ہوجاتا ہے۔

الحاصل نشانیاں دو طرح کی ہیں۔ نزول ملائکہ، رؤیت باری یا عذاب اکبر جیسی باتوں کا تعلق بلا واسطہ دلیل کی حیثیت رکھنے والی ایسی نشانیوں سے ہے

جسے دیکھنے کے بعد انسان کے لئے انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہتی، ان کو دیکھنے کے بعد انسان بالکل بے بس ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ایمان لانے یا نیک عمل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ جبکہ آفاق و انفس میں پائے جانے والے نظام ربوبیت جیسی آیات کا تعلق بالواسطہ دلیل کی حیثیت رکھنے والی ایسی نشانیوں سے ہے جنہیں دیکھ کر انسان اپنے اختیار کا استعمال کرتے ہوئے ایمان لے آئے تو یہی مطلوب بھی ہے جس پر اسے دائمی جنت کی صورت بہترین بدلہ سے نوازا جائیگا۔

الحاصل سورۂ انبیاء کی ان آیتوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ''یاجوج وماجوج'' کا خروج عالمی پیمانہ پر ہوگا، اس کے نتیجہ میں دنیا میں تباہی کا ایسا سما ہوگا کہ خدا کی پناہ۔ ساری دنیا اپنے کرتوت کے نتیجہ میں ''بأس اللہ'' یعنی خدا کی ایسی پکڑ میں آچکی ہوگی کہ اس کے بعد دنیا پر کوئی رحم نہیں کیا جائیگا۔ اب کوئی ذوالقرنین نہیں بھیجا جائیگا کہ دنیا کے ساتھ عفو و رحم کا معاملہ کر کے ان کو اس کرب والم سے نکال سکے۔ الغرض دنیا ایک مدت تک اسی طرح پے در پے تباہی کی علامات سے دو چار ہوتی رہیگی حتی کہ ایک مدت کے بعد قیامت قائم کردی جائیگی۔

الحاصل

یاجوج وماجوج کا خروج قرب قیامت کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ اس کے بعد نی کسی کا کوئی نیک عمل قبول ہوگا اور نہ کسی کا ایمان قابل قبول ہوگا۔

یاجوج وماجوج کا خروج قطبی علاقوں کی برف کے ختم ہونے کے بعد وہاں ظاہر ہونے والے بلند زمینی علاقوں پر سے ہوگا۔

چنانچہ برف کے ختم ہونے کے کچھ عرصہ بعد مقناطیسی میدان ختم ہوجائیگا۔

مقناطیسی میدان ردم کے ٹوٹ جانے کے نتیجہ میں ختم ہوگا، اور دک ردم اس صور پھونکنے کے نتیجہ میں ہوگا جو وعدۂ رب کے آپہونچنے کے وقت عمل میں آئیگا۔

گویا ذوالقرنین نے جس وقت کو ''وعد رب'' سے تعبیر کیا ہے وہ وقت صور پھونکنے کے بعد شروع ہوگا۔

صور پھونکنے کے بعد روئے زمین پر یاجوج و ماجوج کے خروج کے ساتھ ہی خطرناک بنتے جارہے حالات کسی کافر کے سامنے جہاں اسکے کفر وانکار کی حقیقت کھول کر کسی علیم وخبیر اور قادر مطلق رب عظیم کے وجود کو ثابت کردینگے وہیں اسکے سامنے اپنے کئے کے لازمی انجام کے طور پر ملنے والی جہنم کو بھی لا کھڑا کردینگے۔ کافر پکار اٹھینگے کہ ہائے اب ہمارا کیا ہوگا، ہم تو ان چیزوں سے غفلت میں ہی پڑے رہے، نہیں نہیں ہم ظالم ہی تھے۔ ملاحظہ فرمائیں:

قَالَ هَٰذَا رَحْمَةٌ مِّن رَّبِّي ۖ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَّاءَ ۖ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّي حَقًّا ﴿٩٨﴾ وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ ۖ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا ﴿٩٩﴾ وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكَافِرِينَ عَرْضًا ﴿١٠٠﴾ الكهف

حَتَّىٰ إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ وَهُم مِّن كُلِّ حَدَبٍ يَنسِلُونَ ﴿٩٦﴾ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا يَا وَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا بَلْ كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿٩٧﴾ الانبياء

ان دونوں سورتوں میں وارد یہ آیتیں جہاں یاجوج و ماجوج کے جائے

خروج اور کیفیت خروج کو بتلاتی ہیں وہیں ان کے وقت خروج اور مابعد خروج حالات کو بھی واضح کرتی ہیں۔

ذوالقرنین کے کارناموں کا حیران کن پہلو یہ ہے کہ انہی کے اختتام سے قرب ساعت کے دور کی ابتدا ہوگی۔ سب سے پہلے قطبی علاقوں پر موجود برفانی سد کا خاتمہ ہوکر ''حدب'' کا ظہور ہوگا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ردم کے نتیجہ میں پیدا شدہ مقناطیسی میدان ختم ہوجائیگا اور یاجوج ماجوج زمین پر پہونچ کر پانی کو خشک کرتے ہوئے وہ تباہی برپا کرینگے کہ ایمیزون اور کانگو جیسے برساتی جنگل بھی فنا ہوتے چلے جائینگے۔ پانی اور پیڑ پودوں کے خاتمہ کے لازمی نتیجہ کے طور پر آہستہ آہستہ روئے زمین سے آکسیجن نامی وہ بنیادی عنصر بھی ختم ہوتا جائیگا جو صرف حیوانی زندگی کی بقا کے لئے ضروری نہیں بلکہ پتھر جیسی چیزوں کا ٹھوس پن بھی اسی پر منحصر ہے۔ گویا یاجوج و ماجوج کے خروج کے بعد پے در پے تباہی کا وہ سلسلہ شروع ہوگا جو روئے زمین پر انسان کو زیادہ مدت تک زندہ نہیں چھوڑے گا۔ بلکہ زمین پر موجود ہر چیز بھر بھری مٹی میں بدلتی چلی جائیگی۔

سوچو کہ اگر ذوالقرنین نے اپنے اوپر عائد فریضہ کو پورا کرتے ہوئے ردم اور سدین جیسے عظیم الشان کارنامے انجام نہ دئے ہوتے تو غالباً زمین پر انسان کی بساط کب سے لپیٹی جا چکی ہوتی۔۔۔۔۔ گویا قیامت کا آنا طے ہے؛ لیکن وہ جبری قوانین کے تحت نہیں آئیگی بلکہ اس کا آنا انسانی بداعمالیوں پر منحصر ہے۔۔۔۔ دور حاضر کے انسان کو اس سے ایک بڑا سبق یہ ملتا ہے کہ وہ بھی اپنی

ذمہداریوں کو صحیح معنی میں ادا کرتے ہوئے قیامت کو پیچھے ڈھکیل سکتا ہے۔

ذوالقرنین اور بلند پروازی

مترجمین نے ذوالقرنین کی بابت تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے: کہ اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کو روئے زمین پر عظیم الشان سلطنت عطا کی تھی اور اس کو چلانے کے لئے ہر قسم کے اسباب و وسائل سے نوازا تھا۔ چنانچہ مفسرین و مؤرخین میں سے کوئی اسکندر کو ذوالقرنین بتلا رہا ہے، کوئی فارس اور میڈیا کی متحدہ سلطنت قائم کر کے عرب سے لیکر بحر اسود تک اور ایشیاء کوچک سے لیکر بلخ تک ایشیا کی تمام قوموں کو اپنے ماتحت بنا کر ۵۳۹ قبل مسیح میں انتقال کر جانے والے سائرس کو ذوالقرنین ثابت کرنے کے لئے پورا زور لگاتا نظر آتا ہے تو کوئی کہتا ہے کہ ذو القرنین دراصل سلیمان علیہ السلام کا ہی لقب تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ ذوالقرنین نبی تھے تو کوئی ثابت کرتا ہے کہ وہ ایک مشرق و مغرب کے ممالک پر حکومت قائم کرنے والا ایک عظیم الشان عادل بادشاہ تھا۔ وغیرہ وغیرہ

قصۂ ذوالقرنین کی ابتدا کرتے وقت اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی فرمایا تھا: وَيَسْأَلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۖ قُلْ سَأَتْلُو عَلَيْكُمْ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿۸۳﴾ وہ آپ سے ذوالقرنین کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دو کہ میں تمہیں انکا کچھ نصیحت آموز مبنی بر ثبوت حال کہہ سناتا ہوں۔

لفظ ''ذکراً'' اس بات کو واضح کرتا ہے کہ ذوالقرنین کے متعلق جو بات کہی

جائیگی وہ مختصر تو ہوگی لیکن ایسی مدلل ہوگی کہ قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے نصیحت کا سامان بن سکے، چنانچہ مابعد آیت میں ذوالقرنین کے متعلق دعوی کرتے ہوئے فرمایا: إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿۸۴ الکھف﴾ ترجمہ: ہم نے ذوالقرنین کو ساری زمین میں قدرت عطا کی تھی اور اسے ہر قسم کی بلند پرواز سواری عطا کی تھی۔

مکّن له فی الشّیء: جعل له علیه سلطانًا وقدرة کسی بات میں قدرت و اختیار دینا، سلطنت عطا کرنا، قادر بنانا۔

مَکَّنَ فلانًا من الشیءِ: أمکنه منه۔ موقع فراہم کرنا۔

مکنه فی الأرض: کسی کو کسی جگہ پائیدار سکونت دینا۔ آسائش فراہم کرنا۔

إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿۸۴ الکھف﴾

مکّن له فی الأرض: یہ تعبیر قرآن میں کئی مقام پر وارد ہوئی ہے، جن کا حقیقی مصداق سیاق وسباق سے طے کیا جاتا ہے کہ قدرت واختیار سے مراد کیا ہے اور اسکا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ چنانچہ مابعد جملہ ''وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا'' اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ ذوالقرنین کو کس قسم کا اور کتنا وسیع اقتدار وقدرت حاصل تھی۔

قرآن کا یہ ایک مخصوص اسلوب ہے کہ وہ ماقبل جملہ یا آیت میں موجود اجمال کو دوسرے جملہ کے ذریعہ واضح کردیتا ہے۔ چنانچہ ''إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ'' میں جو اجمال تھا اسے ''وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا'' کے ذریعہ

واضح کر دیا۔

وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿۸۴ الکھف﴾ سَبَبًا : سبب کی جمع اسباب ہے۔ بمعنی رسی، راستہ، وسیلہ وذریعہ۔

السبب: الحبل الذی یصعد به النخل، وہ رسی جس سے کھجور کے درخت پر چڑھا جائے۔

وسمی کل مایتوسل به إلی شیء سببا۔ اور اسی طرح ہر اس چیز کو ''سبب'' کہا جاتا ہے جس سے دوسری چیز کی طرف پہونچا جائے۔

والسبب: الحبل. قالوا للسبب: طریق وذریعة.

بالرغم من أنّ مفهوم (السبب) یعنی الحبل المستخدم فی تسلّق النخیل، الاّ أن بعض المفسّرین یحصره فی الوسائل المستخدمة فی إنجاز الأعمال. تفسیر الامثل

یعنی بہت سے حضرات کے نزدیک سبب ایسے وسائل کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جن سے کاموں کو فوری طور پر انجام دیا جا سکے۔

قرآن میں ۹ مقامات پر یہ لفظ آیا ہے جن میں چار بار زیر بحث سورۃ میں ہی مذکور ہے۔

وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿۸۴ الکھف﴾

فَأَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۵ الکھف﴾

ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۹ الکھف﴾

ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۹۲ الکھف﴾

مَنْ كَانَ يَظُنُّ أَنْ لَنْ يَنْصُرَهُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ إِلَى السَّمَاءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهُ مَا يَغِيظُ ﴿۱۵ الحج﴾

إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ﴿۱۶۶ البقرة﴾

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا هَامَانُ ابْنِ لِي صَرْحًا لَعَلِّي أَبْلُغُ الْأَسْبَابَ ﴿۳۶﴾ أَسْبَابَ السَّمَاوَاتِ فَأَطَّلِعَ إِلَىٰ إِلَٰهِ مُوسَىٰ وَإِنِّي لَأَظُنُّهُ كَاذِبًا ﴿۳۷ غافر﴾

أَمْ لَهُمْ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ فَلْيَرْتَقُوا فِي الْأَسْبَابِ ﴿۱۰﴾ جُنْدٌ مَا هُنَالِكَ مَهْزُومٌ مِنَ الْأَحْزَابِ ﴿۱۱﴾ ﴿ص﴾

اگر سبب کے اصلی معنی پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ فوری طور پر کاموں کو انجام دینے والے ایسے وسیلہ اور ذریعہ کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کا تعلق بلندی کے ساتھ ہو۔ چنانچہ قرآن میں جہاں کہیں سبب یا اسباب کا لفظ استعمال ہوا ہے وہ انہیں وسائل وذرائع کے لئے استعمال ہوا ہے جن سے بلندی کا سفر کیا جا سکے۔

سورۂ حج، غافر اور ص میں مذکور سبب اور اسباب پر غور فرمائیں! ہر ایک کا تعلق بلندی اور آسمان سے ہے۔ کیا بلندی اور آسمان میں بغیر خلائی یا ہوائی سواری کے جانا انسان کے لئے ممکن ہے!؟

ذرا سورہ ''ص'' کی مذکورہ آیت کے ساتھ سورہ رحمٰن کی ان آیتوں کو ملا کر دیکھیں۔

يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَن تَنفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمَاوَاتِ

وَالأَرْضِ فَانفُذُوا لا تَنفُذُونَ إِلاَّ بِسُلْطَانٍ ﴿۳۳﴾ فَبِأَيِّ آلاء رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿۳۴﴾ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّن نَّارٍ وَنُحَاسٌ فَلا تَنتَصِرَانِ ﴿۳۵﴾ ﴿الرحمن﴾

ان دونوں سورتوں میں السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا اور أَقْطَارِ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ سے مراد ''نظام شمسی'' ہے۔

یقیناً ہمارے قاری السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا سے ''نظام شمسی'' مراد لئے جانے پر پس وپیش میں ہونگے۔ان شاء اللہ کبھی اس پر مدلل بحث ہوگی، پھر بھی سر دست اتنا اشارہ کرتے چلیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بار بار ارض و سموٰت میں غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے۔غور وفکر کی نصیحت انہیں اشیاء میں دی جاسکتی ہے جو قابل مشاہدہ ہوں، اب جو چیز نا قابل مشاہدہ اور انسان کی دسترس سے باہر ہو، کیا اس میں غور وفکر کی دعوت دی جاسکتی ہے؟ لہٰذا سماوات یقیناً کوئی ایسے اجرام سماوی ہونے چاہیے جو قابل مشاہدہ ہوں نہ کہ وراء الوراء اور نظروں سے اوجھل۔

أَوَلَمْ يَنظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ وَأَنْ عَسَى أَنْ يَكُونَ قَدِ اقْتَرَبَ أَجَلُهُمْ فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ ﴿۱۸۵﴾ الأعراف

اسی طرح ذرا قصۂ ابراہیم علیہ السلام کو بھی دوہرائیں۔

وَكَذَلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَى كَوْكَبًا قَالَ هَذَا رَبِّي فَلَمَّا

أَفَلَ قَالَ لَا أُحِبُّ الْآفِلِينَ ﴿۷۶﴾ فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هَذَا رَبِّي فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَئِن لَّمْ يَهْدِنِي رَبِّي لَأَكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّينَ ﴿۷۷﴾ فَلَمَّا رَأَى الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هَذَا رَبِّي هَذَا أَكْبَرُ فَلَمَّا أَفَلَتْ قَالَ يَا قَوْمِ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ ﴿۷۸﴾ إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۷۹﴾ ﴿الأنعام﴾

فَلَمَّا کے بعد والا بیان نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ کی تفسیر ہے، اس میں کوکب، قمر اور شمس کو ہی مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ کہا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے مشاہدہ کے بعد ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔

الحاصل قرآن میں کل نو مقامات پر وارد سبب اور اسباب میں سے چار جگہوں پر بالکل واضح ہے کہ یہاں سبب اور اسباب سے مراد وہ وسائل حمل ونقل ہیں جن سے بلندی کا سفر کیا جاسکے۔ سورۂ بقرہ میں وارد وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ﴿۱۶۶ البقرة﴾ میں بھی یہی معنی مراد ہے، ان شاء اللہ جب کبھی جنت و جہنم کے متعلق لکھنے کا موقع ملا تو واضح کیا جائیگا کہ کس طرح یہاں یہ معنی مراد ہے۔

اب جب بقیہ تمام جگہوں پر سبب اور اسباب سے مراد آسمانی وسائل حمل و نقل ہیں تو ہم حتمی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ذوالقرنین نے جو سواریاں استعمال کی تھیں وہ کوئی بری یا بحری نہیں بلکہ آسمانی ہی تھیں۔

وَآتَيْنَاهُ مِن كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا۔ ''سبباً'' ''مِن كُلِّ شَيْءٍ'' کی تمیز

ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی ہم نے اسے حمل ونقل کے لئے ہر قسم کی بلند پرواز سواری عطا کی تھی۔

فَأَتۡبَعَ سَبَبًا ﴿۸۵﴾

أَتۡبَعَتِ الماشيةُ ونحوُها: صَارت ذاتَ تَبِيعٍ، فهي مُتبِعٌ، ومُتبِعة.

أَتۡبَعَ کا معنی بتلاتا ہے کہ یہ بلند پرواز سواریاں خودکار قسم کی تھیں۔

أتبَع باب افعال سے ہے۔ پیچھے ہونا، پیچھے سے جاملنا، تعاقب کرنا۔ اتّباع باب افتعال اور اتباع باب افعال میں فرق یہ ہے کہ پہلے کے فعل کا تعلق معنویات سے ہے جیسے اتَّبَعَ القرآنَ والحديث: اى عمِل بما فيهما . جبکہ دوسرے کا تعلق حسیات سے ہے۔ جیسے فَأَتۡبَعَهُمۡ فِرۡعَوۡنُ وَجُنُودُهُ۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام اوران کی قوم آگے آگے بھاگے جارہی تھی اور فرعون اوراس کا لشکران کے پیچھے پیچھے تعاقب کرتے ہوئے آرہے تھے۔

اتباع کے معنی میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مُتۡبِع یعنی پیچھے چلنے والے یا پیچھا کرنے والے کی دوڑ مُتۡبَع کے تابع ہوتی ہے۔ مُتۡبَع جدھر جاتا ہے، اسی طرف مُتۡبِع کو بھی جانا پڑتا ہے۔ البتہ مُتۡبَع کے بھاگنے کی وجہ خود مُتۡبِع ہے، یعنی مُتۡبَع کے بھاگنے کا محرک مُتۡبِع ہے۔

اب فَأَتۡبَعَ سَبَبًا کا معنی سمجھ میں آچکا ہوگا کہ سَبَبًا مُتۡبَع ہے اور سوار مُتۡبِع ۔سبب یعنی سواری جدھر لے جارہی ہے سوار اسی طرف جارہا ہے، البتہ سبب یعنی سواری کی حرکت کی وجہ خود سوار ہے، اسی کو خودکار کہتے ہیں۔

بلند پرواز سواریاں

واقعۂ ذوالقرنین میں ''سبباً'' کو ہر بار نکرہ لایا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ذوالقرنین نے ہر مقام کے لئے الگ الگ سواری کا استعمال کیا تھا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کو جو ہوائی سواری عطا کی تھی اسے ''ولسلیمان الریح عاصفة'' کے الفاظ سے بیان فرمایا جبکہ ذوالقرنین کو جن بلند پرواز سواریوں سے نوازا، ان کو ''سبب'' سے تعبیر فرمایا۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے؟

سلیمان علیہ السلام کو جس قسم کی ہوائی سواری عطا کی گئی تھی وہ تقریباً ایسی ہی تھی جیسی دور حاضر میں ہم لوگ ہوائی جہاز کی شکل میں استعمال کر رہے ہیں، لیکن ذوالقرنین کے پاس جو سواریاں تھیں وہ کافی ایڈوانس تھیں، انہیں موجودہ دور میں سمجھنا بڑا مشکل ہے، آنے والا مزید ترقی یافتہ دور ہی اس کی صحیح تصویر سمجھنے میں ہماری مدد کر پائیگا۔ کیونکہ اگر ذوالقرنین کے پاس بھی ایسی ہی ہوائی سواریاں ہوتیں جیسی کہ سلیمان علیہ السلام کے پاس تھیں یا ہم آج کل ہوائی جہاز کی صورت میں استعمال کر رہے ہیں تو اس کو بھی سبب کے بجائے کسی دوسرے لفظ کے ذریعہ ضرور تعبیر کیا جاتا۔

اگر ہم سبب کے معنی کو آیات میں وارد ''ثُمَّ لْيَقْطَعْ'' ''وَتَقَطَّعَتْ'' اور ''فَلْيَرْتَقُوا فِي الْأَسْبَابِ'' جیسے کلمات کے ساتھ جوڑ کر متعین کرنے کی کوشش کریں تو اس صورت میں اسباب کو براہ راست آسمانی اور خلائی سواریوں کے معنی

میں لینے کے بجائے ایسے آسمانی اور خلائی راستوں کی تشکیل کے معنی میں لینا زیادہ موزوں ہے جن سے بلندی کا سفر آناً فاناً طے کیا جا سکے۔ مثلاً موجودہ دور میں استعمال ہونے والے ہوائی یا خلائی جہاز جس ٹکنالوجی پر مبنی ہیں اس میں فضا اور کشش ثقل جیسی رکاوٹوں میں تبدیلی نہیں کی جاتی جبکہ ذوالقرنین نے جس ٹکنالوجی کا استعمال کیا تھا اس کے مطابق جو بلند پرواز سواریاں بنائی جاتی تھیں اس میں فضا میں تبدیلی کو بھی دخل ہوسکتا ہے، مثلاً کشش ثقل کو کنٹرول کرتے ہوئے راہ بنانا۔ ۔۔۔۔ چنانچہ یہاں ایک قابل توجہ بات یہ ہے کہ سواری اور سفر کے لئے ''رکب'' یا اس جیسے الفاظ استعمال کرنے کی بجائے ''أَتْبَعَ'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، یہ لفظ پیچھے چلنے یا پیچھا کرنے کا معنی دیتا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ ذوالقرنین ''سبب'' پر سوار نہیں ہوتے تھے، بلکہ ''سبب'' آگے آگے ہوتا تھا اور ذوالقرنین اس کے پیچھے۔۔۔۔۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ''سبب'' کوئی ایسی چیز تھی جس کا کام کشش ثقل یا فضائی رگڑ جیسے رفتار توڑ موانع کو ختم کر کے فاصلہ کو گھٹانا تھا تاکہ پیچھے آنے والے سوار کو آناً فاناً منزل تک پہونچایا جا سکے۔

الغرض سائنسی ترقی اور وسائل حمل ونقل کے درمیان لازم ملزوم اور چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر سائنسی ترقی نہ ہو تو وسائل وحمل ونقل میں تیزی پیدا نہیں کی جاسکتی اور جب تیز رفتار وسائل حمل ونقل نہ ہوں تو تمکین فی الارض کا دعوی درست نہیں ہوسکتا۔

الغرض

الف۔قرآن نے ذوالقرنین کے اسفار کی جو جھلک پیش کی ہے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے روئے زمین کے کونے کونے کا سفر کیا ہوگا۔

ب۔ سورۂ کہف کی آیت نمبر ۸۶، ۸۷ اور ۸۸ سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انہیں پوری زمین پر حکمرانی کا شرف بھی حاصل تھا اور زمین میں جہاں کہیں گئے وہاں اللہ کا پیغام بھی پہونچایا۔

ت۔اب ظاہر سی بات ہے کہ ساری روئے زمین پر اسفار و حکمرانی کے لئے تیز رفتار سواریوں کا ہونا بھی ضروری ہے ورنہ حقیقی معنی میں حکمرانی نہیں ہوسکتی؛ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے مذکورہ آیت میں روئے زمین پر اقتدار کے ساتھ ہی بلند پرواز سواریوں کا تذکرہ بھی کردیا۔

ث۔دوسری جانب سائنس وٹکنالوجی کے بغیر تیز رفتار اور بلند پرواز سواریوں کا تصور ناممکن ہے، چنانچہ سدین کی تشکیل اور تعمیر ردم کے تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین محض ایک حکمراں اور پیغامبر ہی نہیں تھے بلکہ سائنس و ٹکنالوجی کے بھی بادشاہ تھے، ایسی ٹکنالوجی کے ماہر جو موجودہ دور سے کہیں زیادہ ایڈوانس تھی۔

اب ذرا بتائیں کہ بیک وقت ساری روئے زمین کے حکمراں اور پیغامبر کے پاس کس قدر عظیم الشان بلند پرواز سواریاں ہونگی کہ جن کے ذریعہ تکوینی نظام سے منسلک سدین، مقناطیسی میدان اور ایمیزون جنگل جیسے حیران کن کارنامے انجام دئے جاسکے۔

سوچو کہ قرآن نے ان کی زندگی کا محض ایک چھوٹا سا گوشہ بیان کیا ہے، اگر ان کے تمام کارناموں کو بیان کیا جائے تو کیا ہوتا!

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ذوالقرنین بلند پرواز سواریوں کو استعمال کرتے ہوئے دنیا بھر میں اللہ کا پیغام پہونچانے والا، حکمرانی کرنے والا اور لوگوں کے تکوینی مسائل حل کرنے والا تاریخ انسانی کا ایسا واحد شخص ہے جو جغرافیہ، فلکیات، حیاتیات، طبیعیات اور کیمسٹری جیسے سائنس کے تمام شعبوں کا بھی ماہر تھا۔

ذوالقرنین سے ملقب کرنے کی وجہ

یہاں دو بڑے سوال رہجاتے ہیں کہ ذوالقرنین کا زمانۂ اقتدار کب گذرا ہے اور انہوں نے زمین پر یہ کارنامے کب انجام دئے۔ اور دوسرا یہ کہ ذوالقرنین کو ذوالقرنین کہنے کی وجہ کیا ہے۔

قرآن میں ''قرن'' کا لفظ یا تو ماضی کے لئے استعمال کیا گیا ہے یا مستقبل کے لئے۔ یعنی قرن کا اطلاق دو ہی زمانوں پر ہوتا ہے، ماضی اور مستقبل۔ ''القرنین'' معرف باللام ہونے کی وجہ سے'' ذوالقرنین'' کا معنیٰ 'دو سینگوں والا' یا 'دو زمانوں والا' نہیں کیا جائیگا بلکہ اس کا معنی ہوگا'' دونوں زمانوں والا''۔

اگر ذوالقرنین کو عطا کردہ تکوینی معاملات میں اختیار و قدرت کو مدنظر رکھتے ہوئے ''ذوالقرنین'' کا معنی سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انسانی تاریخ دو دوروں میں منقسم ہوتی ہے۔ ایک سائنس وٹکنالوجی کا اور دوسرا سادہ۔۔۔ یعنی ذوالقرنین دونوں زمانوں میں اقتدار کے مالک تھے۔ یا یوں

کہہ سکتے ہیں کہ سادہ دور میں آئے تھے؛ لیکن ان کے پاس سائنس وٹکنالوجی میں بے پناہ قدرت کی وجہ سے وہ سائنسی دور والے بھی کہلائے۔

بظاہر اتنی بات تو درست معلوم ہوتی ہے کہ انسانی تاریخ میں پیش آنے والے دو مختلف دوروں کی وجہ سے ذوالقرنین کو ''دونوں زمانوں والا'' کہا گیا ہے؛ لیکن کیا ان دو مختلف دوروں میں سے ایک سائنس وٹکنالوجی والا ہوتا ہے اور دوسرا سادہ یا پھر کہانی کچھ اور ہے؟

کیا یہ ہوسکتا ہے کہ انسانی تاریخ ایسے دو دوروں پر منقسم ہو، جن میں کا ہر دور یاجوج و ماجوج کے خروج پر ختم ہوتا ہو، چنانچہ جب ذوالقرنین کو زمین پر اقتدار حاصل تھا اس وقت یاجوج و ماجوج کے خروج کی وجہ سے پہلے دور کا خاتمہ ہو رہا تھا لیکن انہوں نے اپنی خداداد صلاحیت کی وجہ سے یاجوج و ماجوج کو روک کر انسانی تاریخ کے نئے دور کا آغاز کیا!۔۔۔۔خیر وجہ تسمیہ کے علاوہ زمانۂ اقتدار کے متعلق بھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

اسباق واقعہ

اب ایک سوال یہ تھا کہ ذوالقرنین کے سائنسی کارناموں پر مشتمل اس قسم کی داستان کو سمجھنا تو زیادہ سے زیادہ پچھلے سوڈیڑھ سو سالوں میں ممکن ہوسکا ہے تو بھلا آج سے چودہ سو سال پہلے ذوالقرنین کے متعلق سوال کرنے والوں کو یہ

داستان کیسے سمجھ میں آئی ہوگی؟

بسا اوقات سائل اپنے سوال کرنے میں بجا ہوتا ہے؛ لیکن اس کے جواب کو سمجھنا اسکی علمی سطح سے پرے ہوتا ہے، ایسی صورت میں مجیب مخصوص قسم کے الفاظ کے ذریعہ جواب دیکر بری الذمہ ہوجاتا ہے، اب جواب کو سمجھ سکنا یا نہ سمجھ سکنا یہ سائل کے ذمہ ہوتا ہے، سائل یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ کا جواب غلط ہے۔

یہی بات ''وَيَسْأَلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۖ قُلْ سَأَتْلُو عَلَيْكُمْ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿۸۳﴾'' سے مترشح ہورہی ہے۔ یعنی رسول اللہ کو خود یہ حکم دیا جارہا ہے کہ آپ فرمادیجیے کہ ذوالقرنین کے متعلق جیسا کچھ مجھے بتلایا جائیگا ویسا ہو بہو میں آپ لوگوں کو کہہ سناتا ہوں۔ ہاں جو کچھ کہا جائیگا وہ مدلل اور حقیقت کے مطابق ہوگا لیکن اسے سمجھنا یا بتلائی چیزوں کا معائنہ اور مشاہدہ کرسکنا نہ کرسکنا یہ سائلین کے ذمہ ہوگا۔

قصۂ ذوالقرنین کے متعلق یہ آیتیں سائلین کے لیے ایک خبر کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن چونکہ قرآن قیامت تک آنے والی نوع انسانی کے لئے آخری پیغام ہدایت قرار دیا گیا ہے، اس لیے من حیث الہدایت والتذکیر اس قصہ کے مخاطب ان سائلین کے ساتھ دنیا کے سارے انسان بھی ہیں۔

چنانچہ آج ہم نے دیکھ سمجھ لیا کہ قرآن کا یہ جواب کس قدر حیران کن حد تک درست تھا بلکہ دور جدید کے انسان کے سامنے قرآن کا یہ اعجاز بھی واضح ہوگیا کہ بلا شبہ یہ کلام کسی انسان کے بس کا نہیں ہوسکتا بلکہ یہ کسی ایسی محیر العقول ذات کی طرف

سے ہی ہے جسے زمین کے ہر ہر گوشے اور ذرے کا علم ہی نہیں بلکہ اس کے مستقبل سے بھی وہ اسی طرح باخبر ہے جس طرح وہ اس کے ماضی وحال کو جانتا ہے۔

سائنسی ترقی: عقلی ارتقاء کا نتیجہ یا خالق کائنات کے تکوینی نظام کا حصہ؟

تحقیقاتی رپورٹ کے مطابق موجودہ سائنسی ایجادات میں ملحدین کا کردار ریت کے کسی ڈھیر میں چند ذرات کی حیثیت بھی نہیں رکھتا پھر بھی یہ ملحدین سائنس والحاد کو ہم معنی سمجھتے ہوئے اس وہم میں مبتلا ہیں کہ سائنسی ترقی الحادی سوچ کا ہی نتیجہ ہے، چنانچہ جب تک دنیا مذہبی سوچ کے زیر اثر رہی تب تک لوگ سائنسی ترقیوں سے محروم رہے۔۔۔۔۔لہٰذا مذہبی کتابوں کے بجائے دنیا کو سائنس کا احسان مند ہونا چاہیے جس نے لوگوں کی مشکلات آسان بنادی ہے۔۔۔۔۔حتی کہ اچھے خاصے لوگ نظریۂ ارتقاء کے انکار کو سائنس کے انکار کا ہم معنی بتلاتے ہوئے یہ کہتے نظر آئینگے کہ جب آپ لوگوں کو سائنس کا ہی انکار ہے تو سائنسی مصنوعات سے فائدہ کیوں اٹھایا جارہا ہے۔

بہت سے ملحدین یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ جب قرآن یہ دعوی کرتا ہے

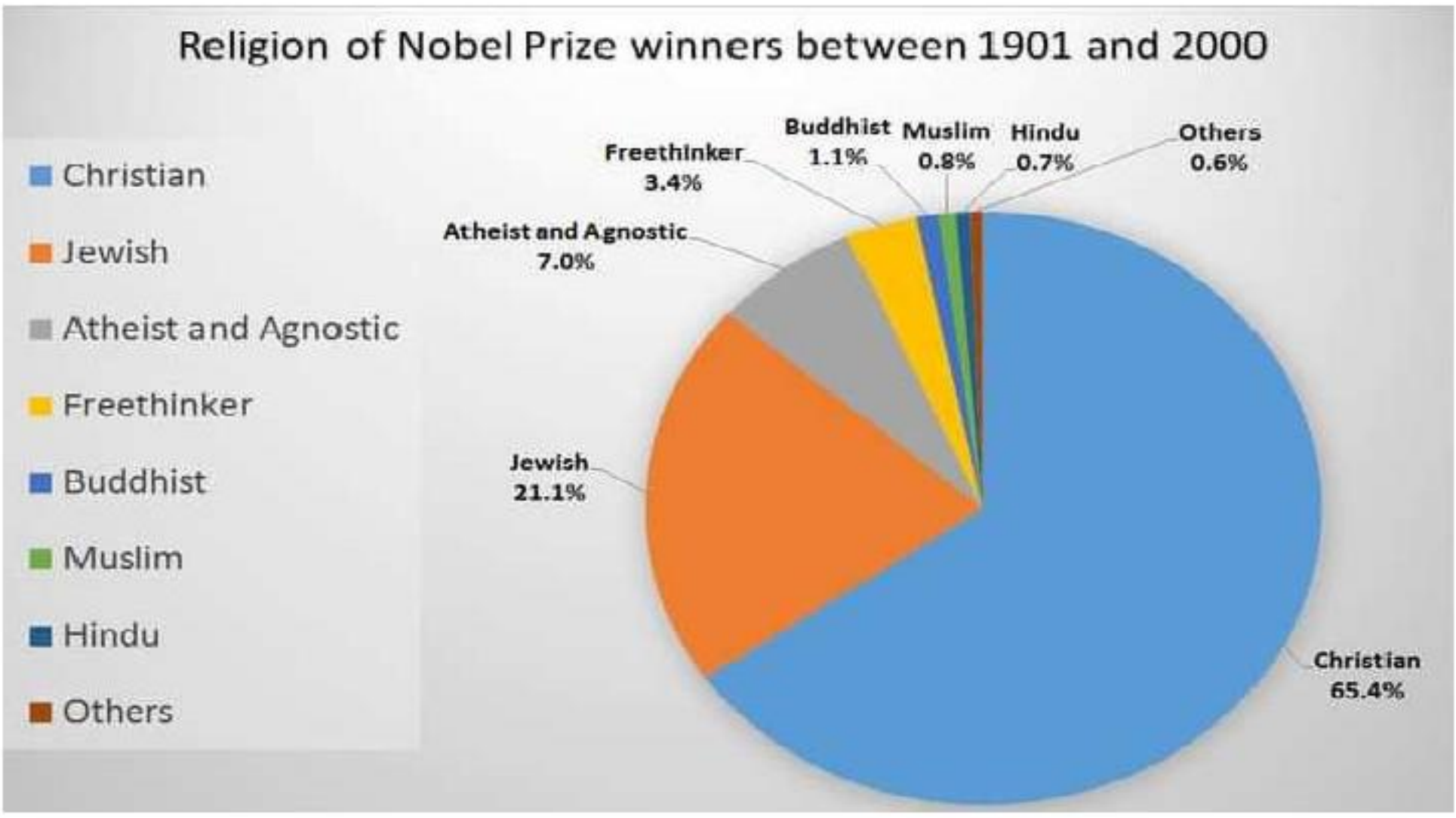

کہ اللہ نے ہر قوم میں نبی اور رسل بھیجیں ہیں تو امریکہ اور آسٹریلیا جیسے ممالک میں کوئی نبی کیوں مبعوث نہیں ہوا، درحقیقت دیگر مذہبی کتابوں کے مصنفین نے جس طرح اپنے اپنے علاقوں اور بزرگوں کا ذکر کیا ہے اسی طرح قرآن نے بھی صرف انہیں مقامات اور شخصیتوں کا تذکرہ پیش کیا ہے جنہیں عرب اور مشرق وسطی کے لوگ جانتے تھے۔ گویا اگر قرآن کسی خالق کائنات کا کلام ہوتا تو اس میں زمین کے دیگر علاقوں کا تذکرہ بھی موجود ہوتا؟

لیکن قصۂ ذوالقرنین سے صرف قرآن پر وارد اس قسم کے بے شمار سائنسی اور تاریخی اعتراضات ہی ختم نہیں ہوتے بلکہ جغرافیہ، فلکیات، طبیعیات اور حیاتیات جیسے سائنسی شعبوں سے متعلق ایسی کئی بنیادی باتوں کا بھی انکشاف ہوتا ہے جو بہت سارے سائنسی نظریات کو بدل دینے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ بلکہ ردم کی تعمیر کی مذکورہ تشریح کے بعد جہاں مقناطیسی میدان کے متعلق خلائی سائنس کا ایک بہت بڑا سوال حل ہو جاتا ہے وہیں موجودہ انسانیت کو بجلی کے بحران کی صورت میں جس ڈراونے مسئلہ کا سامنا ہے، ان شاء اللہ اس سے وہ بھی حل ہو جانے کی مکمل توقع ہے۔ شاید ردم کی تعمیر کے بعد اسے ''رحمۃ من ربی'' کہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو۔

قصۂ ذوالقرنین کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ ملحدین کا یہ بھرم بھی ٹوٹ جاتا ہے کہ دور حاضر کی سائنسی ترقی انسانی عقل کے ارتقاء کا نتیجہ ہے، بلکہ اس قصہ کے ذریعہ خود نظریۂ ارتقاء کی وہ بنیادیں ہی ختم ہو جاتی ہیں جن پر

الحاد کی عمارت قائم ہے۔

چنانچہ ہزاروں سال سے اپنی خدمات انجام دے رہے ذوالقرنین کے حیرت انگیز کارناموں کے بعد کوئی بھی ملحد یہ دعوی نہیں کرسکتا کہ سائنس انسانی عقل کے ارتقاء کا نتیجہ اور دور جدید کی ذہنیت کی پیداوار ہے۔

سیاہ فام قوم کی حیران کن داستان کے بعد کوئی ارتقائی نہیں کہہ سکتا کہ افریقی قوم بندر سے ارتقاء کرتے ہوئے انسان بنی ہے۔ اب کوئی نہیں سوچ سکتا کہ دنیا کے مختلف حصوں میں موجود انسانی نسلیں سیاہ فام قوم کی بدلی شکلیں ہیں۔ اب کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انسان پہلے پہل غاروں میں رہا کرتا تھا اور اس نے پتھر، تانبہ، کانسی اور لوہے کا استعمال یکے بعد دیگرے ہزاروں سال میں وقفے وقفے سے سیکھنے کے بعد کمپیوٹر اور ٹکنالوجی کے اس دور تک پہونچا ہے۔

مغرب الشّمس اور مطلع الشّمس میں سورج کے طلوع وغروب کی حیرت انگیز منظرکشی کے بعد کوئی نہیں کہہ سکتا کہ قرآن کے مطابق زمین چپٹی یا نظام شمسی کا مرکز ہے۔

اسی طرح امریکہ، آسٹریلیا اور افریقہ جیسی جگہوں کے علاوہ نارتھ پول اور ساؤتھ پول پر بسنے والی قوموں اور ان کو پیغام رسانی کے تذکرے کے بعد اس اعتراض کی کوئی حقیقت نہیں رہجاتی کہ قرآن میں صرف مشرق وسطی اور وہاں کی شخصیتوں کا ہی تذکرہ ملتا ہے۔

الغرض ماضی کی سائنس وٹکنالوجی پر دلالت کرنے والے اہرام مصر، نزکا

لائنس اوران جیسے بے شمار حیرت انگیز باقیات انسانی کے علاوہ فرعون مصر، سلیمان علیہ السلام اور ذوالقرنین کے واقعات اس بات کے لئے زندہ ثبوت ہیں کہ ماضی میں ایسے ایسے سائنسی انکشافات وایجادات موجود تھیں جن کا آج تصور بھی ممکن نہیں۔ لہٰذا یہ دعوی اب سرے سے خارج ہوجاتا ہے کہ موجودہ دور کی سائنسی ایجادات کوانسانی عقل کے ارتقاء کا نتیجہ قرار دیا جائے۔

انسان جیسا اپنی ابتدا میں متمدن تھا ویسا ہی آج ہے۔ اس کی عقل جیسی پہلے تھی ویسی ہی آج ہے۔ اگر تاریخ انسانی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انسان کا عقل وشعور، اخلاقی رویہ، حلم وشجاعت، بخل وسخاوت جیسی صفات وخصائل ماضی کے انسان میں بھی اسی معیار کی تھیں جیسی کہ آج ہیں، ایک رتی برابر ان میں فرق کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ دیکھا جائے تو ماضی کا انسان قوت حافظہ، حلم وصبر، قوت وشجاعت جیسی صفات میں دور حاضر کے انسان سے کہیں زیادہ برتر تھا۔

اب یہاں ایک سوال یہ ہے کہ اگر ایسی سائنسی ترقی پہلے بھی موجود تھی جیسا کہ اس کے شواہد بھی موجود ہیں تو پھر بعد میں یہ کہاں غائب ہوگئیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل یہ ایجادات وانکشافات اللہ کے تکوینی نظام کا ایک حصہ ہیں، انسانی معاشرہ کو جب جب ضرروت پڑتی ہے تب تب کسی نہ کسی بہانے رب العٰلمین کی جانب سے ایسے انکشافات وجود پذیر ہوتے رہتے ہیں ۔ چاہے وہ سلیمان علیہ السلام اور ذوالقرنین جیسی طاقتور شخصیتوں کی شکل میں ہو یا

پھر دور حاضر کی طرح اجتماعی شکل میں ۔۔۔اور جب حالات بدل جاتے ہیں اور سائنسی ایجادات انسانی معاشرت کا لازمی جزو نہیں رہتیں، چاہے وہ انسانی آبادی کی تنزلی کی صورت میں ہو تو سائنسی آلات بھی مرور زمانہ کے ساتھ اس طرح نیست و نابود ہو جاتے ہیں کہ ان کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔

قرآن میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ دو محرک ایسے ہیں جنکے لئے مشینی دور کا انتظام کیا جاتا ہے۔ایک سلطنت کی وسعت اور دوم آبادی کی کثرت۔ کیونکہ یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جن کے لئے وسائل حمل و نقل کی تیزی درکار ہوتی ہے، اور تیز رفتار وسائل حمل و نقل کا تصور مشین یا اس کے ہم پلہ تکنک کے بغیر ممکن نہیں۔ (یعنی اللہ تعالیٰ نے حکمت و مصلحت اور مقصد امتحان کے پیش نظر انسانوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے لے لئے روئے زمین پر اسی قسم کا نظام مرتب کیا ہے۔)

لہٰذا مملکت و سلطنت جس قدر وسیع ہوگی اسی قدر وسائل حمل و نقل کی تیزی درکار ہوگی۔ چنانچہ جب سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی: قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِي إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ ﴿۳۵﴾ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ ﴿۳۶﴾ وَالشَّيَاطِينَ كُلَّ بَنَّاءٍ وَغَوَّاصٍ ﴿۳۷﴾ وَآخَرِينَ مُقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ ﴿۳۸﴾ هَٰذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۹﴾ ﴿ص﴾

اس نے کہا اے میرے رب مجھے بخش دے اور مجھے ایسی مملکت عطا کر کہ میرے بعد کسی کے لائق نہ ہو، بے شک تو ہی عطا کرنے والا ہے۔تو ہم نے انکے لئے ہوا

کو مسخر کر دیا جو انکے حکم کے مطابق جہاں کہیں وہ چاہتے سکون کے ساتھ لے چلتی۔۔۔

ملاحظہ فرمائیں کہ جب سلیمان علیہ السلام نے حکمرانی میں وسعت مانگی تو اللہ تعالیٰ نے دیگر سہولتوں کے ساتھ ہوائی سواری بھی عطا کی۔ٹھیک اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کے متعلق ساری زمین پر سلطنت دئے جانے کا تذکرہ کیا تو ساتھ ہی بلند پرواز سواریوں سے بھی نوازنے کا ذکر کیا۔

اسی طرح مشینی اور صنعتی دور کا دوسرا محرک آبادی کی کثرت ہے۔جس قدر انسانی آبادی میں اضافہ ہوتا جائیگا،اسی قدر وسائل حمل ونقل میں تیزی کی ضرورت بھی بڑھتی جائیگی۔

ذرا سوچیں! ایسا کیوں کر ہوا کہ گذشتہ صدی میں جیسے ہی انسانی آبادی کی کثرت وکثافت بڑھنے لگی ٹھیک ایسے وقت میں یہ سائنسی ایجادات بھی وجود پذیر ہوتی چلی گئیں۔معیشت کے مدار کی حیثیت رکھنے والے ہوائی جہاز،موٹر گاڑی، ریلوے جیسے وسائل نقل وحمل، نظام مواصلات اور بنیادی ضرورت کا حصہ بن جانے والی بجلی اور پٹرول جیسی چیزوں کو ذرا ہماری روزمرہ کی زندگی سے نکال دیکھیں! ہمارا حشر کیا ہوگا؟ ساری کی ساری معیشت ومعاشرت آناً فاناً تہس نہس ہوتی چلی جائیگی۔ساری کی ساری سائنس وترقی وہیں کی وہیں ڈھیر ہوکر اقتصادیات اور سیاست پر مبنی انسانی آبادی کا سارا نظام درہم برہم اور ناقابل برداشت تکالیف میں مبتلا ہوجائیگا۔ان وسائل حمل ونقل کے ساتھ ہماری عیش

پرستی یا صرف روزگار کی فراوانی ہی متعلق نہیں بلکہ آبادی کی کثرت کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی بنیادی ضرورتیں بھی وابستہ ہیں ۔ان کے بغیر انسان کے معاشی مسائل وضرورتوں کو کنٹرول کرنا انتہائی دشوار ہے۔الغرض انسانی آبادی کی کثافت وکثرت سے پہلے ان ایجادات وانکشافات کی ایسی ضرورت نہیں تھی جیسی کہ آج ہے۔

الغرض سائنسی ترقی اور وسائل حمل ونقل کے درمیان لازم ملزوم کا رشتہ اور چولی دامن کا ساتھ ہے ۔اب ان انکشافات کا ذریعہ سلیمان علیہ السلام اور ذو القرنین کی طرح کوئی نبی اور عام بندہ بھی ہوسکتا ہے یا پھر موجودہ دور کی طرح نوع انسانی کی ایک جماعت بھی۔

اب ذرا قرآن میں بیان کردہ پروردگار عالم کے اس وعدہ پر نظر ڈالتے ہوئے اس کے طریقۂ ربوبیت کو سمجھتے جائیں۔

خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُبِينٌ ﴿۴﴾ وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿۵﴾ وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ ﴿۶﴾ وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَى بَلَدٍ لَمْ تَكُونُوا بَالِغِيهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنْفُسِ ۚ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿۷﴾ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً ۚ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۸﴾ وَعَلَى اللَّهِ قَصْدُ السَّبِيلِ وَمِنْهَا جَائِرٌ ۚ وَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۹﴾ ﴿النحل﴾

مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے طریق ربوبیت کی مثال دیتے ہوئے

فرماتے ہیں کہ یہ جانور جن میں سے بعض جہاں تمہارے پیٹ بھرنے کے کام آتے ہیں وہیں سواریوں کا کام دیتے ہوئے ایسی جگہوں تک ساز وسامان کو حمل و نقل کرنے میں بھی مدد دیتے ہیں جہاں انسان تن توڑ محنت کے بغیر نہیں پہونچ سکتا ۔۔۔۔۔اسی کے ضمن میں اللہ وعدہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں : وَيَخْلُقُ مَا لاَ تَعْلَمُونَ ۔اور مستقبل میں ایسی سواریاں پیدا فرمائیگا جنہیں تم لوگ فی الحال نہیں جانتے۔

سورہ نحل کی ان آیات میں قرآن نے خالق کائنات کے وجود پر اسکی منصوبہ بندی سے استدلال کیا ہے کہ خَلَقَ الإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ ۔انسان کو نطفہ سے پیدا کیا،لیکن وہ تو کھلم کھلا انکاری بن بیٹھا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرمانا چاہتے ہیں کہ انسان ذرا غور کرے کہ جس نطفہ سے اسکی تخلیق عمل میں آئی ہے،اسکے لئے خالق کائنات نے کیا کیا تیاریاں کر رکھی تھی ۔نطفۂ منی عورت کے بیضہ سے ملکر جنین کی صورت اختیار کرتا ہے، پھر وہ بچہ دانی میں نو ماہ تک تخلیق کے مختلف مراحل طے کرتا ہے، جب وہ رحم مادر میں پرورش کے مختلف دور سے گذرنے کے بعد باہری دنیا میں آنے کی تیاری میں ہوتا ہے تو ماں کی دودھ کی شکل میں باہر بھی اسکا انتظام شروع ہوجاتا ہے۔ذرا غور کریں کہ آخر کون ہے جو نطفے کے وجود میں آنے سے لیکر انسان کامل بننے تک کی ہماری تمام ضرورتوں سے واقف ہے،کون ہے جو ربوبیت کا سارا انتظام کرتا جارہا ہے، کون ہے جس نے انسان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی دنیا میں اسکے مناسب

حال سب تیاریاں کر رکھی ہیں!۔۔۔۔۔جو خالق یہ سب کرتا جا رہا ہے کیا وہ یہ نہیں جانتا کہ نوع انسانی مستقبل میں کن کن مسائل سے دوچار ہونے والی ہے۔ یقیناً وہ سب کچھ جانتا ہے، اسی لئے قرآن نے وجود خالق کو ثابت کرتے ہوئے بطور مثال جانوروں کے فوائد بتلانے کے بعد وعدہ کرتے ہوئے فرمایا تھا: وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ۔ یعنی گھوڑے، گدھے اور خچر جیسے جانوروں سے سواری اور بھاری بھر کم سامان کے نقل وحمل کا جو فائدہ لوگ آج اٹھا رہے ہیں ویسی ہی فائدہ دینے والی سواریاں مستقبل میں بھی پیدا کرتا رہیگا، ایسی سواریاں کہ جن کا آج تم لوگوں کو خیال بھی نہیں۔ چنانچہ موجودہ دور کے ہوائی جہاز، ریل گاڑیاں اور موٹر گاڑیاں جیسے تمام کے تمام وسائل حمل ونقل اسی وعدۂ خداوندی کی تعبیر ہیں جو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی چودہ سو سال پہلے قرآن میں بیان فرمایا تھا۔ لیکن افسوس کہ انسان نظام ربوبیت کے تحت چلنے والے اس عظیم الشان کارخانے کو فطرت کے اندھے بہرے قوانین کے نتائج کہتے ہوئے خالق کائنات کا انکار کر دیتا ہے۔

سلیمان علیہ السلام کا جو واقعہ قرآن کی مختلف سورتوں میں مذکور ہے، اس میں سائنسی دنیا سے متعلق کئی حیرت انگیز انکشافات موجود ہیں۔ ذرا تسخیر ریح کے اس بیان کو دوہرائیں جس میں مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے کرنے والی جس تیز رفتار مگر پرسکون سواری کا تذکرہ ہے، وہ سواری ہوائی جہاز کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتی کیونکہ ''ریح عاصفۃ'' سے صرف طیارے ہی اڑائے جا سکتے ہیں، بحری یا بری

سواریاں نہیں۔

سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ملنے والی حیرت انگیز کرم فرمائیوں میں ایک نکتہ سمجھنے جیسا ہے کہ اس وقت کے غیر سائنسی دور میں یہ سب غیر معمولی ضرور تھا لیکن مافوق العادت اسباب کے تحت نہیں ہو رہا تھا بلکہ سب کا سب موجودہ دور کی طرح اسباب و وسائل کے دائرے میں ہی تھا، یہی بات ہمیں ''و اسلنا لہ عین القطر'' سے معلوم ہوتی ہے کہ ٹھرسٹ فورس اور لفٹ فورس پیدا کرنے والی جس ''ریح عاصفہ'' کے ذریعہ سواری اڑا کرتی تھی وہ صرف ''حکم'' کے ذریعہ نہیں چلتی تھی بلکہ اس قسم کی طاقتور ہوا کو بنانے کے لئے ایندھن کے طور پر ''قطر'' کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اب ظاہر سی بات ہے کہ بغیر مشین کے یہ عمل ناممکن ہے۔

چنانچہ جو رب کائنات ماضی کے انسان کو ضرورتوں کے مطابق وقتاً فوقتاً ٹکنالوجی سے بہرہ ور کرتا آیا ہے، کیا مستقبل میں در پیش آنے والی انسانی ضرورتوں سے وہ غافل ہو جائیگا! نہیں بلکہ جس خالق نے جن اسباب و وسائل کے تحت ماضی کے انسان کو ٹکنالوجی سے نوازا تھا اسی نے دور حاضر کے انسان کو بھی ان سہولتوں سے سرفراز کیا ہے۔

قصہ مختصر قرآن نے صرف اقوام ماضی کی ہلاکت اور ان کے پاس موجود ترقی یافتہ اسباب و وسائل کا ہی تذکرہ نہیں کیا بلکہ آخری امت کن کن منزلوں کو طے کرنے کے علاوہ دنیا کے لئے کس قدر تباہ کن ثابت ہونے والی ہے، ان سب کو بھی صاف لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ ہم آج جس سائنسی ترقی یافتہ کہے جانے

والے دور میں جی رہے ہیں، ماضی کا انسان کبھی اس سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھا اور مستقبل کا انسان آج سے کہیں زیادہ ایڈوانس ہوگا۔ انسان آفاق وانفس کا خورد بینی ودوربینی مشاہدے کے علاوہ غیر مرئی چیزوں کو بھی دیکھ لینے کی صلاحیت حاصل کرلے گا، سیاروں کا سفر تو کرنے ہی والا ہے لیکن ساتھ ہی نظام شمسی سے بھی نکل جانے کی کوشش کریگا۔ اسی طرح ہوسکتا ہے انسان وسائل حمل ونقل میں اس حد تک کامیابی حاصل کرلے کہ پلک جھپکنے سے پہلے ہی بھاری بھرکم ٹنوں وزنی چیزوں کو سینکڑوں اور ہزاروں کلومیٹر دور تک منتقل کرنے میں بھی کامیاب ہوجائے۔ وغیرہ

ذرا یہ بھی سوچیں کہ ملحدین کے مطابق جو ارتقاء لاکھوں سالوں سے آہستہ آہستہ جاری تھا وہ گذشتہ ایک ہی صدی میں اپنی آخری منزل پہ کیسے پہونچ گیا!

اگر یہ سب ایجادات وانکشافات انسانی عقل وشعور کے ارتقاء کا نتیجہ ہوتے تو پھر ساری کی ساری نوع انسانی ہی سائنس داں اور نہایت عقلمند ہونی چاہیے تھی، جبکہ یہاں تو ان سائنسی نظریات کو سمجھنا ہی اکثر بندوں کے بس کی بات نہیں۔ ذرا سوچیں کہ انجن اور بلب جیسی مشینی دور کی بنیاد کہی جانے والی دریافتیں صرف فیراڈے، تھومس ایڈیسن اور اس جیسے دماغ میں ہی کیوں کر رونما ہوتی ہیں؟ جبکہ عام انسان تو انہیں سمجھنے سے ہی قاصر ہیں۔

دراصل ہمارے سامنے سائنس کے نام پر ایجادات کا جو انبار لگا ہے، جب ان پر غور کیا جائے تو انکی بنیاد میں محض چند ایجادات وانکشافات ہی نظر آتی ہیں، اگر ان بنیادی ایجادات کے واقعات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر

سامنے آتی ہے کہ ان ایجادات کے پیچھے کارفرما اصول ونظریات کا انہیں یکا یک ہی خیال آیا تھا، بسا اوقات ایسا ہوا کہ کسی دوسری چیز کی تلاش وجستجو جاری تھی کہ اچانک انہیں کوئی اور ہی تجربہ ہاتھ لگ گیا۔ ذہن میں آنے والا ایک ہی خیال مشاہدہ وتجربہ کی کسوٹی پر آنے کے بعد بے شمار ایجادات کا موجب بنتا چلا جاتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہی وہ القاء ہے جو نوع انسانی کی ضرورت وسہولت کے لئے پروردگار کی جانب سے اپنے چند بندوں کے ذہن میں ہوتا رہتا ہے۔

یہ القاء کسی کے بھی ذہن میں ہوسکتا ہے، اللہ اپنا حق ربوبیت ادا کرتے ہوئے کسی بھی قوم وملک کے افراد میں یہ باتیں الہام کرتا رہتا ہے، کافر ومؤمن، نیک وبد اور قوم ومذہب کے درمیان کوئی تفریق نہیں۔ جو کوشش کرتا ہے وہ پاتا ہے۔

تاریخ وحقائق سے ناواقف کچھ لوگ یہ بات کہتے سنائی دیتے ہیں کہ آخر اہل مغرب ہی سائنس کے میدان میں اس قدر ترقی یافتہ کیوں ہیں؟

اس طرح کہنے والے کچھ لوگوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ سب تحقیقات یہود ونصاریٰ کی خدمات ہیں، مسلمانوں نے اس میدان میں کیا کیا؟! جبکہ کچھ لوگ اس بہانے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دراصل الحادی سوچ ہی سائنسی ترقی کا زینہ ہے جبکہ مذہبی افکار ان کے لئے مانع ہیں۔

اس بات سے صرف نظر کہ سائنسی میدان میں ماضی وحال کے مسلمانوں سمیت ایشیائی ممالک کے کیا کیا کارنامے ہیں اور یورپ کب اس میدان میں آیا

۔اس بات سے بھی قطع نظر کہ ہندو پاک جیسے ممالک کے سائنس داں اگر یورپ و امریکہ کے تحقیقاتی اداروں اور تجربہ گاہوں میں کام نہ کرتے تو آج مغرب اسطرح ترقی یافتہ کبھی نہیں ہوتا۔ بیشک سائنسی میدان میں دیگر اقوام کی پسماندگی کے لئے بہت سے اسباب کو ذمہدار مانا جاسکتا ہے لیکن سب سے بنیادی وجہ یہ ہے کہ اگر مغربی دنیا میں استعماری ذہنیت اور ہندو پاک جیسے ممالک کے حکمراں طبقے میں لادینی، رشوت خوری، عیاشی اور اپنے ملک وقوم کے تئیں وفاداری کا فقدان نہ ہوتا تو سائنسی میدان میں ترقی کا توازن کبھی نہیں بگڑتا۔ ہندوستان سمیت مشرق وسطیٰ میں کئی ایسے نامور سائنس داں تھے جنکی دریافتیں دنیا کی تقدیر بدل سکتی تھیں لیکن انہیں اس طرح پراسرار طور پر قتل کردیا گیا کہ ان کے قاتلوں کا آج تک پتہ نہیں چلا، آخر ایسا کونسا قاتل ہے کہ ہماری حکومتیں بھی اس کی تحقیقات سے چشم پوشی کرلیتی ہیں!

الغرض عقلی ارتقاء کو نہ کسی طرح ثابت کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی سائنسی ترقیوں کو محض عقل کا کارنامہ کہا جاسکتا ہے بلکہ یہ سب چیزیں رب کائنات کے تکوینی نظام کا حصہ ہیں۔ دنیا کے کسی ملک کے لوگوں کو کسی دوسری قوم پر عقلی برتری حاصل نہیں بلکہ دنیا کے ہر علاقہ میں عقل وذہانت کا توازن کم وبیش ایک جیسا ہے۔ اسی لئے تمام سائنسی ایجادات دنیا کے لوگوں کی مشترکہ وراثت ہے۔

اور اگر پھر بھی کوئی اپنی سائنسی ایجادات کو دنیا پر احسان سمجھتا ہے تو آئے اور ذوالقرنین کے احسانات کے محض ایک فی صد حصہ کا حق ادا کر دکھائے۔

ملحدین کا دوسرا دعوی

دور حاضر میں پیش آنے والے سائنسی انکشات نے اپنے آپ کو ریشنالسٹ یعنی عقلیت پسند بتلانے والے ان ملحدین کو اتنا زیادہ زعم میں مبتلا کر دیا کہ انہوں نے یہ دعوی بھی کر دیا کہ جس طرح علم جدید نے مذہبی کہانیوں کی پول کھول کر رکھ دی ہے وہیں اس علم نے مظاہر فطرت کے پیچھے کارفرما قوانین کی دریافت کے ذریعہ مذہب اور کسی ماورائی طاقت کو خالق کائنات ماننے کی ضرورت کو بھی ختم کر دیا ہے۔

یقیناً کائنات کے خورد بینی و دور بینی مشاہدہ نے جس طرح چاند اور سورج جیسے مظاہر کی پرستش کرنے والوں کی ہوا اکھاڑنے میں بڑا کردار ادا کیا ہے وہیں دین و مذہب کے نام پر زمین و آسمان اور ان کی پیدائش کے متعلق گڑھی گئی بہت سی کہانیوں اور نت نئے اعتقادات کو بھی ہلا کر رکھ دیا ہے۔ لیکن علم جدید نے جن باتوں کو رد کیا ہے وہ سب دین و دھرم کے نام پر پھیلائے گئے ایسے اعتقادات اور کہانیاں ہیں جن کا حقیقی دین سے کوئی تعلق نہیں، یہ باتیں اہل علم اور عقل سلیم کے نزدیک نہ پہلے قابل قبول تھیں اور نہ آج۔ اب اگر کوئی شخص حقیقی دین کا مقصد، اس کے اصول و مبانی اور اصل کہانی کو سمجھے بغیر دین و مذہب کے نام پر پھیلائی گئیں ان خرافات کو ہی اصل دین سمجھ کر بالکلیہ خالق کائنات کا انکار کر دے تو یہ کہاں کی دانشمندی ہوگی!؟

دراصل سائنسی انکشافات اور تجربات کی روشنی میں کائنات کے متعلق ہم

جو چیز دیکھ پا رہے ہیں وہ یہ ہے کہ کائنات ''کیسے'' کام کر رہی ہے، لیکن جب جب ہم ان سائنسی مشاہدات کی روشنی میں کائنات کے بارے میں یہ سوال کرتے ہیں کہ ایسا سب ''کیوں'' ہو رہا ہے تو اس کا صحیح جواب ہمیں قرآن کے اسی مطلوبہ ہدف تک پہونچا دے گا جو وہ بار بار آفاق و انفس کی نشانیوں میں غور و فکر کی دعوت دے کر انسان کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے۔۔۔۔لہٰذا ان انکشافات کے نتیجہ میں مذہب کا انکار تو درکنار حقیقت تو یہ ہے کہ کائنات کے زیادہ باریک اور گہرے مشاہدہ کے نتیجہ میں نظر آنے والی حیرت انگیز اور لامتناہی منصوبہ بندی نے انسان کے سامنے اس ''کیوں'' کے جواب کو بالکل واضح کر دیا ہے جس کی جانب مذہب ہمیشہ توجہ دلاتا آیا ہے۔ گویا دور جدید کے ان مشاہدات کی روشنی میں ظاہر ہونے والے حقائق اس قرآنی آیت کی تاویل ہے۔ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿۵۳ فصلت﴾

چنانچہ علم جدید کا مطالعہ ایک سنجیدہ اور سلیم الطبع انسان کو یہ بات ماننے پر مجبور کرتا ہے کہ کائنات کا یہ نظم و نسق اور منصوبہ بندی کسی خلاق علیم کے بغیر ممکن نہیں؛ لیکن دوسری جانب وہ متعنت شخص جو کسی حال میں خالق کا اقرار کرنا نہیں چاہتا اس کی وہ بے بسی بھی قابل دید ہوتی ہے جو نظریۂ ارتقاء جیسے بے بنیاد اور غیر سائنسی نظریات کے بل پر کائنات کی منصوبہ بندی کی توجیہ کرتے وقت نظر آتی ہے۔

کس قدر تعجب کی بات ہے کہ جو دنیا بالکل منظم اور منصوبہ بندی کے ساتھ رواں دواں ہے، جس کائنات کا ہر جزء افادیت، نفع اندوزی اور امداد باہمی کے اصول کے تحت اپنے آس پاس کے اجزاء کے ساتھ بالکل فٹ ہے، جہاں کی ہر چیز اپنے ماحول کے حساب سے کامل و مکمل نظر آتی ہے، اس کی ابتدا کے لئے نظریۂ ارتقاء اور اتفاق و حادثہ پر مبنی بگ بینگ جیسے کسی ایسے نظریہ کو ذمہ دار سمجھا جائے کہ جس کی تجرباتی سائنس کی دنیا میں کوئی گنجائش نہیں۔

''نظریۂ ارتقاء'' (Evolution) ایک فریب

چارلس ڈارون نے ۱۸۵۹ء میں اپنی کتاب ''انواع کی ابتداء'' (On the Origin of Species) کے ذریعہ ایک نظریہ پیش کیا تھا جسے ''نظریۂ ارتقاء'' کہا جاتا ہے۔

نظریۂ ارتقاء کے مطابق زمین پر موجود چرند و پرند، کیڑے مکوڑوں سے لیکر چوپایوں اور انسان تک سارے حیوان یک خلوی جاندار (Single cell) سے ارتقاء کر کے وجود میں آئے ہیں۔

پانی میں رہنے والا یک خلوی جاندار پہلے متعدد خلیے والے جاندار میں تبدیل ہوا، پھر متعدد خلیے والا جاندار ارتقاء کرتے ہوئے مچھلی نما جاندار میں بدل گیا، پھر یہ جاندار خشکی پر آنے لگا، اور اس طرح یک خلوی جاندار بقائے اصلح اور قدرتی انتخاب کے قانون کے تحت ارتقاء کرتے ہوئے لاکھوں کروڑوں سال بعد

نوع بنوع کے جاندروں میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔

لیکن ڈارون کے اس نظریہ کو ڈیڑھ سو سالوں سے زیادہ عرصہ گذر جانے کے باوجود آج تک تجرباتی سائنس کی بنیادوں پر ثابت نہیں کیا جاسکا۔ بلکہ اس کے خلاف ایسے بے شمار دلائل پیش کئے گئے ہیں جنہوں نے اسے ایک سائنسی حقیقت تو کیا ایک مفروضہ کے طور پر بھی اس کے وجود کو تسلیم کرنے کے قابل نہیں چھوڑا ہے۔۔۔۔۔اسکے باوجود تمام ذرائع ابلاغ، کتب ورسائل حتی کہ اسکول کی نصابی کتابوں میں بھی اس نظریہ کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ گویا وہ ایک سائنسی حقیقت ہو۔۔۔۔اس نظریہ کی حمایت میں ایک بھی دلیل نہ ہونے کے باوجود ملحدین اس نظریہ پر اندھا ایمان رکھتے ہیں کیونکہ اس نظریہ کو نہ ماننے کا سیدھا مطلب ہے کہ نظریۂ تخلیق کا اقرار کرلیا جائے۔

نظریۂ ارتقاء کے زبردست حامی سر آرتھر کیتھ لکھتے ہیں کہ ہم نظریۂ ارتقاء کو ثابت نہیں کرسکتے لیکن پھر بھی اسے مانتے ہیں؛ کیونکہ اگر اس کو نہ مانیں تو نظریۂ تخلیق کو ماننا پڑتا ہے جو سائنسی طور پر قابل قبول نہیں۔

حیوانوں میں ارتقاء یا تبدیلیاں دو طرح کی ہوتی ہیں۔

۱۔ایک ہی نوع کے جانداروں میں رنگ وبال خدوخال اور قدوقامت کا فرق۔

۲۔ایک نوع کا دوسری نوع سے بدل جانا، مثلاً مچھلی کا چوپایا بن جانا۔ چوپایے کا پرندہ بن جانا اور بندر کا انسان بن جانا۔

پہلے نمبر کی تبدیلی کو (Micro evolution) ارتقاء صغیر کہا جاتا ہے جبکہ دوسرے

نمبر کی تبدیلی کو(Macro evolution)ارتقاء کبیر کہا جاتا ہے۔

پہلی قسم کی تبدیلیاں عام مشاہدہ کی چیزیں ہیں جبکہ دوسری قسم کا مشاہدہ کسی نے نہیں کیا۔نظریۂ ارتقاء کے ماننے والوں سے اختلاف اسی قسم کو لیکر ہے۔

جب کبھی ارتقائیوں سے اس بات پر دلیل مانگی جاتی ہے کہ ارتقاء کے حق میں کوئی ایک دلیل ایسی بتائیں جو ثابت شدہ حقیقت کا درجہ رکھتی ہو تو ایمبر یالوجی ، ٹیکسانومی ، بائیوکیمسٹری ، پیلیئنٹالوجی ، اناٹومی ، ویسٹیجئل آرگنز کا حوالہ دیکر ہزاروں سائنس دانوں کے نزدیک قابل قبول نظریہ ہونے کا دعوی کرنے والے ملحدین فوراً مائیکرو ایوولیوشن کو پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مائکرو ایوولیوشن ہی بعد میں میکرو میں بدل جاتا ہے،لیکن جب مشاہدہ کی بات پوچھی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ اس کا مشاہدہ ممکن نہیں کیونکہ یہ تبدیلیاں لاکھوں کروڑوں سالوں پر محیط ہوتی ہے۔

تمام جانداروں میں ڈے این اے اور ٹرپل کوڈ کی مماثلت کو نظریۂ ارتقاء کے ثبوت میں ایک مضبوط دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے؛ لیکن دو جسموں میں پائی جانے والی مماثلت اس بات کا سائنسی ثبوت نہیں ہوسکتی کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے بنے ہیں یا ان کے آباء واجداد ایک ہی تھے۔

کسی نوع میں خدوخال اور قدوقامت کی تبدیلیاں اس کے ڈی این اے میں میوٹیشن کی وجہ سے وجود میں آتی ہیں ، میوٹیشن کی وجہ سے کسی بھی جینیاتی ڈھانچہ میں پہلے سے موجود خصوصیات میں تو تبدیلی آسکتی ہے لیکن وہ ایک نوع

کے دوسرے نوع میں بدلنے کا سبب نہیں ہوسکتی کیونکہ ایسی تبدیلی کے لئے جینوم میں تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے اور جینوم میں تبدیلی قدرتی انتخاب یا رینڈم میوٹیشن سے ممکن نہیں۔

آم کی گٹھلیوں اور مخصوص قسم کے پودوں کی ٹہنیوں سے ہم نے بارہا پتنگوں اور کیڑوں کو نکلتے دیکھا ہے، اسی طرح بعض درختوں کے پتے اور ٹہنیاں بھی پردار کیڑوں میں بدلتے نظر آتے رہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر تمام جاندار یک خلوی وجود سے ارتقاء یافتہ ہیں تو ان بند گٹھلی اور ٹہنیوں میں ان جانداروں کی بے نسل پیدائش کس طرح عمل میں آتی ہے؟

اگر بقائے اصلح کے قانون کے تحت انسان بندر سے وجود میں آیا ہے تو چمپانزی جیسی بندروں کی اقسام آج موجود کیوں ہیں، حالانکہ وہ تو پہلے ہی نابود ہوجانی چاہیے تھیں۔۔۔۔ارتقائیوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ انسان اور ہوموسپیئن کے درمیان دیگر بہت سی کڑیاں بھی تھیں جو ماحول کی ناسازگاری کی وجہ سے معدوم ہوگئیں۔۔۔۔بھئی آخر ماحول میں ایسی کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں کہ انسان اور چمپانزی کے لئے تو یہ ماحول سازگار رہا لیکن بیچ کی کڑیاں ختم ہوگئیں!۔۔۔ایسا کیونکر ہوا کہ انسان تو دو پیروں پر چلنے لگا لیکن اس کا چچازاد چمپانزی وہیں کا وہیں رہگیا۔

اگر بقائے اصلح پر حیوانوں کی بقا منحصر ہے تو شیر، چیتا اور بھیڑیوں کے مقابلے گائے، بیل اور بکریوں جیسی نسلیں اس قدر تیزی سے کیوں بڑھتی جارہی

ہیں ۔۔۔۔۔نیز شکار بننے والے جانور خود ارتقاء کرتے ہوئے درندے کیوں نہیں بن جاتے۔

ارتقائیوں کے مطابق افریقہ کی سیاہ فام قوم اور چمپانزی دونوں کے اجداد ایک ہی تھے، چنانچہ یہ وہ پہلی قوم ہے جو بندر سے ارتقاء کرتے ہوئے انسان بنی ہے، اس انسان نے پہلے پہل غاروں میں رہنا سیکھا، پتھر کے اوزار کا استعمال سیکھنے کے بعد کانسی، تانبہ اور لوہے کا استعمال کرتے ہوئے ہزاروں سال بعد آج سائنسی دور تک پہونچا ہے۔

لیکن زیر بحث سورہ کی آیت ''حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلَىٰ قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَل لَّهُم مِّن دُونِهَا سِتْرًا ﴿۹۰﴾'' نظریۂ ارتقاء کی بنیادوں کو ہی ختم کر دیتی ہے۔

جس طرح ذوالقرنین کے حیرت انگیز سائنسی کارناموں نے ارتقائیوں کی جانب سے پیش کی جانے والی ''غاروں کی زندگی سے لیکر جدید سائنس تک کے ارتقاء'' کی داستان کو مسترد کر دیا ہے، اسی طرح سیاہ فام لوگوں کو چمپانزی کا چچازاد بتلا کر ان سے انسانی نسل کے ارتقاء کی کہانی کو بھی نیست و نابود کر دیا ہے۔

آیت نمبر ۹۰ اور ۹۱ ہمیں یہ بھی بتلاتی ہیں کہ انسان میں کس حد تک ناموافق حالات برداشت کرنے کی طاقت ہے اور خد و خال اور نظام انہضام میں جزوی تبدیلی کے ذریعہ کس حد تک کے ناموافق حالات کے ساتھ سازگاری پیدا کی جاسکتی ہے۔

سیاہ فام قوم کی داستان ہمیں یہ بھی بتلاتی ہے کہ کم سخت اور زیادہ بہتر ماحول ملنے پر ناسازگار ماحول میں ہوئی جزوی تبدیلیاں کس طرح اپنی تبدیل شدہ حالت پر قائم رہتی ہیں یا رفتہ رفتہ ختم ہوجاتی ہیں ۔۔۔۔اس طرح نظریۂ ارتقاء کی حمایت میں ''ناکارہ اعضاء'' والا استدلال بھی بیکار بنکر رہ جاتا ہے۔

الغرض نظریۂ ارتقاء کے رد میں بے شمار دلائل ہیں ۔لیکن ان باتوں سے صرف نظر کہ ارتقاء ہوتا ہے یا نہیں ، اگر ہوتا ہے تو وہ نوعی ارتقاء ہے یا فردی ، جو تبدیلیاں مشاہدہ میں آتی ہیں ان کا تعلق جوہری تبدیلیوں سے ہے یا صفاتی ،سوال یہ ہے کہ یہ تبدیلیاں کیونکر عمل میں آتی ہیں؟

اگر یہ تبدیلی حیوان کے اپنے اختیار میں ہوتی تو کوئی انسان بدصورت پیدا نہ ہوتا، ہر پیدا ہونے والی نسل پہلے کے مقابلے زیادہ عقلمند ہوتی ، یہ سب چھوڑیں اگر حیوان کے اپنے اختیار میں ایک ذرہ برابر تبدیلی پیدا کرنا ممکن ہوتا تو ایک ماں کم از کم اس دردزہ کی اس تکلیف سے تو ضرور نجات پالیتی جو وہ ہزاروں سال سے برداشت کرتی آئی ہے۔

اور اگر یہ تبدیلیاں ماحولیاتی جبر کے تحت وجود میں آتی ہیں تو بھلا ماحول میں یہ شعور کہاں سے آیا کہ وہ جانداروں میں مخصوص قسم کے مثبت تغیرات پیدا کرسکیں ۔ بلکہ بڑا سوال یہ ہے کہ ایٹم سے لیکر نظام شمسی تک ہر چیز جو حیوانی اور نباتی وجود کے لئے صرف اور صرف افادیت کے پہلو کے ساتھ قائم ودائم ہے ان چیزوں میں بذات خود افادیت کا پہلو کس طرح پیدا ہوگیا؟ ۔۔۔آخر سورج کی کرنوں میں یہ

شعور کہاں سے آیا کہ وہ سمندر کے کھارے پانی کے ساتھ تعامل کر کے میٹھے پانی پر مشتمل اس بادل کو وجود میں لے آئے جو حیوانی اور بناتی وجود کے لئے ضروری ہے۔

بالائے بنفشی شعاعوں میں یہ شعور کہاں سے آیا کہ مجھے انسانی جلد میں موجود مخصوص کیمیکل کے ساتھ تعامل کر کے ہڈیوں کو بڑھانے والے ویٹامن ڈی کی پیدائش کو بڑھانا ہے۔

الغرض اس طرح کائنات کی کسی بھی چیز میں غور کرلیں، ہر چیز اس قدر منظم اور لمبی چین کے ساتھ جڑی ملیگی کہ انسانی عقل اس کا احاطہ بھی نہیں کرسکتی۔

لہٰذا اصل سوال یہ نہیں کہ ماحولیاتی جبر کے تحت یہ تبدیلیاں کیونکر پیدا ہوتی ہیں بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ ماحول کے تحت اگر یہ تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں تو ماحول کی تشکیل ہی آخر اس طرح کیوں ہے کہ گویا وہ کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت حیوانوں میں تغیرات پیدا کردیتا ہے؟!

یقیناً ماحولیاتی دباؤ کے تحت جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اس سے کسی کو انکار نہیں، سیاہ فام قوم کے خدوخال، قدوقامت اور نظام انہضام میں تبدیلی کے لئے سورج کی شعاعوں کے عظیم کردار کی بات کر کے ماحول کو ذمہدار قرار دینا خود قرآن سے ثابت ہے۔۔۔۔لیکن ساتھ ہی ''لَمْ نَجْعَلْ لَهُمْ'' کے ذریعہ یہ بات بھی واضح کردی گئی ہے کہ اس قسم کے ماحول کی تشکیل ہم نے ہی کی ہے۔

چنانچہ سوال صرف حیوانی یا بناتی سطح پر تغیر وتبدل کا نہیں بلکہ جس خارجی

ماحول کے ساتھ تال میل کے بغیر زندگی ممکن نہیں آخران کی یہ منصوبہ بند تشکیل کس نے کی ہے؟ ظاہر سی بات ہے جب کوئی باشعور مخلوق اپنے وجود میں کسی تبدیلی کا اختیار نہیں رکھتی تو بے شعور مادے کے پاس یہ قدرت کیسے آئی؟!

نظریۂ ارتقاء: ملحدین کی مجبوری

اس نظریہ کا ایسا کیا بنیادی مقصد ہے کہ اس کے حق میں ایک دلیل تو کیا اس کے خلاب بے شمار دلائل ہونے کے باوجود ملحدین اس نظریہ کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں؟

نظریۂ ارتقاء کے وجود میں آنے سے پہلے ملاحدہ کا ماننا تھا کہ یہ دنیا خود بخود قائم ہے، لیکن جب سائنسی مشاہدہ سے پتہ چلا کہ کائنات پھیل رہی ہے اور اس میں ہر وقت تغیر ہوتا رہتا ہے، نیز جب یہ بھی دیکھا گیا کہ کائنات میں ہر جگہ افادیت اور امداد باہمی کا قانون کارفرما ہے تو اس کے حل کے لئے وہ نظریۂ ارتقاء کا سہارا لینے کے لئے مجبور ہو گئے تا کہ کائنات میں ہر طرف موجود اس مقصدیت کی توجیہ کی جا سکے جو کسی منصوبہ گر کے وجود کو تسلیم کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔

دراصل آفاق وانفس کی دنیا میں ہم جہاں کہیں نظر ڈورائیں، ہر جگہ ایٹم سے لیکر چاند، سورج اور سیاروں تک، حیوانوں سے لیکر جمادات ونباتات تک ہر چیز افادیت، امداد باہمی، مقصدیت اور منصوبہ بندی کی خاصیت کی حامل نظر آئیگی، یہ منصوبہ بندی کسی ایسے قادر مطلق خالق کے وجود کی بین دلیل ہے جو کائنات کے ہر ذرے کے ماضی حال اور مستقبل سے بھی اچھی طرح باخبر ہو۔

ملحدین نظریۂ ارتقاء کے ذریعہ اسی منصوبہ بندی کی توجیہ پیش کرنے کی ناکام کوشش میں مبتلا ہیں کہ کسی طرح خالق کائنات کا انکار کردیا جائے۔

ڈارون بذات خود مذہبی شخص تھا، لیکن ان ملحدین نے کمال ہوشیاری سے اسے اپنے موقف کے لئے استعمال کرنا شروع کریا۔ درحقیقت اس نظریہ کو سائنسی نظریہ کہنا ہی غلط ہے کیونکہ اس کا کام الحادی سوچ کو ثابت کرنا ہے، لہٰذا اسے ایک فلسفہ تو کہا جاسکتا ہے، سائنس نہیں، سائنسی طریقہ استعمال کرنے سے کوئی نظریہ سائنسی نہیں بن جاتا۔ ورنہ مذہب کو بھی سائنس ہی کہا جائے کیونکہ قرآن خود اپنے تمام دعووں کو دلائل کی بنیاد پر ماننے کی بات کرتا ہے، وہ سینکڑوں مقامات پر آفاق وانفس میں غور وفکر کی دعوت دیکر یہی تو مطالبہ کرتا ہے کہ ربوبیت، توحید اور یوم حساب کی باتوں کو بے بنیاد نہ سمجھا جائے بلکہ کائنات ان کے حق ہونے پر گواہ ہے۔

دراصل نظریۂ ارتقاء ایک دھوکہ کا نام ہے، چنانچہ پہلے تو یہ چھوٹی تبدیلیوں کے ذریعہ بڑے ارتقاء کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کیونکہ جب حیوانی سطح پر یہ بات باور کرادی جائے کہ حیوانی جسم میں موجود تنظیم کسی کی منصوبہ گری نہیں بلکہ حیوان کے اپنے ارادے یا ماحولیاتی جبر کے تحت وجود میں آئی ہے تو پھر لاشعوری طور پر سادہ لوح انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ حیوانی تنظیم کی طرح نباتات و جمادات والی دنیا بھی اپنے آپ ہی منظم ہے۔

اس طرح نظریۂ ارتقاء کا تعلق بھلے ہی حیاتیات سے ہو لیکن ملحدین اس کو

بڑی چالاکی سے نباتات و جمادات کی دنیا پر بھی منطبق کر دیتے ہیں۔اس طرح کہ اگر حیوانات میں ارتقاء کا عقیدہ بٹھا دیا جائے تو پھر نباتات و جمادات پر مشتمل کائنات کے بارے میں کوئی سوال ہی نہیں کرے گا۔

ارتقائی حضرات ضرورت کے مطابق الگ الگ الفاظ میں اس طرح کہتے نظر آئینگے کہ فلاں پرندے نے اپنے آپ کو اس طرح ماحول کے مطابق ڈھال لیا ۔ یا کبھی کہینگے کہ اس طرح بار بار کرنے پر کسی چوپایے کے پر نکل آئے ، فلاں جانور کی گردن لمبی ہوگئی تو فلاں آبی حیوان کے پھیپھڑے وجود میں آ گئے۔

حیاتیات کا تھوڑا بہت علم رکھنے والے کے لئے یہ بات کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ کسی مچھلی کے بار بار کنارے پر نکلنے سے اس میں پھیپھڑے پیدا ہو جائیں۔ اونچے درختوں سے پتے توڑ کر کھانے کی کوشش میں گدھے جیسا جانور زراف بن جائے۔ یا کسی چوپائے کے درخت سے بار بار گرنے پر اس کے پر نکل آئیں!؟

دراصل نظریۂ ارتقاء کو ماننے کا لازمی مطلب یہ ہے کہ یہ کائنات ایک دھماکہ سے وجود میں آنے کے بعد غیر منظم اور بے ترتیبی سے ایک ترتیب اور ارتقاء کی جانب رواں دواں ہے، لیکن کائنات کا سائنسی مشاہدہ بتلاتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز اپنے تقاضے کے عین مطابق ہے، چنانچہ ماحولیاتی دباؤ کے تحت ہونے والی یہ چھوٹی تبدیلیاں بھی اسی منظم اور منصوبہ بند کائنات کا ایک مظہر ہے ، لہٰذا ان تبدیلیوں کا سوال بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا ہر شے کا اپنا وجود۔

چنانچہ جس طرح ہماشما اپنے اس منظم جسم کو وجود میں نہیں لا سکتے ، اسی طرح

دنیا کی دیگر کوئی ایسی چیز نہیں جس کے متعلق کہا جا سکے کہ اس نے ہمیں وجود بخشا ہے کیونکہ اس کے لئے جس علم وخبر کے علاوہ بے پناہ قدرت درکار ہے وہ دنیا کی کسی چیز میں نظر نہیں آتی ، لامحالہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ کوئی ایسی ہستی ہے جس نے انس و حیوان سمیت کائنات کی ہر چیز کو اپنے ارادے اور طاقت کے ذریعہ وجود بخشا ہے ۔۔۔ذرا سوچیں کہ جس یک خلوی بیکٹیریا سے زندگی کی ابتدا ہونے کی بات کہی جارہی ہے اس کے ڈی این اے میں موجود کوڈنگ اور نان کوڈنگ کا انتہائی پیچیدہ نظام کیسے وجود میں آ گیا؟ زمین پر مناسب ماحول ملنے پر ایسے مالیکیول کا وجود میں آنا جو خود کو ریپلیکیٹ کرتے ہوئے لمبی چین بن جائے ، پھر کروموسومز کی شکل اختیار کر لے ، پھر ڈی این اے بھی بن جائے اور پھر خلیہ بن جائے ۔۔۔۔کیا تجرباتی سائنس کی دنیا میں ایسا ممکن ہے ۔ ہرگز نہیں ۔۔۔۔ پھر ایک بڑا سوال یہ ہے کہ پہلے خلیہ وجود میں آیا یا ڈی این اے کیونکہ ڈی این اے کے لیے خلیہ کا ہونا ضروری ہے اور خلیہ کے لیے ڈی این اے کا ۔۔۔۔ یہ سوال ٹھیک اسی طرح ہے جیسے مرغی پہلے آئی یا انڈا؟ ، چنانچہ ارتقاء تو بعد کی چیز ہے ، زندگی کی ابتدا کا یہ سوال ان پر اسرار ترین سوالوں میں سے ایک ہے جس کا سائنس دانوں کے پاس اب تک کوئی جواب نہیں ۔۔۔۔۔ ہاں اس کا ایک ہی جواب ہے کہ کسی علیم وخبیر قادر مطلق منصوبہ گر نے زندگی کو بھی اسی طرح تخلیق کیا ہے جس طرح آفاق وانفس کی دیگر چیزوں کو ۔۔۔ خصوصی تخلیق کے ذریعہ جس طرح پہلے مرغی بنا کر پھر اس میں نشوونما اور تولیدی نظام رکھ کر انڈوں کے ذریعہ ایک نسل چلائی اسی طرح بے شمار

انواع حیات کو تخلیق کر کے ان میں بھی نشو ونما اور توالد و تناسل کے طریقے وضع فرمائے۔

کروڑوں اور اربوں سال پیچھے جا کر یک خلوی جاندار کی داستان گڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں، آم کی گٹھلی، پتوں اور ٹہنیوں سے بغیر کسی نسل کے وجود میں آنے والے بے شمار خلیات پر مشتمل کیڑے اور پتنگے خصوصی تخلیق کے بہترین گواہ ہیں۔ آخر کون ہے جو اس قدر حیران کن اور انتہائی پیچیدہ نظام پر مشتمل زندگی کو ان کیڑوں اور پتنگوں میں وجود دے رہا ہے۔ یقیناً یہ جاندار نہ خود سے وجود میں آئے ہیں اور نہ ماحول میں وہ شعور و ادراک ہے کہ وہ اس طرح کی بے مثال اور حیرت انگیز پروگرامنگ کر سکے۔۔۔۔ بلاشبہ جس ہستی نے ان جانداروں کو بغیر کسی نسل کے ازسرنو وجود بخشا ہے وہی ذات سارے جہاں کی خالق ہے۔

ذوالقرنین اور موجودہ دور

یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ سائنس وٹکنالوجی کوئی دور جدید کی ایجاد نہیں بلکہ رب کائنات انسانی ضرورت کے پیش نظر وقتاً فوقتاً دنیا میں اس کا انتظام کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ سدین، مقناطیسی میدان اور دنیا کے برساتی جنگل کی صورت میں اس کے ثبوت آج بھی زندہ ہیں۔ اسی طرح جس ترقی یافتہ کہے جانے والے دور میں ہم جی رہے ہیں، اس کی پیشین گوئی قرآن میں پہلے سے موجود ہے بلکہ آئندہ کیسا دور آنے والا ہے اس کا ذکر بھی موجود ہے؛ لہٰذا ان سائنسی ترقیوں

کو ارتقاء کا نتیجہ قرار دینا ایک بے بنیاد دعوی ہی نہیں بلکہ اپنے آپ پر ظلم ہے۔

چاند، سورج، سیارے اور زمین پر مشتمل نظام شمسی، پہاڑ، بادل، دریا اور ندی نالوں سے لیکر اناج وغلہ اور قسم قسم کے پھل اور میوے کے علاوہ وسائل حمل و نقل کے لئے بیل، گوڑھے، گدھے، اونٹ اور خچر سے لیکر کشتیوں تک دنیا کی بے شمار نعمتوں کی طرح سائنس وٹکنالوجی بھی اپنے ساتھ امتحان کا پہلو لیکر آتی ہے کہ دیکھیں انسان اسکو کیسے استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ جب خالق کائنات نے ذوالقرنین کو بے مثال سائنس وٹکنالوجی کی طاقت کے ساتھ آراستہ کرنے کے بعد کہا تھا کہ اے ذوالقرنین تیرے اختیار میں ہے کہ لوگوں کے ساتھ تو کیسا معاملہ کرتا ہے: قُلْنَا يَاذَا الْقَرْنَيْنِ إِمَّا أَنْ تُعَذِّبَ وَإِمَّا أَنْ تَتَّخِذَ فِيهِمْ حُسْنًا ﴿۸۶﴾ تو ذوالقرنین نے اپنی ذمہداری بجالاتے ہوئے کہا تھا: قَالَ أَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهُ ثُمَّ يُرَدُّ إِلَى رَبِّهِ فَيُعَذِّبُهُ عَذَابًا نُكْرًا ﴿۸۷﴾ وَأَمَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُ جَزَاءً الْحُسْنَىٰ ۖ وَسَنَقُولُ لَهُ مِنْ أَمْرِنَا يُسْرًا ﴿۸۸﴾۔

تو ذوالقرنین نے اقتدار کے نشے میں آکر انسانی اقدار کو پائمال کرتے ہوئے دنیا پر جبراً اور متکبرانہ راج کرنے کی راہ اختیار نہیں کی بلکہ قانون ربوبیت کے تحت ملنے والی سائنس وٹکنالوجی کی مدد سے بنائی گئی ''ردم'' کو ''اپنے رب کی رحمت'' کہتے ہوئے پروردگار کا شکر ادا کیا۔

لیکن دور جدید کے انسان نے ان رحمتوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟

دور حاضر کے انسان نے نظام مواصلات اور وسائل حمل ونقل میں اتنی ترقی

کر لی کہ مہینوں کا سفر دنوں اور گھنٹوں میں طے کیا جانے لگا۔ دنوں کا کام منٹوں اور سیکنڈوں میں ہونے لگا۔ بڑی بڑی مشقت سے کئے جانے والے کام سکون کے ساتھ انجام دئے جانے لگے؛ لیکن کیا آپ نے کبھی غور کیا کہ اس قدر ترقی کے باوجود آج کا انسان اس قدر بے چین کیوں ہے۔

میڈیکل سائنس کی بے مثال ترقی کے باوجود ایڈز، کینسر، ہارٹ بلاکیج، گردہ فیل، بے اولادی، نامردی، زنانہ امراض اور دماغی مسائل جیسے مہلک اور لاعلاج امراض کی لمبی فہرستیں روز بروز کیوں بڑھتی جارہی ہیں۔ غیر طبیعی اموات کی شرح اس قدر تیز کیوں ہے۔ ایسے بے شمار امراض جن کو یونانی اور آیورویدک جیسے دیسی اور روایتی طریقۂ علاج کے ذریعہ منٹوں، گھنٹوں یا دنوں میں بالکل مفت یا سستے داموں ٹھیک کیا جاتا تھا وہ آج ایلوپیتھک طریق علاج کے ذریعہ مہنگے، عسیر العلاج یا لاعلاج قرار پائے ہیں۔ تو بھلا کوئی بتلائے کہ آخر یہ کیسی ترقی ہے!؟ وہ کون لوگ ہیں جو اس عدم توازن اور ہلاکت خیزی کے ذمہدار ہیں؟ کیا یہ نظام قدرت میں کمی کی وجہ سے ہو رہا ہے یا پھر یہ حرص و ہوس، دین بیزاری اور کسی انسان دشمن طاقتوں کی منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے؟

مختصر طور پر کہا جاسکتا ہے کہ سائنس وٹکنالوجی کے تئیں اپنے فرض کی ادائیگی میں انسان ناکام ہوتا جارہا ہے۔۔۔۔۔۔ دنیا کی اس تباہی کے لئے صرف انسانوں کے تئیں خطرناک عزائم رکھنے والا وہ گروہ ہی ذمہدار نہیں جو شیطان کا پیروکار ہے، جو لوگوں کو مذہب بیزار بنادینا چاہتا ہے، جو سربراہان ممالک کو مختلف حیلوں کے ذریعہ خود اپنے ملک وعوام کا غدار بنا کر عدالتوں سے

انصاف ختم کروادیتا ہے، جرائم، رشوت خوری، جنسی بے راہروی اور آوارگی کو عام اور جائز بنا رہا ہے، بے شمار لوگوں کو مصنوعی بھوک مری کا شکار کر رہا ہے، خطرناک اور مہلک بیماریوں کا شکار بنا کر مال و دولت کی لوٹ کے ساتھ تڑپا تڑپا کر موت کے گھاٹ بھی اتار رہا ہے۔ بلکہ دنیا کو تباہی و بربادی کی اس منزل تک پہونچانے میں سیاستداں، عہدے دار، فوج، پولس، ڈاکٹر، کاشتکار سے لیکر وہ مولوی، پادری، پنڈت اور مذہبی رہنما بھی اتنے ہی ذمہدار ہیں جو جانے انجانے میں خاموشی سے ٹھیک اسی منصوبہ پر عمل پیرا ہیں جس کا عہد شیطان نے پروردگار کے سامنے کیا تھا: ہاں یہی وہ منصوبہ ہے جس کے ذریعہ صرف انسانوں کو ہی لاچار اور معذور بنا کر موت کے گھاٹ نہیں اتارا جارہا بلکہ اس کے خطرناک نتائج چرند و پرند، پیڑ پودے اور آب و ہوا کو بھی بگاڑ کر فساد فی الارض کا وہ سماں پیش کر رہے ہیں جس کی آخری منزل بشکل قیامت بہت ہی قریب ہے۔

یاد رکھیں! لوگوں کی صحت اور مال و دولت کو برباد کرنے میں ڈاکٹر صاحبان بھی اتنے ہی مجرم ہیں جتنے وہ لوگ جو ایک مخصوص منصوبے کے تحت دواسازی کے بازار پر قبضہ جمائے علاج کو مہنگا اور طویل المدتی بنا کر لوگوں کو مہلک بیماریوں میں مبتلا کر رہے ہیں۔۔۔

لوگوں کی صحت سے کھلواڑ کرنے کے لئے کاشتکار بھی اتنے ہی مجرم ہیں جتنے وہ لوگ جنہوں نے ایک خاص مقصد کے تحت مخصوص طریقہ پر زہریلے کیمیکل والے کھاد کے ذریعہ غیر فطری کاشت پیدا کر کے لوگوں کو معذور بنا دینے کا منصوبہ بنا رکھا ہے۔

تاریخ میں انسان کو انسانوں کے ہاتھوں اتنا بے بس اور ذلیل ہوتے کبھی

نہیں دیکھا گیا۔انسانیت کے ساتھ کھیلے جارہے اس خوفناک کھیل کے لئے کون ذمہدار ہیں! کیا صرف شیطان کے وہی پجاری جو دنیا کو اپنے زیرنگیں کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش میں لگے ہوئے ہیں یا اس کے لئے سیاسی سطح سے لیکر مذہبی پیشوا تک ہر وہ شخص بھی اتنا ہی ذمہدار ہے جو کروڑوں لوگوں کو ختم یا معذور کردینے والے ان منصوبوں پر بلا چوں و چرا ان کے ساتھ ساتھ ہے۔

جس انسان کو اپنے سائنسی علم پہ بڑا ناز ہے، جو چاند اور منگل جیسے سیاروں پر کمندیں ڈالکر انسان کی بودوباش کے منصوبے بنارہا ہے، سائنس کے نام پر بڑی بڑی بیماریوں سے انسان کو نجات دلانے کی بات کیا کرتا ہے تو آخر وہ انسان اتنا بے بس کیسے ہوگیا کہ بھوک کے خوف سے خود اپنی ہی نسل کو مختلف بہانوں کے ذریعہ ختم کرنے پہ تلا ہوا ہے!

اے انسان تو عاجز ہے رب کائنات نہیں۔ جب وہ محیر العقول سائنس و ٹکنالجی پر مبنی لازوال کارنامے انجام دینے والا ذوالقرنین جیسا بادشاہ بھیج کر ہر سو تکالیف کی شکار انسانیت کو اس عذاب سے نجات دلا سکتا ہے۔ جب وہ بڑھتی آبادی کے ساتھ بڑھتے مسائل کے حل کے لیے دور جدید کی سائنس وٹکنالوجی کے ذریعہ اپنے بندوں کی مشقت کو آسان بنا سکتا ہے تو کیا اس قدر عظیم الشان کائنات کا وہ علیم وخبیر پروردگار بڑھتی انسانی آبادی کے کھان پان کے انتظام سے غافل ہوجائیگا۔

ایک طرف ذوالقرنین ہیں جنکی سائنسی خدمات سے دنیا آج تک فائدہ اٹھارہی ہے اور اور قیامت تک فائدہ اٹھاتی رہیگی جبکہ دوسری جانب موجودہ دور کا انسان ہے جو اسی سائنس وٹکنالوجی کے علم کو خود کی بربادی کے لئے استعمال کرتے

ہوئے قیامت برپا کرنے پر تلا ہوا ہے۔

الغرض بر و بحر میں موجود انسانی باقیات دور حاضر کی سائنسی ترقی پر ناز اور تکبر کرتے ہوئے اسے بطور ہتھیار استعمال کرنے والے لوگوں کو آئینہ دکھا رہے ہیں کہ ماضی کے ان کارناموں کے سامنے موجودہ دور کا انسان کچھ بھی نہیں اور جو حشر ان کا ہوا ہے اس طرح کے انجام سے موجودہ انسان بھی نہیں بچ پائیگا۔ قرآن نے کیا خوب کہا : وَكَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَمَا بَلَغُوا مِعْشَارَ مَا آتَيْنَاهُمْ فَكَذَّبُوا رُسُلِي فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿۴۵ سبا﴾

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ كَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَأَثَارُوا الْأَرْضَ وَعَمَرُوهَا أَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوهَا وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۹ الروم﴾

الحاصل یہ دنیا انسان کے ہاتھوں ایک ''امانت'' ہے، اس میں ''توازن'' برقرار رکھنا انسان کا فرض ہے۔۔۔۔۔ صنعتی اور مشینی دور کی صورت میں ملنے والی یہ سہولتیں بھی رب کائنات کے اسی نظام کا ایک حصہ ہے۔

اب دیکھنا ہے کہ قانون ربوبیت کے تحت بطور رحمت ملی سائنس وٹکنالوجی کو قوانین فطرت اور افادیت و امداد باہمی کے اصول کے مطابق چل کر انسان اس امانت کو سنبھالنے میں کامیاب ہوتا ہے یا پھر کفر و الحاد اور شرک کی راہ اختیار کر کے شیطان کے ان منصوبہ کے لئے سہولت کاری کا کام انجام دیتا ہے جس کا لازمی انجام روئے زمین کی تباہی کے ساتھ اخروی بربادی بھی ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ قوانین فطرت کے برخلاف ظلم وجور، ناانصافی اور فساد فی الارض پر مبنی طاقتیں کبھی بھی زیادہ دیر تک نہیں ٹک پائی ہیں۔ شیطان کے جھوٹے وعدوں کے بھروسے چل کر انسانیت کی تذلیل کرنے والو! چاہے جتنی تیاری کرلو، تمہاری یہ راہ صرف اور صرف اس بربادی کی اور جارہی ہے جس کی ہمہ گیر پکڑ سے کوئی نہیں بچ پائیگا۔ نہ سیڈ بینک کام آئیگی اور نہ خلا میں بود و باش تمہیں بچا پائیگی، نہ موت سے فرار ممکن ہے اور نہ ہی اس کائنات میں ایسی کوئی جگہ ہے جہاں تم رب کائنات کی پکڑ سے بچ کر بھاگ سکتے ہو۔

ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اگر دنیا کو صلاح وفلاح کے ساتھ قائم و دائم رکھنا ہے تو یہ صرف اور صرف قوانین فطرت کے ساتھ ہم آہنگی اور امداد باہمی کے اصول پر عمل پیرا ہوکر ہی کیا جاسکتا ہے اور یہی انسانیت کے نام رب کائنات کے آخری پیغام ''اسلام'' کا تقاضی ہے۔

یکم فروری، ۲۰۲۱ء

ترمیم واضافہ: جون، ۲۰۲۳ء

عبدالعزیز ابن احمد

Home No. 9 Tipu Sultan Colony

Kanthariya,Bharuch,Gujarat

Pin Cod : 392015 , India

Mo. No. +91- 9714440450